سنہرے اوراق

تاریخ اسلامی سے چمکتے دمکتے واقعات

عبدالمالک مجاہد

دارالسلام
DARUSSALAM

دارالسلام پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

ⓒ مکتبة دارالسلام، ١٤٢٥ هـ

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
مجاهد عبدالمالك
الصفحات الذهبية. / مجاهد عبدالمالك - الرياض، ١٤٢٥ هـ
ص: ٣٧٦ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٩-٠٢-٧٣٢-٩٩٦٠
(النص باللغة الاردية)
١ - التاريخ الاسلامي أ-العنوان
ديوي ٩٥٣،٠٢ ١٤٢٥/٥٦٣٨

رقم الإيداع: ١٤٢٥/٥٦٣٨
ردمك: ٩-٠٢-٧٣٢-٩٩٦٠

220.9
12.1_لس

پوسٹ بکس: 22743 الرياض: 11416 سعودی عرب
فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: riyadh@dar-us-salam.com - darussalam@awalnet.net.sa
Website: www.dar-us-salam.com

دارالسلام	فون	فیکس
العليا	00966-1-4614483	4644945
الملز	00966-1-4735220	4735221
جدة	00966-2-6879254	6336270
مدينه منورة	00966-503417155	8151121
الخبر	00966-3-8692900	8691551
شارجه	00971-6-5632623	5632624
پاكستان	0092-42-7240024	7354072
لندن	0044 20 8539 4885	20 8539 4889
نيويارك	001-718-6255925	718-625 1511
هوسٹن	001-713-7220419	7220431
هانگ كانگ	00852-23692722	23692944
ملائيشيا	00603-77109750	77100749

سنہرے اوراق

تاریخ اسلامی سے چمکتے دمکتے واقعات

تالیف

عبدالمالک مجاہد

دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • الخبر • شارجہ
لاہور • لندن • ہیوسٹن • نیویارک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المکتبۃ الرحمانیۃ
۹۹۔۔ بے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
نمبر ....17662....

عرض مؤلف

غالباً 1998ء کی بات ہے، میں ریاض میں وزارت مذہبی امور کے شعبہ اوقاف کے ڈپٹی منسٹر جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن مطرودی کے پاس بیٹھا تھا۔ موصوف نہایت ذہین و فطین آدمی ہیں۔ انگلینڈ میں پڑھتے رہے، وہیں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ہمارا موضوع سخن اسلامی کتابوں کی اشاعت تھا۔ انہوں نے گفتگو کا رخ بدلا اور کہنے لگے: ”دارالسلام نے اب تک نوجوانوں کے لیے کتنی کتابیں شائع کی ہیں؟“ میں نے عرض کیا: ”کوئی خاص نہیں۔ یہ بات ہمیشہ میرے ذہن میں رہی ہے کہ دارالسلام کو نوجوانوں کے لیے کتابیں شائع کرنی چاہئیں۔ ہر چند کہ بعض کتابیں میں نے نوجوانوں کے لیے بطور خاص لکھوائی ہیں مگر نہیں کہہ سکتا کہ اس سلسلہ میں کوئی قابل قدر کام ہوا ہے، البتہ مستقبل میں اس پر ضرور توجہ دوں گا۔“ اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن میں خود کسی کتاب کا مؤلف بن جاؤں گا اور وہ نوجوان نسلوں کے لیے لکھی جائے گی۔

دارالسلام کا سن تاسیس 1992ء ہے۔ مجھے کتب کی نشرو اشاعت کے سلسلے میں بے شمار سفر کرنا پڑے۔ دورانِ سفر ہوائی جہاز میں یا ہوٹل میں قیام کے دوران مطالعہ کا وقت مل جاتا ہے۔ دوپہر کے قیلولہ یا رات سونے سے پہلے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ تو پرانی عادت ہے مگر سفر میں کچھ زیادہ ہی وقت مل جاتا ہے۔ میں اپنے ہمراہ ہر سفر میں دو تین عربی کتابیں ضرور رکھتا ہوں۔ دوران مطالعہ نوٹ کیا کہ ہماری اسلامی تاریخ ایسے ایسے شاندار واقعات سے بھری پڑی ہے جنہیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہماری تاریخ میں کتنے عظیم لوگ پیدا ہوئے جن کے کارہائے نمایاں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ بلاشبہ یہ سنہرے اوراق ہیں۔ اسلامی تاریخ کے چمکتے دمکتے واقعات، سلف صالحین کی زندگی کے

علمی وعملی نمونے‘ تاریخی احوال‘ دلچسپ مشاہدے۔ میں نے ایسی درجنوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب میں سفر سے واپس آتا تو عموماً اپنے بچوں کو یہ واقعات سناتا۔ بعض اوقات دوستوں کی محفل میں بیٹھتا تو مزے لے لے کران کو بیان کرتا۔ کسی جگہ تقریر کا موقع ملتا تو اس سنہری تاریخ سے اقتباسات سناتا جس سے سامعین کے ساتھ میں خود بھی محظوظ ہوتا۔

بعض احباب نے ان تاریخی واقعات کو جمع کرنے کی جانب توجہ دلائی تو جن کتابوں کو پڑھا تھا‘ ان میں جو واقعات دلچسپ اور حقائق پر مبنی نظر آئے ان کو نشان زد کرنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ کتابوں کی نمائش میں ایک عربی ناشر سے گفتگو ہوئی۔ اس نے پوچھا: ”آپ عربی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی کتابیں شائع کرتے ہیں؟ اسلامی تاریخ میں سلف کے واقعات اپنی نوجوان نسل تک پہنچائیں تا کہ نوجوانوں کو معلوم ہو کہ ہمارا ماضی کتنا روشن تھا اور تاریخ میں کیسے کیسے دل نشیں واقعات پیش آئے۔“ مجھے ان کا مشورہ بروقت لگا۔ میں نے اور زیادہ توجہ سے تاریخی کتابوں کو پڑھنا اوران پر نشان لگانا شروع کر دیا۔ پھر وہ وقت آیا جب میں نے ان واقعات کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ مجھے اپنی کم علمی کا مکمل احساس ہے۔ مجھے عربی زبان پر کامل دسترس کا دعویٰ نہیں تاہم کثرت مطالعہ کی بنا پر مفہوم کو سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں۔ عموماً فجر کی نماز کے بعد لکھنے بیٹھ جاتا یا پھر سفر کے دوران اس کام میں جُت جاتا۔

یہ تاریخی واقعات وحکایات سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ ادھر دارالسلام کی ذمہ داریاں مسلسل بڑھتی چلی جارہی تھیں اور مصروفیات میں روزافزوں اضافہ جاری تھا۔

ایک دن میرے پاس جناب رضوان اللہ ریاضی صاحب تشریف لائے۔ وہ ملازمت کی تلاش میں تھے۔ میں نے ان کا سی وی دیکھا‘ باصلاحیت نظر آئے۔ مجھے ایک معاون کی شدید ضرورت تھی جو میرے بکھرے مسودوں کو دیکھ سکے‘ چنانچہ انہی کا

انتخاب کر لیا گیا۔

جناب ریاضی صاحب نے میرے منتخب واقعات کو مرتب کرنا اور ان کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ میں زبان و بیان کی مناسب تبدیلیاں کر دیتا اور یوں سینکڑوں صفحات مرتب ہو گئے۔

عربی بڑی جاندار زبان ہے۔ مزا تو اسی وقت آتا ہے جب واقعات عربی لغت ہی میں پڑھے جائیں۔ ترجمے میں وہ چاشنی نہیں رہتی۔ میں نے ایک ایک واقعہ کو کئی بار پڑھا۔ اس کی نوک پلک سنواری، پھر بھی تشنگی باقی رہی۔ چنانچہ مزید اس کی نوک پلک سنوارنے کے لیے پاکستان میں دارالسلام کے ایک معاون جناب اشتیاق احمد صاحب کے پاس مسودہ بھیج دیا۔ انہوں نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا۔ میری کوشش یہ رہی کہ ترجمہ اصل واقعہ سے دور نہ چلا جائے۔ واقعات میں عربی عبارتیں بھی اسی طرح لکھ دی گئی ہیں، خاص طور پر قرآن کریم، حدیث شریف یا کسی شاعر، ادیب یا سپہ سالار کے الفاظ تاکہ عربی ادب کی چاشنی باقی رہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس کتاب میں بیان کردہ واقعات کو علمائے کرام، اساتذہ، طلبہ، سیاسی رہنما اور مقررین اپنی تقاریر میں بیان کریں یا بطور حوالہ کتابوں میں درج کریں تاکہ ان سے ہماری نوجوان نسل بطور خاص بھرپور استفادہ کرے۔

جہاں تک ان واقعات کے درست ہونے کا تعلق ہے، میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ صرف وہی واقعات ذکر کیے جائیں جو درست ہیں اور جن کے حوالہ جات موجود ہیں۔ پھر بھی کوئی ایسا واقعہ سامنے آ جائے جو تاریخی اعتبار سے درست نہ ہو تو قارئین سے درخواست گزار ہوں کہ ضرور مطلع فرمائیں۔ آئندہ ایڈیشن میں ان شاء اللہ اسے بدل دیا جائے گا۔

یہاں میں یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ یہ کتاب مرجع کی نہیں کہ اس کو محدثین کے اصولوں کے مطابق پڑھا جائے۔ یہ تو ہماری سنہری تاریخ کے گمشدہ اوراق ہیں

جن کو نوجوان نسلوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو زبان میں تاریخی واقعات پر مبنی یہ پہلی کتاب ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے بعد کم از کم دو اور کتابوں کا مسودہ میرے پاس موجود ہے جو ترتیب کا منتظر ہے۔

مجھے دارالسلام کے رفقائے کار خصوصاً رضوان اللہ ریاضی اور اشتیاق احمد صاحبان کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے تعاون کے بغیر یہ کتاب کئی ماہ بعد شائع ہو پاتی۔ اسی طرح برادر عزیز محمد طارق شاہد صاحب بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ نہایت برق رفتاری سے کروائی اور کتاب کو پرنٹنگ کے آخری مرحلے تک پہنچایا۔ یاد رہے کہ اس کتاب کا ترجمہ انگلش زبان میں پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔

نہایت بے انصافی ہوگی اگر میں اپنی اہلیہ محترمہ انیسہ فردوس کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اس کتاب کی تالیف میں میرے حوصلے کو بڑھایا' مفید مشورے دیے اور گھر میں میرے لیے نہایت آرام دہ ماحول فراہم کیا تاکہ میں پورے اطمینان سے پڑھ لکھ سکوں۔

قارئین کرام! سنہرے اوراق کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ اشاعت نظر ثانی اور مراجعہ کے بعد عمل میں لائی گئی ہے، جس سے کتاب کی وقعت اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اگر اس کتاب سے نوجوان نسل نے اپنے سلف صالحین کو سمجھنے کی کوشش کر لی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

وصلی الله علی نبینا محمد وعلی آله وصحبه وسلم

عبدالمالک مجاہد

ریاض' سعودی عرب دسمبر 2004ء

فہرست مضامین

جب کداء سے گھوڑوں کی آمد ہوئی 05
عمرو بن عاص ؓ کا قبول اسلام 11
بچپن ہی میں نبوت کی خوشخبری 17
بے سود فیاضی 24
وفادار اعرابی 28
وعدے کا پاس 31
درگزر کرنے والے 33
دشمن جاں پر مہربانی 34
اور وہ کامیاب ہو گیا 35
میں بڑا ہی منحوس ہوں 37
اینٹ اور شراب 38
صدقے سے علاج 39
ٹوٹ گئے مٹکے 41
خوش نصیب چرواہا 44
جسے اللہ رکھے! 46
فضیلت کا تقاضا 47
سہیل بن عمرو ؓ کی فراست 48
انداز اپنا اپنا 50
وہ پھر بھی مشتعل نہیں ہوا 52

پسند کی احادیث 53

دربان اور حکمران 54

چاہ کن را چاہ درپیش 56

زیادہ سخی کون؟ 60

ہر مصیبت کا علاج 63

ایثار کی عمدہ مثال 64

ایک دوسرے کے بھائی 66

میں دجال نہیں! 69

ناکام سازش 70

اعرابی کی حاضر جوابی 72

لمحۂ فکریہ 74

موت 77

عزت ووقار کا پیمانہ 79

نبی کریم ﷺ کا مزاح 82

سوچ کا انداز 84

موتیوں کا ہار 86

بدعتی اور حوض کوثر 90

قیامت کی نشانیاں 93

حق گوئی 95

گدڑی پوش مجاہد 98

شہزادے کو قیمتی وصیت 103

گھر سے مسجد تک 105

عظیم سخاوت 107

نیند اور موت 108

کامیاب حکمران 109

کاتب وحی کی ذہانت 110

صحرا کا بیٹا 112

امیر ہو تو ایسا! 120

عزت والا کون؟ 122

پانچ خاص چیزیں 123

ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی شجاعت 124

سب سے پہلے سفیر 127

غیبی طاقت 135

سوءخاتمہ 138

آخری جنتی 139

خلیفہ اور رعایا 146

دوستی کا حق 148

خدمت کا صلہ 152

ایک حاجت مند حاکم کی کہانی 154

اللہ کے لیے محبت کا صلہ 159

مسلمان کی پردہ پوشی 160

کسی کو پتا نہ چلے 163

وہ بلا کا ذہین و بہادر تھا 165
غلام کی سخاوت 172
بے بس بت 174
تھپڑ مارنے کا انجام 178
طلبِ حدیث میں کوشش 179
ایک مشورہ 180
تیس ہزار دینار کا بیٹا 182
پہلا مولود 186
خوشۂ انگور کے بدلے وزارت 195
تواضع اور صدقہ کے ثمرات 205
جان دینا منظور ہے 207
وہ تو میرا ہو چکا 209
اپنی اپنی تمنا 212
عفو و درگزر کی اعلیٰ ترین مثالیں 214
قوی اور امین 220
کسریٰ کے کنگن 222
مسلمان جن 233
جنت کی کھجور 236
موت کی کیفیت 241
وعدہ کی پاسداری 244
والدین کا مقام 245

تقویٰ اور اس کا انعام 246

فرشتے مصافحہ کریں! 252

چرواہے کا تقویٰ 254

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا خط 256

سرداری کے مستحق 266

حجاج اور اعرابی کا مکالمہ 267

موسیٰ علیہ السلام کی سرگوشی 269

پانچ باتوں کا علم 271

خاتمہ بالخیر 273

نیت کا پھل 274

جہنم رسید ہو گیا 276

ایک بدبخت 277

ایمان فروش 279

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تقویٰ 281

بہترین سفارش 282

واثق باللہ کی ذہانت 284

دور اندیش دشمن 285

غصہ میں حلم و بردباری 287

زندہ شہید 289

شہر کی کنجیاں 291

خیر و بھلائی کی خصلتیں 295

رسول اکرم ﷺ کی حکمت عملی 297

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت 299

خوددار عالم 302

بدعت ایک گڑھا 305

سردار ایسا ہوتا ہے 307

ذہین بچہ 308

حکمران اور رعایا 309

کون کیا ہے؟ 310

قبولیت دعا 311

ذہانت 313

مومن کی شان 315

جان سے بڑھ کر محبوب 316

اور لوگوں کی جان چھوٹ گئی 317

.....تو میں تمہاری پوجا کرتا 318

خوبصورت جواب 321

بھول 322

یہ ہدیہ نہیں! 323

معذرت کا انداز 324

صرف ایک گھونٹ پانی 326

اللہ کا دشمن ذلت وپستی کا شکار ہو کر رہا 329

عربی سخاوت 332

کلمہ گو کے لیے جنت کی ضمانت 334
یہی تو سرداری ہے 337
مُسَبِّبُ الاسباب 339
مذاق اڑانے والا 344
خواب کی بنیاد پر 347
انصاف اور رواداری 350
عبرت ناک انجام 352
بہن بھائی 355
کم سن بچے کا خوف وتقویٰ 357
اصل بادشاہت 361
شوق شہادت 362
تین کے بدلے تین 363
آگ آگ کو کیسے جلا سکتی ہے؟ 364
محدود علم 365
فتویٰ نہیں مدد 366
حجاج کے دسترخوان پر 367
پادری کی نصیحت 368
موت کے بعد بھی ثواب 371
گالیوں کا جواب 371
ہزار درہم کا نگینہ 372
دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی 372

تین حقوق 373

آپ کو مرنا پسند ہے؟ 373

بیت الخلاء میں موت 374

صابر و شاکر کے لیے جنت کا وعدہ 375

شراب نوشی 375

چڑیا کی فریاد 376

جب کداء سے گھوڑوں کی آمد ہوئی

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں ملک یمن میں تجارتی قافلے کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ قافلے میں ابوسفیان بن حرب بھی تھے۔ یمن میں قیام کے دوران ہمارا معمول یہ تھا کہ ایک روز میں کھانا پکا کر ابوسفیان اور قافلے کے دیگر افراد کے پاس لے جاتا اور کھانا کھلاتا، اور ایک دن ابوسفیان کھانا پکاتے اور ساتھیوں کو کھلاتے۔ گویا ہم باری باری یہ ذمہ داری نبھاتے۔

ایک دن جب کہ میری باری تھی اور میں کھانا پکا رہا تھا کہ ابوسفیان بن حرب میرے پاس آئے اور کہا: ابوالفضل! کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ آپ ہمارے ڈیرے پر تشریف لائیں اور کھانا بھی وہیں منگا لیں؟ میں نے کہا: کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ابوسفیان کے ڈیرے پر پہنچا اور کھانے پینے کا سارا سامان وہیں منگا لیا۔

جب سارے لوگ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے اور چلے گئے تو ابوسفیان نے مجھے اپنے پاس ہی روک لیا اور گویا ہوئے:

«هَلْ عَلِمْتَ أَنَّ ابْنَ أَخِيكَ يَزْعُمُ أَنَّهُ رَسُولُ اللهِ!؟».

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا بھتیجا دعوی کر رہا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے؟“

میں نے پوچھا: میرا کون سا بھتیجا؟

ابوسفیان نے کہا: آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں، آپ کے ایک بھتیجے کے سوا بھلا یہ بات کون کہہ سکتا ہے!

میں نے پوچھا: میرا کون سا بھتیجا، اس کی نشاندہی تو کریں۔

ابوسفیان نے کہا: آپ کا بھتیجا محمد، جو آپ کے بھائی عبداللہ کا بیٹا ہے۔

میں نے کہا: نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

ابوسفیان نے کہا: نہیں بلکہ یہ سچ ہے کہ اس نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

پھر ابوسفیان نے اپنے بیٹے حنظلہ بن ابی سفیان کا بھیجا ہوا خط نکال کر مجھے دکھایا جس کا مضمون کچھ یوں تھا:

«إِنَّ مُحَمَّدًا قَامَ بِالْأَبْطَحِ غُدْوَةً، فَقَالَ: أَنَا رَسُولُ اللهِ، أَدْعُوكُمْ إِلَى اللهِ».

”صبح محمد نے بطحاءِ (وادی مکہ) میں کھڑے ہو کر لوگوں کے سامنے اعلان کیا ہے: میں اللہ کا رسول ہوں، اور تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔“

میں نے کہا: ابوحنظلہ! ممکن ہے، وہ سچ کہہ رہا ہو۔

ابوسفیان جلدی سے گویا ہوئے: چپ رہیے ابوالفضل! اللہ کی قسم! خدارا آپ ایسی بات نہ کہیں، مجھے تو خدشہ ہے کہ آپ بھی بغیر سوچے سمجھے اس کے دعوے کی تصدیق نہ کر بیٹھیں۔ پھر ابوسفیان نے کہا: اے بنو عبدالمطلب! اللہ کی قسم! قریش کا دعویٰ ہے کہ لوگوں کے لیے تم (یعنی بنو عبدالمطلب) نحوست بھی ہو اور سعادت بھی اے ابوالفضل! میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا آپ نے یہ بات نہیں سنی ہے؟

میں نے کہا: ہاں، سنی تو ہے۔

ابوسفیان نے کہا: پھر اللہ کی قسم! یہ (محمد) تم لوگوں کی طرف سے نحوست ہے۔

میں نے کہا: ممکن ہے نحوست کی بجائے سعادت ہو۔

ابھی اس بات کو چند ہی دن گزرے تھے کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ یہ خبر لے کر یمن پہنچ گئے کہ واقعی محمد ﷺ نے مکہ مکرمہ میں اسلام کا دعویٰ کیا ہے وہ خود بھی اسلام قبول کر چکے تھے۔ پھر تو یمن میں جگہ جگہ اس نئے دین کا چرچا ہونے لگا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ابوسفیان بن حرب یمن کے ایک یہودی عالم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو اس نے پوچھا: ابوسفیان! یہ جو مجھے خبر پہنچی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟

ابوسفیان نے کہا: یہی بات تو میں نے بھی سنی ہے۔

یہودی عالم: جو آدمی نبوت کا مدعی ہے، اس کا چچا یہاں کون ہے؟

ابوسفیان: میں ہی اس کا چچا ہوں۔

یہودی عالم: کیا تم اس مدعیٔ نبوت کے والد کے بھائی ہو؟

ابوسفیان: ہاں۔

یہودی عالم: اس مدعیٔ نبوت کے حالات سے مجھے آگاہ کرو۔

ابوسفیان: یہ سوال آپ مجھ سے نہ کریں، کیوں کہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا بھتیجا اس قسم کا دعویٰ کر بیٹھے گا، میں اس کو عیب نہیں لگاتا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ دوسرے اس سے بہتر نہیں ہیں۔

یہودی عالم: پھر تو اس کو کچھ گزند نہیں پہنچنا چاہیے، اور یہودیوں کو بھی اس سلسلہ میں کچھ حرج نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب مجھے ابوسفیان اور یہودی عالم کے مابین مکالمے کی خبر پہنچی تو میری حمیت جاگ اٹھی اور دوسرے دن

میں جا کر اسی مجلس میں بیٹھ گیا جس میں ابوسفیان اور یہودی عالم بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے یہودی عالم سے کہا: مجھے خبر ملی ہے کہ آپ نے ہمارے درمیان مدعیٔ نبوت کے چچا کے بارے میں پوچھا تو ابوسفیان نے کہا کہ وہ اس کے چچا ہیں جبکہ وہ اس کے چچا نہیں بلکہ اس کے چچا زاد بھائی ہیں، البتہ میں اس کا چچا اور اس کے والد کا سگا بھائی ہوں۔

یہودی عالم نے پوچھا: کیا واقعی آپ اس مدعیٔ نبوت کے والد کے سگے بھائی ہیں؟

میں نے کہا: ہاں، میں اس کے والد کا سگا بھائی ہوں۔

چنانچہ وہ یہودی عالم ابوسفیان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: کیا یہ سچ ہے؟

ابوسفیان نے جواب دیا: ہاں۔

پھر میں نے کہا: آپ مجھ سے میرے بھتیجے کے متعلق جو پوچھنا چاہتے ہیں پوچھیں، اور ہاں اگر میں اس کے بارے میں کچھ جھوٹ بولوں تو پھر یہ ابوسفیان میری گرفت کریں۔

اب یہودی عالم میری طرف متوجہ ہو گیا اور پوچھا:

«أَنْشُدُكَ اللهَ! هَلْ فَشَتْ لِابْنِ أَخِيكُم صَبْوَةٌ أَوْسَفْهَةٌ؟».

”میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں! کیا آپ کے بھتیجے کے بارے میں کبھی یہ بات پھیلی ہے کہ وہ بچوں کی سی حرکتیں کرتا ہے، یا نادان ہے؟“

میں نے کہا:

«لَا وَإِلٰهِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ! وَلَا كَذَبَ وَلَا خَانَ، وَكَانَ اسْمُهُ عِنْدَ قُرَيْشٍ الْأَمِينَ».

”نہیں نہیں، عبدالمطلب کے معبود کی قسم! کبھی اس نے جھوٹ نہیں بولا اور

نہ ہی اس نے خیانت کی، اور قریش اسے امین کے نام سے پکارتے ہیں۔“

یہودی عالم نے پوچھا: کبھی اس نے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز لکھی؟

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اثبات میں جواب دینا چاہا لیکن فوراً میں سنبھل گیا کہ میرے پیچھے ابوسفیان موجود ہیں، اگر میں جھوٹ بولوں گا تو وہ فوراً مجھے جھٹلا دیں گے۔ چنانچہ میں نے اس کو جواب دیا: نہیں، اس کو لکھنا نہیں آتا۔

یہ سننا تھا کہ یہودی عالم اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی چادر چھوڑ کر باآواز بلند یہ کہتے ہوئے چلا گیا:

«ذُبِحَتْ يَهُودُ! قُتِلَتْ يَهُودُ!».

”یہود ذبح کر دیے گئے! یہود قتل کر دیے گئے!“

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب ہم اپنے ڈیرے میں واپس آئے تو ابوسفیان نے مجھ سے کہا: اے ابوالفضل! یہود آپ کے بھتیجے سے خوفزدہ ہیں۔

میں نے کہا: ابوسفیان! ایسا کیوں نہ ہو کہ آپ بھی اس پر ایمان لے آئیں، اگر وہ نبئ برحق ہوگا تو آپ سبقت کرنے والوں میں سے ہوں گے اور اگر وہ بالکل باطل ہوگا تو آپ کے علاوہ آپ کے ہم مثل دیگر لوگ بھی آپ کے ساتھ ہیں؟

ابوسفیان نے کہا:

«لَا وَاللهِ! مَا أُؤْمِنُ بِهِ حَتَّى أَرَى الْخَيْلَ تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءٍ».

”اللہ کی قسم! نہیں، میں اس پر ایمان نہیں لا سکتا یہاں تک کہ میں گھوڑوں کو کداء (مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے) سے آتے ہوئے نہ دیکھ لوں۔“

میں نے کہا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

ابوسفیان نے کہا:

«كَلِمَةٌ - وَاللهِ! - جَاءَتْ عَلَى فَمِي مَا أَلْقَيْتُ لَهَا بَالًا، إِلَّا أَنِّي أَعْلَمُ أَنَّ اللهَ لَا يَتْرُكُ خَيْلًا تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءٍ».

''اللہ کی قسم! یہ کلمہ بے ارادہ میری زبان سے نکل گیا، میں نے قصداً نہیں کہا ہے۔ ہاں مجھے اتنا ضرور یقین ہے کہ اللہ تعالی گھوڑوں کو کداء پہاڑ سے نہیں آنے دے گا۔''

پھر جب رسول اکرم ﷺ نے مکہ کو فتح کیا تو ہم نے گھوڑوں کو کداء سے آتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت میں نے ابوسفیان سے کہا: اے ابوسفیان! کیا آپ کو وہ کلمہ یاد ہے جو آپ نے مجھ سے کہا تھا؟

ابوسفیان نے کہا:

«وَاللهِ! إِنِّي ذَاكِرُهَا! اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانِي لِلإِسْلَامِ».

''اللہ کی قسم! مجھے وہ کلمہ یاد ہے! اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اسلام کی ہدایت دی''(1)۔

---

(1) دیکھئے: کتاب الأغانی (93/6)، دارالفکر، البدایة والنهایة (527-525/3) دارهجر، السیرة الحلبیة (301/1)، قصص العرب (110/1)۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

عرب کے ذہین ترین فرد حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اپنے اسلام قبول کرنے کا قصہ بیان کرتے ہیں: جب ہم غزوۂ خندق سے واپس مکہ مکرمہ آئے تو میں نے قریش کے چند لوگوں کو اکٹھا کیا جو میری رائے کو اہمیت دیا کرتے تھے اور میری بات دھیان سے سنا کرتے تھے۔ جب سردارانِ قریش میرے پاس جمع ہوئے تو میں ان سے مخاطب ہوا:

”تمہیں خوب اچھی طرح معلوم ہے اور اللہ کی قسم! میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ محمد کا دین روز بروز ترقی کر کے ایک بھاری جمعیت کی شکل اختیار کر چکا ہے جس سے نمٹنا اب عربوں کے لیے ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لئے محمد (ﷺ) اور اس کے لائے ہوئے مذہب کو اگر جلد سے جلد جڑ سے ختم کرنا ہے تو اس کے لئے کوئی خاطر خواہ اور مؤثر قدم اٹھانا پڑے گا۔ اس اقدام میں جتنی بھی تاخیر ہوگی ہمیں اسی قدر نقصانات کا سامنا کرنا پڑے گا کیوں کہ پہلے محمد (ﷺ) اکیلا ہی اسلام کا کلمہ بلند کرتا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اب اس کلمے کے ماننے والوں کی تعداد ہزاروں میں پہنچ چکی ہے، اور اگر محمد (ﷺ) کی روش پر کوئی زبردست قدغن عائد نہ ہوئی تو پھر اس دین کا ڈنکا آفاقِ عالم میں بجنے لگے گا اور اس وقت ہم سب کی پگڑیاں اس کے پیروکاروں کے جوتوں سے روندی جائیں گی۔ اور ہاں، تم لوگ جب میرے پاس اکٹھے ہوئے ہو تو میں اپنی ایک تجویز سے تمہیں آگاہ کر دینا چاہتا ہوں، ممکن ہے تمہیں میری یہ تجویز پسند آئے اور آگے کی جانب قدم بڑھانے میں تم لوگ میری پوری مدد کر سکو۔“

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر سن کر قریش کے چنیدہ لوگوں نے پوچھا: آپ کی کیا رائے اور کیا تجویز ہے؟

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ گویا ہوئے: میری تجویز یہ ہے کہ ہم لوگ شاہ حبشہ نجاشی کے پاس چلیں اور اس کے پاس کچھ دنوں کیلئے اپنی بود و باش اختیار کر لیں۔ اس دوران اگر محمد (ﷺ) ہماری قوم پر غالب آ جائے تو ہم لوگ اس وقت نجاشی کے پاس ہوں گے اور ہماری خوش قسمتی ہوگی کہ ہم محمد (ﷺ) کے احسان مند ہونے کی بجائے شاہ حبشہ کے احسان مند رہیں گے اور اگر ہماری قوم غالب آ جائے تو پھر ہماری ناک اونچی تو رہے گی ہی، ہمیں اپنی قوم کی طرف سے خیر و بھلائی بھی پہنچے گی۔

حاضرین نے اس تجویز کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور کہا: ہاں، اس تجویز پر بہر حال عمل ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس میں ہمارا فائدہ ہی ہے نقصان نہیں۔

عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) نے کہا: تو پھر ہمارے پاس کچھ ایسی چیزیں جمع کراؤ جنہیں نجاشی کو بطور ہدیہ پیش کر سکیں تاکہ وہ یہ ہدیہ لے کر خوش ہو جائے اور ہماری عزت و تکریم کرے۔ ہماری سر زمین کی جو سب سے اچھی چیز نجاشی کے دل کو بھانے والی ہے، وہ چمڑا ہے۔

چنانچہ ہم سب نے مل کر نجاشی کو ہدیہ دینے کے لئے بہت سارا چمڑا اکٹھا کیا۔ پھر ہم اس کے ملک حبشہ جا پہنچے۔ ہم ابھی نجاشی کے دربار کی طرف جا ہی رہے تھے کہ رسول اکرم ﷺ کے ایلچی عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ ہمیں نظر آئے جنہیں رسولِ اکرم ﷺ نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور دیگر مہاجرین صحابہ کے بارے میں کچھ کہہ کر نجاشی کی خدمت میں بھیجا تھا۔ عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ نجاشی کے

دربار میں داخل ہوئے اور جو کچھ کہنا تھا، کہہ سن کر باہر نکل گئے۔

میں نے اپنے دوستوں سے کہا: یہ عمرو بن امیہ ضمری ہے، میں نجاشی کی خدمت میں پہنچ کر اس سے کہتا ہوں کہ تم اس آدمی کو میرے حوالے کردو جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر بددین ہوگیا ہے، اگر نجاشی میری بات مان لے اور اسے میرے حوالے کردے تو میں اس کی گردن اڑا دوں۔ جب میں یہ کام انجام دے دوں گا تو یقیناً قریش کو بڑی خوشی حاصل ہوگی اور محمد (ﷺ) کے ایلچی کے قتل سے وہ ایک قسم کی راحت محسوس کریں گے، اور میں بھی سمجھوں گا کہ میں نے ان کا حق ادا کردیا۔

میں اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ کر نجاشی کے دربار میں گیا۔ دربار میں داخل ہوتے ہی اس کے سامنے حسب معمول سجدے میں گر گیا۔ نجاشی نے کہا:

«مَرْحَبًا بِصَدِيقِي، أَهْدَيْتَ إِلَيَّ مِنْ بِلَادِكَ شَيْئًا؟»

”میرے دوست کا آنا مبارک ہو؛ کیا تم اپنے ملک سے میرے لیے کوئی چیز بطورِ ہدیہ لائے ہو؟“

میں نے کہا: ہاں، بادشاہ سلامت! میں آپ کے لیے بہت سارا چمڑا بطورِ ہدیہ لایا ہوں۔ پھر میں نے ہدیہ اس کی خدمت میں پیش کیا، وہ بہت ہی خوش ہوا۔

اب میں نے اپنا تیر آزمانا چاہا کیوں کہ نجاشی بڑا خوش تھا اور خوشی کے وقت انسان لوگوں کے بہت کام آتا ہے، اسی لیے میں نے چاہا کہ اپنے مقصد کی بات کہہ ڈالوں۔ چنانچہ میں نے نجاشی سے کہا:

”بادشاہ سلامت! ابھی ابھی میں نے ایک آدمی کو آپ کے پاس سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے، جو ہمارے دشمن کا ایلچی تھا۔ آپ اسے میرے حوالے کردیں تاکہ میں اسے قتل کردوں کیوں کہ اس نے ہمارے اشراف اور بزرگوں کو

بہت تکلیف دی ہے۔‘‘

یہ سننا تھا کہ نجاشی غصے سے بھڑک اٹھا اور کھینچ کر ایک زوردار طمانچہ اپنی ہی ناک پر دے مارا۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

«فَغَضِبَ، ثُمَّ مَدَّ يَدَهُ فَضَرَبَ بِهَا أَنْفَهُ ضَرْبَةً ظَنَنْتُ أَنَّهُ قَدْ كَسَرَهُ، فَلَوِ انْشَقَّتْ لِيَ الْأَرْضُ لَدَخَلْتُ فِيهَا فَرَقًا مِنْهُ».

’’نجاشی یہ سنتے ہی سخت غضبناک ہو گیا، اپنا ہاتھ دراز کیا اور کھینچ کر اپنی ہی ناک پر زوردار ضرب لگائی، میں سمجھا کہ اس نے اپنی ناک توڑ ڈالی؛ اگر زمین میرے لیے پھٹ جاتی تو میں اس کے خوف سے زمین میں چھپ جاتا۔‘‘

میں نے کہا:

«أَيُّهَا الْمَلِكُ، وَاللهِ لَوْ ظَنَنْتُ أَنَّكَ تَكْرَهُ هَذَا مَا سَأَلْتُكَهُ».

’’بادشاہ سلامت! اللہ کی قسم! اگر مجھے گمان بھی ہوتا کہ آپ کو میری یہ بات ناگوار لگے گی تو میں ہرگز آپ سے نہ کہتا۔‘‘

نجاشی گویا ہوا:

«أَتَسْأَلُنِي أَنْ أُعْطِيَكَ رَسُولَ رَجُلٍ يَأْتِيهِ النَّامُوسُ الْأَكْبَرُ الَّذِي كَانَ يَأْتِي مُوسَى، لِتَقْتُلَهُ؟».

’’کیا تم مجھ سے اس شخصیت کے پیغامبر کو قتل کرنے کے لیے طلب کر رہے ہو جس کے پاس وہی ناموسِ اکبر (جبرئیل علیہ السلام) آتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا؟‘‘

میں نے کہا: بادشاہ سلامت! کیا یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرح نبی ہے؟

نجاشی بولا:

«وَيْحَكَ يَا عَمْرُو، أَطِعْنِي وَاتَّبِعْهُ، فَإِنَّهُ وَاللهِ! لَعَلَى الْحَقِّ، وَلَيَظْهَرَنَّ عَلَى مَنْ خَالَفَهُ، كَمَا ظَهَرَ مُوسَى عَلَى فِرْعَوْنَ وَجُنُودِهِ».

''اے عمرو! تیری بربادی ہو، میری بات مانو اور محمد ﷺ کی پیروی کر لو، کیوں کہ اللہ کی قسم! وہ نبیٔ برحق ہیں اور مخالفین پر ضرور ان کو غلبہ حاصل ہو گا جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے لاؤ لشکر پر غالب آئے تھے۔''

میں نے عرض کیا: پھر آپ محمد ﷺ کی جانب سے مجھ سے اسلام پر بیعت لے سکتے ہیں؟

نجاشی نے کہا: ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

پھر اس نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور میں نے اس کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ جب میں اپنے دوستوں کے پاس واپس آیا تو اسلام اور محمد ﷺ کے بارے میں میری رائے بالکل بدل چکی تھی۔ میں نے اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں ساری باتیں ان سے چھپائے رکھیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے رسول اکرم ﷺ سے ملنے کے لئے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ ابھی میں نکل ہی رہا تھا کہ مجھے خالد بن ولید اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہما نظر آئے جو مکہ سے آ رہے تھے، یہ فتح مکہ سے کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے، میں نے ان سے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے اے ابوسلیمان؟

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

«وَاللهِ! لَقَدِ اسْتَقَامَ الْمَنْسِمُ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَنَبِيٌّ، أَذْهَبُ - وَاللهِ - أُسْلِمُ، فَحَتَّى مَتَى؟».

’’اللہ کی قسم! (محمد ﷺ کا) دین مستحکم ہو گیا یقیناً وہ آدمی نبی ہے، اللہ کی قسم! میں اسلام قبول کرنے کے لیے نکلا ہوں، آخر کب تک میں حق کو زبردستی ناحق سمجھ کر اس کے خلاف جنگ لڑتا رہوں گا۔‘‘

میں نے کہا: «وَاللهِ! مَا جِئْتُ إِلَّا لِأُسْلِمَ».

’’اللہ کی قسم! میرے جانے کا مقصد بھی اسلام قبول کرنا ہی ہے۔‘‘

چنانچہ اب ہم تینوں مدینہ منورہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت خالد بن ولید ؓ آگے بڑھے اور اسلام قبول کر کے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، پھر عثمان بن طلحہ نے بیعت کی۔ آخر میں میں آپ ﷺ کے قریب ہوا اور عرض کیا:

«يَا رَسُولَ اللهِ، إِنِّي أُبَايِعُكَ عَلَى أَنْ يُغْفَرَلِي مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِي- وَلَا أَذْكُرُ مَا تَأَخَّرَ-».

’’اے اللہ کے رسول! میں آپ سے اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ میرے میرے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں۔ میں اپنے گزشتہ کرتوتوں کا تذکرہ نہیں کروں گا اور نہ ہی دوبارہ ان کا ارتکاب کروں گا۔‘‘

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يَا عَمْرُو، بَايِعْ، فَإِنَّ الْإِسْلَامَ يَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهُ، وَإِنَّ الْهِجْرَةَ تَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهَا».

’’اے عمرو! بیعت کرو، اسلام گزشتہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اسی طرح ہجرت بھی پہلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے۔‘‘

پھر میں نے بیعت کی اور واپس آ گیا۔ (1)

---

(1) دیکھئے مسند أحمد(198/4)، البداية والنهاية(403/6)، مجمع الزوائد(350/9)۔

بچپن ہی میں نبوت کی خوشخبری

رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب بن عبدالمطلب نے جب ملکِ شام کی طرف تجارتی قافلے کے ساتھ نکلنا چاہا اور قافلے کے کوچ کا وقت آن پہنچا تو رسولِ اکرم ﷺ اپنے چھوٹے قدموں پر چلتے ہوئے آئے اور عرض کیا: چچا جان! میں بھی اس تجارتی قافلے میں آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں، میں آپ کے بغیر اکیلے نہیں رہ سکتا، آپ کی یاد مجھے ستائے گی۔ اور پھر ابو طالب کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اپنی پیار بھری آواز میں کہنے لگے:

«يَا عَمِّ، إِلَى مَنْ تَكِلُنِي؟ لَا أَبَ لِي وَلَا أُمَّ لِي؟».

”چچا جان! آخر آپ مجھے کس کے حوالے کر کے سفر پر جا رہے ہیں؟ میرے ابو جان بھی میری دیکھ بھال کے لیے اس دنیا میں نہیں رہے اور نہ ہی میری امی جان اب اس دنیا میں میرے لیے زندہ ہیں؟“

یہ جملہ جب کسی یتیم اور معصوم بچے کی زبان سے نکلے جس نے اپنی زندگی کی خوشیاں ماں باپ کی شکل میں نہ دیکھی ہوں تو اس کے مربّی پر کیا کچھ اثر پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ابو طالب بن عبد المطلب کی پرورش و پرداخت میں پروان چڑھنے والے اس یتیم بچے کی طرح کسی معصوم کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر لے رکھی ہو۔

نوخیز زبان سے نکلنے والے جملے سے چچا کا دل یک دم پسیج سا گیا اور فوراً بھتیجے کی دلجوئی کے لیے گویا ہوئے:

«وَاللهِ! لَأَخْرُجَنَّ بِهِ مَعِي، وَلَا يُفَارِقُنِي وَلَا أُفَارِقُهُ أَبَدًا».

”اللہ کی قسم! میں اپنے بھتیجے کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا، یہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی میں اس سے کبھی علیحدہ ہوں گا۔“

چنانچہ ابوطالب نے بھتیجے کو ساتھ لیا اور قافلے کے ساتھ ملک شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ طویل سفر طے کر کے سرزمین شام کے مقام بُصریٰ میں پہنچے اور قافلے کے ساتھ وہیں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں کے گرجا گھر میں ایک پادری رہا کرتا تھا جس کا نام بحیرہ تھا۔ عیسائیوں کے دعوے کے مطابق وہ دینِ مسیحی کا سب سے بڑا عالم تھا اور یہی ان کا عقیدہ بھی ہے کہ جو بھی پادری بنتا ہے وہ اپنے پیشوا سے موروثی علم حاصل کرتا ہے اور وہی مذہبی رہنمائی بھی کرتا ہے۔

اس سفر سے قبل بھی مکہ کے تاجروں کا معمول تھا کہ وہ تجارتی قافلے کے ساتھ جب ملک شام کا سفر کرتے تو اکثر و بیشتر بُصریٰ میں اس گرجا گھر کے قریب اپنا پڑاؤ ڈالتے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ پادری اپنے گرجا گھر سے نکل کر ان کے پاس آیا ہو اور ان سے کسی قسم کی گفتگو کی ہو۔ مگر عجیب اتفاق کہ اس بار اس نے نہ صرف یہ کہ ان سے گفتگو کی بلکہ پورے قافلے کے لیے دعوتِ عام کا اہتمام بھی کیا۔

سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ پادری کی اس دعوت کا راز دراصل رسولِ اکرم ﷺ پر ظاہر ہونے والی نبوت کی نشانی تھی جسے پادری نے دیکھ لیا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب قافلہ دور دراز کا طویل سفر طے کر کے بُصریٰ کے گرجا گھر کے قریب پہنچا تو اس پادری نے قافلے کے اوپر ایک بادل دیکھا جو سارے لوگوں کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے بچے پر اپنا سایہ کیے ہوئے تھا۔ جب قافلے نے گرجا گھر کے قریب ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا تو بادل نے درخت پر اپنا سایہ پھیلا دیا اور درخت کی ڈالیوں نے رسول اکرم ﷺ کی طرف جھک کر ان کو اپنی چھاؤں میں لے لیا۔

یہ سارا منظر پادری اپنے گرجا گھر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً گرجا گھر سے نکل کر باہر آیا اور قافلے والوں کے لیے ایک بھاری دعوت کا بندوبست کیا۔

جب کھانا تیار ہو گیا تو قافلے والوں کے پاس یہ کہہ کر دعوت بھیجی:

«إِنِّي قَدْ صَنَعْتُ لَكُمْ طَعَامًا يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، فَأَنَا أُحِبُّ أَنْ تَحْضُرُوا كُلُّكُمْ، صَغِيرُكُمْ وَكَبِيرُكُمْ، عَبْدُكُمْ وَحُرُّكُمْ».

"اے قافلۂ قریش! میں نے تمہارے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا ہے، میری خواہش ہے کہ تم سب لوگ میری دعوت میں شرکت کرو۔ چھوٹا بڑا، غلام اور آزاد سبھی شریک ہوں۔"

قافلے والوں میں سے ایک شخص نے کہا:

«وَاللهِ يَا بَحِيرَةُ! إِنَّ لَكَ لَشَأْنًا الْيَوْمَ، فَمَا كُنْتَ تَصْنَعُ هَذَا بِنَا، وَقَدْ كُنَّا نَمُرُّ بِكَ كَثِيرًا، فَمَا شَأْنُكَ الْيَوْمَ!؟».

"اللہ کی قسم اے بحیرہ! آج تو نے خلافِ معمول کام کیا ہے، ضرور کوئی بات ہے، اس دعوت کا اہتمام تو نے پہلے کبھی نہیں کیا۔ جب کہ اکثر وبیشتر ہمارا گزر تیرے پاس ہی سے ہوتا رہا ہے، پھر آخر آج بات کیا ہے؟"

بحیرہ نے اس کے جواب میں کہا:

«صَدَقْتَ، قَدْ كَانَ مَا تَقُولُ، وَلَكِنَّكُمْ ضَيْفٌ وَقَدْ أَحْبَبْتُ أَنْ أُكْرِمَكُمْ وَأَصْنَعَ لَكُمْ طَعَامًا فَتَأْكُلُوا مِنْهُ كُلُّكُمْ».

"تو سچ کہتا ہے، بات وہی ہے جو تو کہتا ہے لیکن تم میرے مہمان ہو، میری تمنا ہے کہ میں تمہاری مہمان نوازی کروں، اس لیے میں نے تم لوگوں کے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا ہے، لہٰذا تم سب میری دعوت میں شریک ہو کر کھانا تناول کرو۔"

چنانچہ قافلے کے تمام افراد پادری کی اس دعوت میں شریک ہوئے، صرف رسول اکرم ﷺ اس دعوت میں شرکت نہیں کر سکے، کیوں کہ آپ بچے تھے اور درخت کے نیچے قافلے کے سامان کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ جب بحیرہ نے مدعوین کی طرف غور سے دیکھا تو ان میں اس صفت کی حامل شخصیت اسے نظر نہیں آئی جس کی وہ پہچان کر چکا تھا اور جو صفات اس نے پہلے سے پڑھ رکھی تھیں۔

چنانچہ وہ گویا ہوا:

«يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ، لَا يَتَخَلَّفَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ عَنْ طَعَامِي».

”اے قافلۂ قریش! تم میں سے کوئی بھی ہرگز ہرگز میری دعوت سے پیچھے نہ رہنے پائے۔“

اہلِ قافلہ نے کہا: اے بحیرہ! تمہاری اس دعوت میں شرکت سے کوئی پیچھے نہیں، صرف ایک بچہ شریک نہیں ہو سکا، کیوں کہ وہ ابھی کم سن و کم عمر ہے، اس لیے وہ قافلے والوں کے سامان کے پاس ہی رہ گیا ہے۔

بحیرہ نے کہا: نہیں نہیں، ایسا نہ کرو بلکہ اسے بھی میری دعوت میں شریک ہونے کا موقع دو، تاکہ وہ بھی تمہارے ساتھ مل کر کھانا کھائے۔

قافلے میں سے ایک شخص گویا ہوا:

«وَاللَّاتِ وَالْعُزَّى! إِنْ كَانَ لَلُؤْمٌ بِنَا أَنْ يَتَخَلَّفَ ابْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ عَنْ طَعَامٍ مِنْ بَيْنِنَا».

”لات وعزیٰ کی قسم! یہ ہماری کم ظرفی ہوگی کہ عبد اللہ بن عبد المطلب کا صاحبزادہ ہمارے ساتھ دعوتِ طعام میں شرکت سے پیچھے رہے (اور ہم اس کے بغیر کھانا تناول کریں)۔“

پھر وہ مجلس سے اٹھ کر گیا اور رسول اکرم ﷺ کو اپنے ساتھ بلا کر لایا اور آپ کو قافلے والوں کے ساتھ بٹھا دیا۔ جب بجیرہ کی نگاہ آپ پر پڑی تو وہ بڑے دھیان سے ٹکٹکی باندھ کر آپ کی طرف دیکھنے لگا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ جو کچھ صفات اس نے پڑھ رکھی تھیں، ان کا وہ بغور معاینہ کر رہا تھا۔ جب سارے لوگ کھانا کھا کر فارغ ہو گئے اور اِدھر اُدھر پھیل گئے تو بجیرہ اٹھ کر رسول اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا:

«يَا غُلَامُ، أَسْأَلُكَ بِحَقِّ اللَّاتِ وَالْعُزَّى، إِلَّا مَا أَخْبَرْتَنِي عَمَّا أَسْأَلُكَ عَنْهُ».

”اے بچے! میں تجھے لات وعزیٰ کا واسطہ دیتا ہوں کہ جو کچھ میں تجھ سے پوچھوں گا، اس کا صحیح صحیح جواب دینا۔“

دراصل بجیرہ نے لات وعزیٰ کا واسطہ اس لیے دیا کہ اس نے آپ کی قوم کے لوگوں کو لات وعزیٰ کی قسم کھاتے ہوئے سن رکھا تھا۔

ابنِ اسحاق کے راجح قول کے مطابق پادری نے آپ سے جو لات وعزیٰ کا واسطہ دے کر پوچھا تھا، وہ بطور امتحان تھا، کیوں کہ وہ صحیح طور سے آپ کی شخصیت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ غرض پادری بجیرہ کی یہ بات سن کر رسولِ اکرم ﷺ نے فوراً اس کی گرفت فرمائی اور گویا ہوئے:

«لَا تَسْأَلْنِي بِاللَّاتِ وَالْعُزَّى، فَوَاللهِ! مَا أَبْغَضْتُ شَيْئًا قَطُّ بُغْضَهُمَا».

”مجھے لات وعزیٰ کا واسطہ دے کر کوئی بات مت پوچھو، اللہ کی قسم! ان دونوں معبودانِ باطلہ سے زیادہ میں نے کسی چیز سے بغض ونفرت نہیں کی۔“

بحیرہ نے کہا: پھر میں اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ تجھ سے میں جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دینا۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«سَلْنِي عَمَّا بَدَا لَكَ».

''جو چاہو پوچھو۔''

اس کے بعد پادری بحیرہ نے آپ سے آپ کے سونے جاگنے اور دیگر حالات کے بارے میں سوالات کیے اور آپ نے اس کو اپنے بارے میں سب کچھ بتایا۔ آپ کے جوابات سن کر پادری بحیرہ نے وہ سارے اوصاف اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کے موافق پائے جو کچھ اس نے پڑھ رکھے تھے یا آپ کے متعلق اپنے پیشواؤں سے سن رکھے تھے۔ پھر اس نے آپ کی پیٹھ پر دونوں مونڈھوں کے درمیان ''مہر نبوت'' بھی دیکھی۔

پادری بحیرہ یہ سب دیکھنے سننے کے بعد رسول اکرم ﷺ کے چچا ابو طالب بن عبدالمطلب کے پاس آیا اور پوچھا:

«مَا هٰذَا الْغُلَامُ مِنْكَ؟».

''یہ بچہ آپ کا کیا لگتا ہے؟''

ابو طالب نے جواب دیا: '' ابْنِي ''. ''یہ میرا بچہ ہے۔''

پادری بحیرہ نے کہا:

«مَا هُوَ بِابْنِكَ، وَمَا يَنْبَغِي لِهٰذَا الْغُلَامِ أَنْ يَكُونَ أَبُوهُ حَيًّا».

''یہ آپ کا بیٹا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کا باپ زندہ ہو سکتا ہے۔''

ابو طالب نے بتایا: «فَإِنَّهُ ابْنُ أَخِي» ''دراصل یہ میرے بھائی کا لختِ جگر ہے۔''

پادری بحیرہ نے پوچھا: اس کے والد کے متعلق بتائیں؟

ابو طالب نے بتایا: اس کے والد کا انتقال اسی وقت ہو گیا جب کہ یہ شکم مادر میں تھا۔

پادری بحیرہ نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ اب آپ اس بچے کو لے کر پہلی فرصت میں اپنے وطن کو لوٹ جائیں اور یہودیوں سے ہوشیار رہیں۔

«فَوَاللهِ! لَئِنْ رَأَوْهُ وَعَرَفُوا مِنْهُ مَا عَرَفْتُ لَيَبْغُنَّهُ شَرًّا، فَإِنَّهُ كَائِنٌ لِابْنِ أَخِيكَ هَذَا شَأْنٌ عَظِيمٌ، فَأَسْرِعْ بِهِ إِلَى بِلَادِهِ».

''اللہ کی قسم! اگر یہود اس بچے کو دیکھیں گے اور جو کچھ میں نے (نبوت کی نشانیاں) اس میں دیکھی ہیں، وہ بھی دیکھ لیں گے تو اس کے ساتھ ناروا سلوک کریں گے اور ظلم ڈھائیں گے، کیوں کہ مستقبل میں آپ کے اس بچے کی ایک عظیم شان ہونے والی ہے، اس لیے آپ جلدی سے اسے اس کے وطن لے کر چلے جائیں۔''

ابو طالب نے جب بحیرہ راہب کی یہ بات سنی تو ملک شام میں اپنے تجارتی کاروبار سے فراغت پاتے ہی فوراً اپنے وطن کو روانہ ہو گئے اور رسول اکرم ﷺ کو لے کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ رسول اکرم ﷺ کی عمر اس وقت قریباً بارہ سال تھی۔ (1)

---

(1) دیکھئے: سیرۃ ابن ھشام (181/1)، دلائل النبوۃ ، بیہقی (29-27/2)، مستدرک حاکم (615/3)، علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس واقعے کی تصدیق کی ہے۔

بے سود فیاضی

عبداللہ بن جدعان بن کعب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رشتے میں چچا لگتا تھا۔ اس کا شمار زمانۂ جاہلیت کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جو لوگوں کو کھانا کھلانے اور امداد فراہم کرنے میں صف اول میں گنے جاتے تھے۔ شروع شروع میں یہ فقیر و کنگال تھا، بدچلنی اس کی عادت تھی اور معصیت و گناہ کے کاموں میں بکثرت ملوث رہنا اس کی فطرت۔ اس کی اخلاقی پستی اور شرارتوں سے تنگ آ کر اس کے خاندان و قبیلے والے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا گھرانہ بلکہ اس کا باپ بھی اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔

گھر، خاندان اور قبیلے کی نفرت آمیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر وہ ایک دن مکہ کی گھاٹیوں کی طرف نکل پڑا۔ اس کی نظر پہاڑ کی ایک کھوہ پر پڑی۔ سوچا ممکن ہے، اس کے اندر کوئی موذی جانور ہو جو مجھے موت کے گھاٹ اُتار دے، چنانچہ جان بوجھ کر کھوہ کی طرف بے خوف بڑھا تاکہ خود کو موت کے منہ میں ڈال دے اور پھر گھر، خاندان اور قبیلے کی طرف سے جس نفرت و بغض کا اسے سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس ذلت و عار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام پا جائے۔

جب وہ غار کے قریب پہنچا تو اسے ایک اژدھا نظر آیا جو لگتا تھا کہ جیسے اسی کی طرف بڑھنے کے لئے چھلانگ مارنے ہی والا ہو۔ یہ دیکھ کر وہ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر اژدھے کی جانب بڑھنے لگا۔ جب اژدھے کے نزدیک ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ تو سونے کا بنا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں میں یاقوت لگے ہوئے تھے جو چمک رہے

تھے۔ وہ غار کے اندر داخل ہوا۔ غار میں قبیلۂ جرہم کے بادشاہوں کی چند قبریں تھیں۔ ایک قبر حارث بن مضاض کی بھی تھی جو ایک طویل مدت پہلے غائب ہو گیا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آخر وہ گیا کدھر، آیا اسے آسمان نے اچک لیا، یا زمین کھا گئی۔

عبداللہ بن جدعان کو ان قبروں کے سرہانے سونے کا ایک تختہ ملا جس پر ان بادشاہوں کی تاریخِ وفات اور ان کی مدتِ حکومت کی تفصیل درج تھی۔ نیز ان کی قبروں کے پاس ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کا انبار تھا۔ عبداللہ بن جدعان نے غار کے اندر سے حسبِ خواہش جواہرات لیے اور غار کے منہ پر پہچان کے لیے نشان لگا کر نکل گیا۔

جب وہ لوٹ کر اپنی قوم کے پاس آیا تو انھیں خوب دولت سے نوازا، چنانچہ لوگ اس کو محبوب جاننے لگے اور اسے اپنا سردار بھی تسلیم کر لیا۔ عبداللہ بن جدعان لوگوں کو کھانا کھلاتا اور جب کبھی اس کے پاس دولت ختم ہو جاتی تو غار سے جا کر حسبِ خواہش ہیرے جواہرات اور سونا چاندی نکال لاتا۔ لوگوں کو کھانے میں کھجور اور ستو دیتا اور پینے میں دودھ کا بندوبست کرتا۔

عبداللہ بن جدعان نے ملکِ شام کی طرف دو ہزار اونٹ بھیجے تھے جن پر گیہوں، شہد اور گھی لاد کر مکہ لایا گیا، پھر اس نے ایک منادی کرنے والے کی یہ ذمے داری لگا دی کہ وہ ہر رات خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر لوگوں میں کھانے کے لیے دعوتِ عام کا اعلان کرے؛ چنانچہ ہر رات وہ منادی کرنے والا اعلان کرتا:

«هَلُمُّوا إِلَى جَفْنَةِ ابْنِ جُدْعَانَ».

”ابن جدعان کی دیگ کی طرف آؤ! (یعنی اس کی دعوتِ طعام کو قبول کرو)۔“

صحیح مسلم کی شرح میں عبداللہ بن جدعان کی دیگ کے متعلق لکھا ہے:

”ابن قتیبہ کہتے ہیں:

«كَانَتْ جَفْنَةُ طَعَامِهِ يَأْكُلُ مِنْهَا الرَّاكِبُ عَلَى بَعِيرِهِ».

”یعنی عبداللہ بن جدعان کی دعوتِ طعام والی دیگ اس قدر بڑی تھی کہ اس سے اونٹ سوار سواری کی پیٹھ پر ہی کھانا لے کر کھا لیتا تھا۔“

النہایۃ فی غریب الحدیث میں ایک حدیث آئی ہے جس میں رسولِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

«كُنْتُ أَسْتَظِلُّ بِظِلِّ جَفْنَةِ عَبْدِاللهِ بْنِ جُدْعَانَ».

”میں عبداللہ بن جدعان کی دیگ کی چھاؤں میں سایہ حاصل کرتا تھا۔“

نیز یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس دیگ سے کھانا نکالنے کے لیے سیڑھی کی مدد لی جاتی تھی۔ «يُرْوَى: أَنَّهُ كَانَ يُرْقَى إِلَيْهَا بِسُلَّمٍ».(1)

مگر اس قدر فیاضی اور دعوتِ عام کے باوجود وہ اللہ کے دربار میں سرخرو نہ ہو سکا کیونکہ اللہ کے دربار میں سرخروئی کا جو فارمولا ہے اسے اس نے یکسر فراموش کر رکھا تھا۔ صحیح مسلم میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ، ابْنُ جُدْعَانَ: كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَصِلُ الرَّحِمَ وَيُطْعِمُ الْمِسْكِينَ، فَهَلْ ذَاكَ نَافِعُهُ؟».

”میں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! ابن جدعان زمانۂ جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا اور مسکینوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا، کیا یہ سب اس کے حق میں نفع بخش ثابت ہوں گے؟“

---

(1) شرح الأبیّ و السنوسی علی صحیح مسلم (629/1) طبع اوّل 1994۔ دارالکتب العلمیہ بیروت۔ نیز دیکھئے: البدایۃ والنہایۃ (266/3)۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَنْفَعُهُ، إِنَّهُ لَمْ يَقُلْ يَومًا: رَبِّ اغْفِرلِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ».

نہیں! یہ سب اس کے کچھ کام نہیں آئیں گے، کیونکہ اس نے کبھی بھی (اپنی بندگی اور عبودیت کا اظہار کر کے) یہ نہیں کہا: اے میرے پروردگار! قیامت کے دن میری خطاؤں کو معاف کر دینا۔"(1)

---

(1) صحيح مسلم : كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من مات على الكفر لاينفعه عمل، حديث (214)۔

وفادار اعرابی

حجاج بن یوسف کے دور میں مختلف بغاوتیں ہوتی رہیں جن کو حجاج بڑی سختی سے کچلتا رہا۔ بغاوت کی مرتکب ایک قوم پر اسے غلبہ حاصل ہوا تو اس نے فوجیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ جلادوں نے قتل کرنا شروع کیا۔ جب ایک اعرابی باقی رہ گیا تو نماز کا وقت ہو گیا۔ حجاج نے اپنے ایک سالار اور معتمد قتیبہ بن مسلم کو بلایا اور کہا کہ یہ شخص آج رات تمہارے پاس رہے گا۔ کل اسے ہمارے ہاں پیش کیا جائے۔

قتیبہ بن مسلم کہتے ہیں کہ میں نے اس اعرابی کو اپنے ہمراہ لیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے بڑی لجاجت سے کہا کہ قتیبہ! اگر تمہارے اندر کوئی خیر کا جذبہ ہے تو میں ایک بات کہوں۔ میں نے کہا کہ ہاں بتاؤ، کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میرے پاس لوگوں کی امانتیں ہیں اور کل حجاج مجھے قتل کرنے والا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم مجھے گھر جانے دو تاکہ میں لوگوں کی امانتیں واپس کر دوں، حق داروں کا حق ادا کر دوں اور جو کچھ مجھے لینا دینا ہے اپنے ورثاء کو بتا آؤں۔ میں رب العزت کو اپنا کفیل بناتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں کل واپس آ جاؤں گا۔

میں نے اس کی بات پر بڑا تعجب کیا اور مسکرایا بھی کہ یہ کس قسم کی بات کر رہا ہے۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگا کہ میں رب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں کل واپس آ جاؤں گا، مجھے جانے دو۔ میں مسلسل انکار کرتا رہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہیں چھوڑ دوں اور تم واپس آ جاؤ گے۔ اس شخص کا اصرار جاری رہا

اور مسلسل میری منت سماجت کرتا رہا حتی کہ مجھے اس پر ترس آ گیا اور اعتبار کر لیا۔ چنانچہ میں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔

جیسے ہی اسے اجازت ملی وہ فوراً اپنے گھر روانہ ہو گیا اور ادھر اس کے جانے کے بعد مجھے پچھتاوا لگ گیا کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ اسے کیوں چھوڑ دیا! یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ واپس آئے۔ ادھر حجاج کا ڈر کہ اس کو قیدی نہ دیا تو اس کا میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ بہر حال وہ رات میری زندگی کی سب سے بھیانک رات تھی، جو مسلسل غم اور مناجات میں گزری۔

اگلے دن صبح سویرے ہی میرے گھر کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں فوراً باہر گیا۔ دیکھا تو وہ اعرابی دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے اس کو دیکھا تو میری جان میں جان آئی۔ پوچھا کہ واپس آ گئے ہو۔ کہنے لگا: ہاں، تمہارے سامنے تو کھڑا ہوں۔ دراصل مجھے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے کہا:

«جَعَلْتُ اللهَ كَفِيلًا وَلَا أَرْجِعُ؟».

”جب میں نے رب العزت کو اپنا کفیل بنایا تھا تو واپس کیسے نہ آتا؟“

میں اسے ہمراہ لے کر حجاج کے پاس حاضر ہوا۔ قیدی کو میں نے دربان کے پاس چھوڑا۔ حجاج نے دیکھتے ہی مجھ سے سوال کیا کہ قتیبہ! وہ ہمارا قیدی کدھر ہے؟ میں نے کہا کہ امیر کی خیر اور سلامتی ہو، دروازے پر کھڑا ہے۔ میں دروازے کی طرف لپکا اور اس کو حجاج کی خدمت میں پیش کر دیا اور رات والا واقعہ بھی بیان کر دیا۔ حجاج نے اس قیدی کو اوپر سے نیچے‘ نیچے سے اوپر دیکھنا شروع کر دیا، گویا وہ کوئی فیصلہ کر رہا ہے۔ اچانک حجاج کی آواز گونجی:

«وَهَبْتُهُ لَكَ».

”یہ قیدی میں نے تمہیں بخش دیا۔ اب جو اس کے ساتھ سلوک کرنا چاہو تمہاری مرضی ہے۔“

میں نے قیدی کو ہمراہ لیا اور باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر قیدی سے کہا: جہاں تمہارا جی چاہے چلے جاؤ، میری طرف سے تم آزاد ہو۔

اعرابی نے آسمان کی طرف چہرہ کیا اور کہا:

«اللَّهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ» .

”اے اللہ! تمام تعریف تیرے ہی لیے ہے اور تیرا شکر ہے۔“

اس کے بعد اس نے نہ کوئی دوسرا کلمہ کہا اور نہ ہی میرا شکریہ ادا کیا اور ایک طرف چل دیا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ میں نے اس شخص کو موت کے چنگل سے نکالا ہے، مگر اس نے میرا شکریہ ادا کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا: رب کعبہ کی قسم! یہ بدو مجنوں ہے، پاگل ہے۔

اگلے دن وہ اعرابی دوبارہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا:

«يَا هَذَا ، جَزَاكَ اللهُ عَنِّي أَفْضَلَ الْجَزَاءِ ، وَاللهِ! مَا ذَهَبَ عَنِّي أَمْسِ مَا صَنَعْتُ ، وَلَكِنْ كَرِهْتُ أَنْ أُشْرِكَ فِي حَمْدِ اللهِ أَحَدًا» .

”بھائی! اللہ تعالیٰ تجھے میری طرف سے بہتر سے بہتر بدلہ دے، اللہ کی قسم! میں نے کل جاتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی تھی اور اسی کا شکریہ ادا کیا تھا، اور تیرا کوئی شکریہ ادا نہ کر سکا، اس کا مجھے خیال ہے، تم برا مت ماننا، میں نے ایسا اس لئے کیا کہ یہ بات مجھے اچھی نہ لگی کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کے شکر میں کسی غیر کو شریک کروں۔“ (1)

---

(1) حوالہ کیلئے دیکھئے کتاب ”طرائف وملح“ از موسی أحمدی۔

وعدے کا پاس

ایران کا مشہور سپہ سالار ہرمزان قیدی بنا کر عمر فاروق ؓ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جسے اس نے ٹھکرا دیا۔ حضرت عمر ؓ نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے، کیوں کہ اس نے اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا تھا۔ جب اس کے قتل کی تیاری ہو گئی تو اس نے عمر فاروق ؓ کی طرف دیکھ کر کہا: میں پیاس سے نڈھال ہوں۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ مجھے قتل کرنے سے پہلے پینے کے لیے پانی دیا جائے۔ حکم ہوا کہ اسے پانی پلایا جائے۔ ہرمزان نے پانی کا پیالہ ہاتھ میں لیا اور عمر فاروق ؓ سے کہنے لگا: یہ پانی جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے، اسے پینے تک آپ لوگ مجھے قتل تو نہیں کریں گے؟

فرمایا: ہاں جب تک تم پانی نہیں پیو گے تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

اس نے جلدی سے پانی کو نیچے گرا کر ضائع کر دیا اور کہا: امیر المومنین! دیکھئے آپ نے وعدہ کیا ہے اب اس کو پورا کیجیے۔

حضرت عمر ؓ نے کہا: تمہیں قتل کرنے سے فی الحال رک جاتے ہیں۔ میں تمہارے معاملے میں غور و فکر کروں گا۔ پھر جلاد کو حکم دیا کہ تلوار ہٹا لو۔ اب اس نے بلند آواز میں پکارا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ».

حضرت عمر ؓ نے کہا: اسلام لے آئے ہو۔ اچھا کیا، مگر یہ تو بتاؤ جب میں نے تمہیں اسلام کی دعوت دی تھی اس وقت تم نے قبول کیوں نہ کیا۔ اس نے کہا: مجھے

اس بات کا ڈر تھا کہ اگر اس وقت اسلام قبول کروں گا تو میرے بارے میں کہا جائے گا کہ موت سے گھبرا کر اسلام لایا ہے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«عُقُولُ فَارِسَ تَزِنُ الْجِبَالَ».

''اہلِ فارس کی عقلیں پہاڑوں جیسی ہیں۔''

مراد یہ کہ یہ بڑے عقل مند و دانا ہیں، ان کی عقلیں عظیم الشان ہیں۔

درگزر کرنے والے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے، حضرت حسین کے بیٹے علی (زین العابدین) رحمۃ اللہ علیہ وضو کرنے کے لیے اٹھے۔ لونڈی گرم پانی کا لوٹا لیے حاضر ہوئی۔ اچانک اس کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا اور گرم پانی علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کے اوپر آ گرا۔ تکلیف کے عالم میں آپ نے اپنا سر اٹھا کر لونڈی کی طرف دیکھا تو وہ فوراً کہنے لگی کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی تعریف میں فرماتے ہیں:

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾

”(مومن) غصے کو پی جاتے ہیں۔“ [آل عمران: ۱۳۴]

ارشاد ہوا: «قَدْ كَظَمْتُ غَيْظِي»

”میں نے اپنے غصے پر قابو پایا۔“

اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾

”وہ لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔“

فرمایا:

«عَفَا اللّٰهُ عَنْكِ».

”اللہ تمھیں معاف کر دے۔“

اب اس نے مومنوں کی تیسری صفت بیان کی:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

”اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔“

آپ نے فرمایا: ہم نے تمھیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے آزاد کر دیا۔

دشمن جاں پر مہربانی

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نافذ کردہ عادلانہ اسلامی نظام کے بہت سے حاسدین اور مخالفین تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ خلیفہ ان کی بدکرداری کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور ان کی بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہیں، تو ان کے غلام کو ایک ہزار دینار میں خریدا گیا اور اس سے کہا گیا: تم خلیفہ کے کھانے میں زہر ملا دو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور آپ نے وہ کھانا تناول فرمالیا۔ زہر کے اثر سے بیمار ہوئے۔ طبیب نے بتایا: آپ کو زہر دیا گیا ہے۔ فرمایا: جس دن مجھے زہر دیا گیا تھا مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ پھر اپنے اس غلام کو طلب فرمایا جس نے انھیں زہر دیا تھا۔

فرمایا: «وَيْحَكَ مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا صَنَعْتَ؟».

”تمہارے لیے بربادی ہو! تم نے یہ کام کیوں کیا؟“

اس نے کہا: ایک ہزار دینار کے لیے جو مجھے ادا کیا گیا۔

آپ نے فرمایا: جاؤ یہ رقم جلدی سے لے کر آؤ۔

جب وہ ہزار دینار لے کر آیا تو آپ نے اسے بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا اور غلام سے کہا: جلدی سے اس جگہ بھاگ جاؤ جہاں کوئی تمہیں تلاش نہ کر سکے ورنہ لوگ تمہیں ہلاک کر دیں گے۔

اور وہ کامیاب ہو گیا

اس واقعہ کے راوی امام ابنِ حزم ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اُن سے ایک ایسے شخص نے بیان کیا جو ثقہ اور سچا انسان ہے: اہلِ قرطبہ (اسپین) میں ایک نوجوان نہایت خوبصورت تھا۔ جو بھی اس کو دیکھتا، اس کا ہو جاتا' یہ نوجوان خوبصورتی کے ساتھ ساتھ نہایت عبادت گزار اور متقی بھی تھا۔ اس نوجوان کا ایک دوست تھا جس کے ساتھ اسے گہری محبت تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسری بستی میں مقیم تھا۔ ایک مرتبہ یہ عابد اس سے ملنے کے لیے گیا۔ شام ہو چکی تھی، اس کے دوست نے کہا کہ وہ آج کی رات اسی کے ہاں قیام کرلے۔ چنانچہ وہ مان گیا۔

اتفاق سے رات کے وقت اس کے دوست کو ساتھ والی بستی سے کسی اہم کام کے لیے بلاوا آ گیا اور وہ اسے یہ کہہ کر چلا گیا کہ تم میرا انتظار کرو میں تھوڑی ہی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔ اب گھر میں اس کی بیوی اور یہ خوبصورت نوجوان اکیلے تھے۔ سردی کا موسم تھا اور بارش بھی ہو رہی تھی اور یوں بھی اس علاقے میں سردیوں کی راتیں بڑی لمبی اور تاریک ہوتی ہیں۔ گھر میں نوجوان اپنے دوست کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا۔ حتی کہ شہر کا دروازہ بند کرنے کا وقت ہو گیا۔ اس کو کوئی ایسی مجبوری آن پڑی کہ وہ نہ آ سکا۔

ادھر اس کی بیوی کو بھی یقین ہو گیا کہ اس کا خاوند رات کو واپس نہیں آ سکے گا۔ چنانچہ اس نے بناؤ سنگار کیا اور اس نوجوان کے پاس آ گئی، اور اپنے آپ کو پیش کیا۔ نوجوان عابد نے انکار کیا۔ مگر عورت نے بار بار اس کو دعوتِ گناہ دی۔

نوجوان تھوڑی دیر کے لیے بہکا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ چراغ جل رہا تھا، اس نوجوان نے اپنا ہاتھ چراغ کے اوپر کیا اور ذرا سا ہاتھ جلنے کے بعد پیچھے کھینچ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: دنیا کی معمولی سی آگ برداشت کرنے کی طاقت نہیں جبکہ جہنم کی آگ کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔ اس عورت نے پھر دعوتِ گناہ دی، نوجوان نے پھر اپنے جسم کو آگ کے قریب کیا۔ جسم جلا تو اس نے پھر پیچھے کرلیا۔ اسی طرح جب بھی اس کو گناہ کا خیال آتا، وہ اپنے آپ کو آگ کے شعلے کے قریب کرتا اور ذرا سی حدت برداشت کر کے اپنے آپ کو پیچھے کر لیتا۔

غرض کہ ساری رات اس نے اسی طرح جاگتے ہوئے اور توبہ واستغفار کرتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہوئی تو اس کا انگوٹھا آگ کی لپٹ سے سیاہ ہو چکا تھا۔

میں بڑا ہی منحوس ہوں

اصمعی اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے پاس ایک آدمی لایا گیا، اس پر الزام تھا کہ یہ بغاوت کرنے والے لوگوں کے ساتھ تھا۔ حکم ہوا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ اس شخص نے کہا: امیر المومنین! میری بات سن لیں پھر جو چاہیں کریں۔ دراصل بدلہ وہ نہیں جو آپ مجھے دے رہے ہیں۔ خلیفہ نے کہا کہ تمہارا بدلہ کیا ہے؟ اس نے کہا: امیر المومنین! میں جس کے ساتھ بھی آپ کے خلاف لڑائی کے لئے نکلا تو نظرِ بد لگانے کے لیے نکلا۔ معاملہ یوں ہے کہ میں بڑا ہی منحوس ہوں۔ میں جس کے ساتھ بھی نکلا، اسے شکست اور رسوائی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا اور اس کے مقابلے میں آپ کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی۔ اگر سچ پوچھیں تو میں آپ کے دشمنوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی آپ کے حق میں آپ کے لاکھوں خیر خواہوں سے بہتر ثابت ہوا ہوں۔ دیکھیے میں فلاں کے ہمراہ آپ کے خلاف لڑائی کے لیے نکلا تو وہ نیست و نابود ہوا، اس کے لشکر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ میں فلاں کے ساتھ نکلا تو وہ قتل ہو گیا۔ فلاں کے ہمراہ تھا تو اسے شکستِ فاش ہوئی۔ اس طرح اس نے کتنے ہی امراء کے نام گنوائے جن کے ساتھ وہ تھا اور انھیں شکست ہوئی۔

عبدالملک نے اس کی گفتگو سنی تو بے اختیار ہنسنے لگا اور اس کا راستہ چھوڑ دیا۔

اینٹ اور شراب

شرابی، ایک عالمِ دین سے: جناب! مجھے بتائیں کہ اگر میں کھجوریں کھاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

عالم: بالکل کوئی اعتراض نہیں۔

شرابی: اور اگر اس کے ساتھ کچھ جڑی بوٹیاں کھالوں؟

عالم: کوئی رکاوٹ نہیں۔

شرابی: اور اگر میں ان میں پانی شامل کرلوں؟

عالم: بڑے شوق سے پیو۔

شرابی: جب یہ ساری چیزیں جائز اور حلال ہیں تو پھر آپ شراب کو کیوں حرام کہتے ہیں، حالانکہ اس میں یہی تو چیزیں ہیں جن کے کھانے اور پینے کی اجازت آپ دے رہے ہیں۔ یعنی کھجوریں، پانی اور جڑی بوٹیاں!

عالم دین شرابی سے: اگر تمہارے اوپر پانی پھینکا جائے تو اس پر تمہیں کوئی اعتراض ہوگا؟

شرابی: ہرگز نہیں، پانی سے کیا فرق پڑتا ہے!

عالم: اچھا! اگر اس پانی میں مٹی گھول دی جائے تو تم اس سے مر جاؤ گے؟

شرابی: جناب! مٹی سے میں نے کسی کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

عالم: اگر میں مٹی اور پانی لوں اور ان کو گوندھ کر ایک اینٹ بنالوں، اور اسے خشک کر کے تمہیں دے ماروں تو کیا ایسا کرنے پر تمہیں کوئی اعتراض ہے؟

شرابی: جناب! اس سے تو آپ مجھے قتل کر دیں گے۔

عالم: شراب کا بھی یہی حال ہے۔

صدقے سے علاج

اس کا نام ڈاکٹر عیسیٰ مرزوقی تھا۔ شام کا رہنے والا عیسیٰ پیشے کے اعتبار سے طبیب تھا اور دمشق کے ایک ہسپتال میں کام کرتا تھا۔ اچانک اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور اس کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ چیک اَپ کے دوران معلوم ہوا کہ اسے کینسر کا موذی مرض لگ چکا ہے۔ اس کے ساتھی ڈاکٹروں نے علاج شروع کیا۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس کیس پر پوری توجہ دی۔

اس کی طبی رپورٹیں ان کے سامنے تھیں، مرض مسلسل بڑھ رہا تھا۔ بورڈ کی رائے کے مطابق وہ محض چند ہفتوں کا مہمان تھا۔ ڈاکٹر عیسیٰ خود نوجوان تھا۔ اس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، تاہم منگنی ہو چکی تھی۔ اس کی منگیتر سے لوگوں نے کہا: تمہیں منگنی توڑ دینی چاہیے، کیوں کہ تمہارا ہونے والا خاوند کینسر کا مریض ہے۔ مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ ادھر ڈاکٹر عیسیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کی حدیث پڑھ رکھی تھی:

«دَاوُوا مَرْضَاكُمْ بِالصَّدَقَةِ». (1)

"اپنے مریضوں کا علاج صدقہ سے کرو۔"

ایک دن وہ مایوسی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ اسے اچانک مذکورہ حدیث یاد آ گئی۔ وہ اس کے الفاظ پر غور کرتا رہا، سوچتا رہا، پھر اچانک اس نے سر ہلایا اور بول اٹھا: کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر مجھے اپنے مرض کا علاج صدقے کے ذریعے ہی کرنا چاہیے، کیونکہ دنیاوی علاج بہت کر چکا اور بہت ہو چکا۔

---

(1) [**حسن**] صحیح الجامع (3358)، أبوداود فی المراسیل (105)، مجمع الزوائد (63/3)۔

اس کو ایک ایسے گھرانے کا علم تھا جس کا سربراہ وفات پا چکا تھا اور وہ نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بیماری کے دوران اس کی جمع شدہ پونجی بھی خرچ ہوچکی تھی۔ تاہم جو معمولی رقم موجود تھی اس نے اپنے ایک قریبی دوست کی وساطت سے اس گھرانے کو ارسال کر دی۔ ان پر سارے قصے کو واضح کر دیا کہ وہ اس صدقے کے ذریعے اپنے مرض کا علاج کرنا چاہتا ہے لہٰذا مریض کے لیے شفا کی دعا کریں۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سچ ثابت ہوئی اور وہ بتدریج تندرست ہوتا گیا۔

ایک دن وہ ڈاکٹروں کے بورڈ کے سامنے دوبارہ پیش ہوا۔ اس کے علاج پر مامور ڈاکٹر حیران وششدر رہ گئے کہ اس کی رپورٹیں اس کی مکمل صحت یابی کا اعلان کر رہی تھیں۔ اس نے بورڈ کو بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق علاج کیا ہے۔ وہ اب مکمل طور پر تندرست تھا۔ اس نے ڈاکٹروں کو بتایا کہ بلاشبہ میں تقدیر پر یقین رکھتا ہوں اور اس کا یہ بھی مفہوم نہیں کہ ظاہری اسباب اختیار نہ کیے جائیں اور ڈاکٹروں سے بیماری کی صورت میں رجوع نہ کیا جائے۔ مگر حدیثِ رسول درست ہے۔ بلاشبہ ایک ایسی ذات موجود ہے جو بغیر کسی دوا کے بھی بیماروں کو صحت عطا کر سکتی ہے۔ (1)

---

(1) اس واقعے کو عربی ہفت روزہ المسلمون سے لیا گیا ہے جو اس کے شمارہ نمبر 181 میں شائع ہوا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ہفت روزہ لندن سے شائع ہوتا تھا اور اب کافی عرصے سے بند ہو چکا ہے۔

ٹوٹ گئے مٹکے

مورخ ابنِ عساکر اور علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ ابوحسین احمد بن محمد خراسانی نوری ایک مرتبہ بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے چل رہے تھے کہ قریب سے ایک کشتی گزری۔ دیکھا کہ ملاح بہت سارے شراب کے مٹکوں کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ ابوحسین نوری اس پر چڑھ گئے اور پوچھا: یہ کیا ہے اور کس کے لیے ہے؟

ملاح نے کہا: آپ کو اس سے کیا لینا دینا؟

ابوحسین نے اصرار کے ساتھ ملاح سے پوچھا: بتاؤ یہ کیا ہے؟

ملاح نے کہا:

«أَنْتَ وَاللهِ! كَثِيرُ الْفُضُولِ، هٰذَا خَمْرٌ لِلْمُعْتَضِدِ»

”اللہ کی قسم! آپ بڑے فضول گو آدمی ہیں، یہ خلیفہ معتضد باللہ کی شراب ہے۔“

ابوحسین کو بڑا سخت غصہ آیا، ہاتھ میں لاٹھی تھی، مٹکوں کو یکے بعد دیگرے توڑنا شروع کر دیا۔ ملاح اس دوران ان کو منع کرتا رہا، مگر وہ کب باز آنے والے تھے۔ چنانچہ ملاح نے خوب چیخ و پکار کی، لوگوں نے پولیس کو بلایا، اس دوران ایک مٹکے کے علاوہ سارے مٹکے ٹوٹ چکے تھے۔ پولیس نے ان کو پکڑا اور معتضد کے سامنے پیش کر دیا۔

خلیفہ معتضد نے پوچھا: «مَنْ أَنْتَ وَيْلَكَ؟» ”تمھاری بربادی ہو! آخر تم ہو کون؟“

جواب دیا: میں محتسب ہوں (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والا)۔

معتضد نے پوچھا: اس کام پر تمہیں کس نے متعین کیا ہے؟

کہنے لگے: امیر المومنین! جس ہستی نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے، اسی نے مجھے اس کام کا حکم دیا ہے۔

معتضد نے اپنے سر کو جھکایا اور بولا: یہ کام کرنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی اور تم نے یہ کیوں کیا؟

جواب میں کہنے لگے: تمہارے ساتھ محبت اور پیار کی وجہ سے کہ یہ تمہارے لیے نہایت غیر مفید، مکروہ اور نقصان دہ چیز تھی۔

خلیفہ نے پھر اپنے سر کو جھکایا، ذرا سا سوچا اور کہا: اچھا بتاؤ! تم نے سارے مٹکے توڑ دیے ایک جو باقی رہ گیا ہے، اس کو کیوں نہیں توڑا؟

فرمانے لگے: دراصل جب میں نے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا تو میرے دل میں محض رب کی رضا کی نیت تھی اور میں نے اس کی جلالت کی خاطر یہ کام کیا مگر آخری مٹکا توڑنے سے پہلے میرے دل میں اپنے تئیں عُجب آ گیا کہ میں نے اتنا بڑا کام کر دیا ہے، باوجود یہ جاننے کے کہ یہ مال خلیفہ کا ہے، کوئی پروا نہیں کی۔ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو پھر یہ کام رضائے الٰہی کے لیے نہیں رہا تھا۔ لہٰذا میں نے آخری مٹکا چھوڑ دیا۔

معتضد کہنے لگا: جاؤ! ہم نے تمہیں محتسب مقرر کر دیا ہے اور اب جو بھی تمہیں منکر نظر آئے اسے تبدیل کر دو۔

ابوحسین نوری نے فرمایا: جناب! اب میرا ارادہ اس کام کو کرنے کا نہیں رہا۔

معتضد نے پوچھا: کیوں، کیا وجہ ہے؟

جواب دیا: پہلے یہ کام رب کی رضا کے لیے اور اس کی مدد کے ساتھ کرتا تھا،

اوراب تمھیں راضی کرنے کے لیے پولیس کی مدد سے کروں گا۔

معتضد کہنے لگا: اگر آپ کی کوئی حاجت ہے تو پیش کریں۔

فرمانے لگے: مجھے اس دربار سے بغیر کسی ضرر کے نکلنے کی اجازت دے دیں، اور میرے راستے میں تمہارا کوئی آدمی رکاوٹ نہ بنے۔

معتضد نے حکم جاری کیا کہ ان سے کوئی اعراض نہ کیا جائے۔

ابو حسین نوری بغداد سے نکل کر بصرہ میں قیام پذیر ہو گئے اور حتی الامکان کوشش کی کہ اپنے آپ کو چھپائے رکھیں، تاکہ معتضد کے لیے کوئی سفارش طلب کرنے والا نہ آ جائے۔

جب معتضد نے وفات پائی تو پھر یہ بغداد واپس آ گئے۔

ابو حسین کی وفات 295ھ میں ہوئی۔(1)

---

(1) دیکھئے سیر أعلام النبلاء (76/14) مؤسسة الرسالة بیروت اور دیگر کتب تاریخ۔

خوش نصیب چرواہا

ابو محذورہ ابھی نوعمر تھا، مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ اس کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ وہ مکہ کا باسی تھا اور مکہ فتح ہو چکا تھا۔ مگر ابھی وہ اسلام کی نعمت سے محروم تھا۔ مکہ کے دیگر نوجوانوں کی طرح وہ بھی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن اپنے دوستوں کے ساتھ بکریاں چراتا ہوا ایک وادی سے گزر رہا تھا۔ ادھر اللہ کے رسول ﷺ بھی کسی جنگ میں شرکت کے لیے وہاں سے گزر رہے تھے۔ ایک وادی میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ حضرت بلال کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے اذان دینا شروع کی۔ حضرت بلال ؓ کی بلند آواز دوسری وادی میں بکریاں چراتے ہوئے ابو محذورہ نے سن لی۔ اس نے دل لگی کے طور پر اس کی نقل اتارنا شروع کر دی۔ اس کے دوسرے ساتھی خاموش اس کی آواز سن رہے تھے۔ بلال اذان دیتے رہے اور ابو محذورہ اس کی نقل اتارتے رہے، انداز میں تمسخر تھا مگر آواز غضب کی تھی۔ پھر ابو محذورہ کی قسمت جاگ گئی اس کی خوبصورت آواز کو سرور کائنات نے سماعت فرمایا، آواز اچھی لگی۔ اذان ختم ہوئی تو حضرت علی اور حضرت زبیر کو حکم دیا کہ اس اذان دینے والے کو لے کر آئیں۔ وہ پہاڑ کے پیچھے گئے نوجوانوں کو پکڑا اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر آئے۔

آپ ﷺ نے پوچھا: «مَنْ أَذَّنَ مِنْكُمْ آنِفًا» ”تم میں سے ابھی ابھی کس نے اذان دی ہے؟“

اب انہیں خجالت محسوس ہوئی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ وہ تو

تمسخرانہ طور پر اذان دے رہا تھا۔

آپ نے ایک کو فرمایا: تم اذان دو۔

اس نے اذان کہنی شروع کی تو اس کی آواز خوبصورت نہ تھی۔ اب دوسرے کو اشارہ ہوا۔ اس کی بھی آواز خوبصورت نہ تھی۔ اور اب ابومحذورہ کو اشارہ ہوا۔ اور اس کی آواز دلوں میں اترنے والی تھی۔

ارشاد ہوا: «أَنْتَ مَنْ أَذَّنَ آنِفًا؟»

”تم نے ابھی ابھی اذان دی ہے؟“۔

کہنے لگا: ہاں۔

اب آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھ کو آگے بڑھایا‘ ابومحذورہ کا عمامہ اتارا‘ اس کے سر پر دست شفقت پھیرا اور دعا فرمائی: «اللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيهِ وَاهْدِهِ إِلَى الإِسْلَامِ»

”اے اللہ! اس بچہ میں برکت دے اور اسے اسلام کی ہدایت فرما“۔

ابومحذورہ کی کیفیت کیا ہوگی اللہ کے رسول کا لمس‘ وہ مبارک ہاتھ‘ لمس کی لذت اور پھر اس کی قسمت جاگ اٹھی‘ اس نے کہا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللهِ»

اب آپ ﷺ نے ابومحذورہ کو مزید بشارت دی اور وظیفہ مقرر فرمایا:

«اِذْهَبْ مُؤَذِّنًا فِي أَهْلِ مَكَّةَ، أَنْتَ مُؤَذِّنُ أَهْلِ مَكَّةَ»

جاؤ تم مکہ والوں کے موذن مقرر کیے جاتے ہو۔ اب تم اہلِ مکہ کے موذن ہو“۔

ابومحذورہ نے کہا: اب ان بالوں کو نہیں کٹاؤں گا جن پر اللہ کے رسول ﷺ نے دست شفقت رکھا ہے۔

مکہ مکرمہ میں کم وبیش 300 سال تک ان کی اولاد بطور مؤذن اذان دیتی رہی۔

جسے اللہ رکھے!

علامہ قرطبی فرماتے ہیں: میں اندلس میں قرطبہ کے علاقے میں تھا کہ دشمن نے دیکھ لیا، وہ تعداد میں کافی تھے اور میں اکیلا، میں کسی طرح ان سے بھاگ نکلا اور چھپتا چھپاتا ایک طرف نکل گیا۔ ادھر دشمن بھی میری تلاش میں تھا، میں ایک چٹیل میدان میں تھا کہ اچانک دو گھڑ سوار مجھے تلاش کرتے ہوئے آ گئے۔ چھپنے کی کوئی جگہ نہ تھی، مجھے اور تو کچھ نہ سوجھی، میں ذرا نشیبی زمین پر بیٹھ گیا۔ سورۃ یاسین اور دوسری سورتیں پڑھنا شروع کیں۔ اچانک وہ دونوں میرے پاس سے باتیں کرتے ہوئے گزر گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ ان کا گزر میرے سامنے سے ہوا، میں اسی جگہ بیٹھا رہا۔ میرے کانوں میں ان کی گفتگو کی آواز آ رہی تھی ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:

لگتا ہے کہ وہ آدمی کوئی شیطان ہے۔ ورنہ ہمارے سامنے اس میدان میں تھا، اب نظر نہیں آ رہا۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے ان کو وقتی طور پر اندھا کر دیا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرے اور واپس بھی آئے۔ چٹیل میدان تھا، کوئی آڑ نہ تھی۔ بس رب کو بچانا منظور تھا اور اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے بچا لیا، اور یہ سچ ہے، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

فضیلت کا تقاضا

حضرت حسین بن علی بن ابی طالب ؓ اور محمد بن حنفیہ (1)[ابن ابی طالب] کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہو گیا اور اس اختلاف نے اس قدر طول پکڑا کہ دونوں نے آپس میں گفتگو تک چھوڑ دی، آنا جانا بند ہو گیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو محمد بن حنفیہ نے اپنے بھائی حسین بن علی ؓ کو یہ خط لکھا:

«أَبِي وَأَبُوكَ عَلِيٌّ، وَأُمِّي امْرَأَةٌ مِنْ بَنِي حَنِيفَةَ، وَلَا يُنْكَرُ شَرَفُهَا فِي قَوْمِهَا، وَلَكِنْ أُمُّكَ فَاطِمَةُ بِنْتُ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَأَنْتَ أَحَقُّ بِالْفَضْلِ مِنِّي، فَصِرْ إِلَيَّ حَتَّى تَرَضَّانِي».

"میرے اور آپ کے والد علی بن ابی طالب ؓ ہیں، اور میری امی جان بنو حنیفہ کی ایک خاتون تھیں، جن کی شرافت و عزت ان کی قوم میں مخفی نہیں، مگر آپ کی والدہ رسول اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ ؓ ہیں (جن کے درجہ کو میری والدہ نہیں پہنچ سکتیں)، اور آپ مجھ سے افضل ہیں۔ (اس فضیلت کا تقاضا ہے کہ) آپ میرے پاس آئیں اور مجھے راضی کریں (تاکہ ہمارے اور آپ کے تعلقات از سر نو بحال ہو سکیں)۔"

خط پڑھتے ہی حضرت حسین بن علی ؓ نے اپنی چادر سنبھالی، جوتا پہنا اور اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے پاس پہنچ کر انھیں راضی کر لیا۔ (2)

---

(1) محمد کی ماں کا نام خولہ بنت جعفر الحنفیہ ہے، جو حضرت ابو بکر صدیق ؓ کے عہد خلافت میں یمامہ کے قیدیوں میں آئی تھیں اور جن کو حضرت ابو بکر ؓ نے حضرت علی ؓ کو بطور ہبہ دیا تھا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت علی نے اسے بازارِ ذی المجاز سے خریدا تھا۔

(سیر أعلام النبلاء (110/4)

(2) تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر، دار إحیاء التراث الإسلامی (257/57)۔

سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی فراست

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دروازے پر سہیل بن عمرو، حارث بن ہشام، ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہم اور قریش کے معززین جمع ہیں اور ملاقات کے لیے بلاوے کے منتظر ہیں۔ اسی اثنا میں حضرت صہیب رومی، بلال بن رباح رضی اللہ عنہما اور بعض غلام جو بدر میں شریک تھے، ملاقات کے لیے آ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دربان کو کہہ کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو فوراً ملاقات کے لیے اندر بلوا لیا۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ اس بات سے سخت سیخ پا ہوئے کہ ان غلاموں کو تو ملاقات کے لیے فوراً اجازت مل گئی جب کہ ہمیں انتظار میں بٹھا دیا گیا ہے۔ اور ہماری طرف نظرِ التفات بھی نہیں کی گئی۔ وہ ابھی اس قسم کی گفتگو کر ہی رہے تھے کہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ جو اپنے وقت کے نہایت دانا، عاقل، سمجھ دار اور خطیب آدمی تھے۔ انہوں نے شرکاء کو مخاطب کیا اور فرمایا:

«أَيُّهَا الْقَوْمُ، إِنِّي وَاللهِ! قَدْ أَرَى الَّذِي فِي وُجُوهِكُمْ، فَإِنْ كُنْتُمْ غِضَابًا فَاغْضَبُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ».

”اے قوم! اللہ کی قسم! میں نے تمہارے چہروں پر غصے اور ناراضی کی علامتیں دیکھی ہیں۔ دیکھو! غصہ و ناراضی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر نہیں بلکہ اپنے آپ پر کرو۔“

«دُعِيَ الْقَوْمُ وَدُعِيتُمْ، فَأَسْرَعُوا وَأَبْطَأْتُمْ».

”قوم کو دعوتِ حق دی گئی اور تمہیں بھی یہ دعوت ملی تھی، ان کمزور لوگوں نے اس دعوت کو فوراً قبول کر لیا مگر تم نے تاخیر کی اور ان کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے۔“

«أَمَا وَاللهِ، لَمَا سَبَقُوكُمْ بِهِ مِنَ الْفَضْلِ أَشَدُّ عَلَيْكُمْ

فَوْتًا مِنْ بَابِكُم هَذَا ، الَّذِي تُنَافِسُونَ عَلَيْهِ» .

”جس فضیلت (ایمان) کے ذریعے یہ فقراء تم لوگوں پر سبقت کر چکے ہیں، اس کا فوت ہو جانا تمہارے اس دروازے میں پہلے داخل نہ ہونے سے زیادہ افسوس ناک ہے، جس میں داخلے کے لیے تم مقابلہ کر رہے ہو۔“

پھر فرمایا:

«أَيُّهَا الْقَوْمُ، إِنَّ هَؤُلَاءِ الْقَوْمَ قَدْ سَبَقُوكُمْ بِمَا تَرَوْنَ، وَلَا سَبِيلَ لَكُمْ - وَاللهِ - إِلَى مَا سَبَقُوكُمْ إِلَيْهِ، فَانْظُرُوا هَذَا الْجِهَادَ فَالْزَمُوهُ، عَسَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يَرْزُقَكُمْ شَهَادَةً».

”اے لوگو! یہ فقراء جس نعمت کے ذریعے تم پر سبقت کر چکے ہیں وہ تمہیں معلوم ہے، اللہ کی قسم! جس چیز کی طرف وہ تم پر سبقت لے گئے ہیں، وہاں تک تمہاری رسائی ناممکن ہے، اس لیے تم جہاد سے خود کو مربوط کرلو، ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت دے دے (اور تم بھی اعلیٰ درجات کے مستحق بن سکو)۔“

یہ کہہ کر حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اپنے کپڑے جھاڑے اور چل دیے۔ (1)

---

(1) الاستيعاب (231/2) ، أسد الغابة (586/2)، العقد الثمين (252/4)۔

انداز اپنا اپنا

ایک بادشاہ نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا جس سے وہ خاصا پریشان ہوا۔ اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا کہ ملک بھر سے خوابوں کی تعبیر بتانے والوں کو بلوایا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ آناً فاناً ملک کے مشہور ومعروف تعبیر کرنے والے اکٹھے ہوگئے۔ یہ سب کے سب تعبیر بتانے کے ماہر تھے۔ بادشاہ نے ان کے سامنے اپنا خواب بیان کیا: ”میں بالکل صحیح سالم اپنے اقتدار پر براجمان ہوں، اچانک میرے دانت یکے بعد دیگرے گرنے شروع ہوگئے حتی کہ میرے منہ میں کوئی بھی دانت باقی نہیں رہا۔“

جب معبّرین (خواب کی تعبیر بتانے والوں) کے سامنے یہ خواب بیان ہوا تو اکثر وبیشتر نے بادشاہ کے خواب کی کوئی نہ کوئی تعبیر بیان کی تاکہ بادشاہ کی پریشانی دور ہوجائے۔ تمام نے اس کو تسلی دی مگر ان کی تعبیر بادشاہ کے دل کو نہ لگی۔ انھی معبّرین میں سے دو آدمی ایک گوشے میں خاموش بیٹھے تھے۔ بادشاہ دیکھ رہا تھا کہ انھوں نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا۔

بادشاہ نے ان کو مخاطب کرکے کہا: سب لوگوں نے تعبیر بیان کی ہے تم کیوں نہیں بولے؟ تم بھی اس خواب کی تعبیر بیان کرو۔

ان میں سے پہلا کہنے لگا: جناب! مجھے اس خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے نہایت افسوس ہورہا ہے، مگر کیا کیا جائے حق تو بیان کرنا ہی پڑتا ہے۔

بادشاہ نے کہا: ہاں ہاں! ضرور بتاؤ، کیا تعبیر ہے؟

جناب بادشاہ سلامت! آپ کی تمام اولاد آپ کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے وفات پا جائے گی، یقیناً آپ کو اس سے نہایت غم اور رنج ہوگا جس سے آپ بھی وفات پا جائیں گے۔

جب بادشاہ نے یہ تعبیر سنی تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی، اس کو نہایت صدمہ ہوا، اس کی آنکھیں غصے سے لال پیلی ہونے لگیں، سخت پریشانی کے عالم میں وہ حواس باختہ ہو کر چیخا: اس معبرّ کو میری آنکھوں کے سامنے سے لے جاؤ اور اس کو جیل میں ڈال دو۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے قدرے سکون ہوا، اس نے دوسرے معبّر کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: تم بتاؤ تمہارے نزدیک میرے خواب کی تعبیر کیا ہے؟

”جناب بادشاہ سلامت! آپ نہایت لمبی عمر پائیں گے۔ اپنے خاندان کے تمام افراد سے لمبی عمر......... اور آپ کے خاندان کا ہر فرد یہ خواہش اور تمنا رکھتا ہے کہ آپ اُن سب سے زیادہ لمبی عمر پائیں۔“ (اس تعبیر کا بھی مفہوم وہی ہے جو پہلے معبّر نے بتائی تھی۔ یعنی خاندان کے سارے افراد سے زیادہ عمر بادشاہ کو نصیب ہوگی اور بقیہ سارے لوگ اس کی آنکھوں کے سامنے مرجائیں گے)۔

بادشاہ نے سنا تو اس کی تمام تر پریشانیاں دور ہوگئیں، چنانچہ اس نے وزیر کو حکم دیا کہ اس کو شاہی جوڑے اور انعام واکرام سے نوازا جائے۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے غور کریں تو دونوں معبّرین کے کلام میں کوئی فرق نہیں۔ مگر آدمی کی ذہانت اور دانائی اس کو بہت سارے مسائل سے نجات دلاتی ہے۔

وہ پھر بھی مشتعل نہیں ہوا

احنف بن قیس اپنی بردباری اور حوصلے میں نہایت مشہور تھا۔ اس کو کبھی غصہ نہیں آیا۔ عربوں میں اس کی یہ صفت مشہور ومعروف تھی۔ ایک دن اس کے کچھ دوست اکٹھے ہوئے اور ان میں شرط لگ گئی کہ اس کو لازماً غصہ دلایا جائے۔ انھوں نے ایک نوجوان کو تیار کیا، وہ احنف کے گھر گیا۔

احنف نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟

نوجوان کہنے لگا: میں ایک کام سے آیا ہوں۔

احنف: بتاؤ کیا کام ہے؟

نوجوان: دراصل میں تمہاری ماں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں شادی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔

احنف نے اپنا سر اٹھایا اور نہایت اطمینان سے بولا: تمہارا حسب ونسب نہایت معزز اور بہترین ہے اور ہمیں تمہارے ساتھ سسرالی رشتہ جوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ میری والدہ کی عمر بہت زیادہ ہو چکی ہے۔ وہ اب کم وبیش ستر سال کی ہے اور تم ایک خوبصورت نوجوان ہو۔ تمہیں تو ایک ایسی عورت چاہیے جو تمہاری ہم عمر ہو، محبت کرنے اور کروانے والی ہو، تمہارے بچوں کی ماں بن سکے اور تمہاری نسل بڑھا سکے۔

پھر نوجوان سے کہا: جن لوگوں نے تمہیں میرے پاس بھیجا ہے ان کو بتا دو کہ تم مجھے مشتعل نہیں کر سکے۔

پسند کی احادیث

امام سفیان بن عیینہ اپنے دور کے مشہور محدث تھے۔ ایک اعرابی ان کی خدمت میں طویل مدت تک رہا۔ وہ ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوتا اور احادیث سنتا، جب وہ ان کے پاس سے رخصت ہو کر اپنے وطن کو جانے لگا تو امام سفیان نے اس سے پوچھا: تم اتنی مدت تک میرے حلقے میں رہے، بتاؤ:

«مَا أَعْجَبَكَ مِنْ حَدِيثِي يَا أَعْرَابِيُّ!».

”اعرابی! میری بیان کردہ احادیث میں سے تمھیں کون کون سی احادیث پسند آئیں؟“

اعرابی کہنے لگا: صرف تین احادیث۔

پوچھا: کون کون سی؟

اعرابی نے جواب دیا: پہلی حدیث جس کی راویہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں، یہ ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ الْحَلْوَاءَ وَالْعَسَلَ».

”نبی کریم ﷺ کو حلوہ اور شہد پسند تھا۔“(1)

دوسری حدیث یہ ہے:

«إِذَا وُضِعَ الْعَشَاءُ وَأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَابْدَأُوا بِالْعَشَاءِ».

”جب رات کا کھانا لگ جائے اور نماز کا وقت ہو تو پہلے کھانا کھاؤ۔“(2)

تیسری حدیث یہ ہے:

«لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ».

”سفر کی حالت میں (مشقت اٹھا کر) روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔“(3)

---

(1) بخاری (5599)، مسلم (1474)۔ (2) بخاری (671)، مسلم (558)۔

(3) بخاری (1946)، مسلم (1115)۔

دربان اور حکمران

امام راغب اصبہانی اپنی کتاب ”محاضرات الأدباء“ میں بیان کرتے ہیں کہ میمون بن مہران عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں باہر سے آواز سنائی دی۔ حضرت عمر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دربان سے کہا: دیکھو دروازے پر کون ہے؟ جواب ملا کہ جس شخص نے ابھی ابھی اپنا اونٹ بٹھایا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مؤذنِ رسول اللہ ﷺ کا بیٹا ہے۔ حکم ہوا کہ اسے اندر بلایا جائے۔ جب وہ اندر آئے تو فرمائش کی گئی کہ حدیثِ رسول ﷺ بیان کریں۔

ابن بلال نے عرض کیا: مجھ سے میرے والد گرامی نے بیان کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

«مَنْ وَلِيَ مِنْ أُمُورِ النَّاسِ شَيْئًا فَاحْتَجَبَ، حَجَبَهُ اللهُ يَومَ الْقِيَامَةِ».(1)

”جو شخص لوگوں کے کسی معاملے کا نگراں ہو، اور وہ خود کو ان سے چھپالے تو اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس سے پردے میں ہو جائیں گے (یعنی ایسے شخص کو دیدارِ الٰہی نصیب نہ ہوگا)۔“

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت اپنے دربان سے فرمایا: آج سے ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے، اپنے گھر چلے جاؤ۔ اس کے بعد ان کے دروازے پر کوئی دربان نہیں دیکھا گیا۔

دراصل حاکم کے دربان مقرر کر لینے سے بڑھ کر مملکت کو تباہ کرنے والی اور

---

(1) التلخیص الحبیر (346/4)، ابوداود (2948)، ترمذی (1332)، احمد (231/4)۔

رعایا کو ہلاک کرنے والی کوئی دوسری شے نہیں۔ دربانوں کی موجودگی کے باعث رعایا پر حکمران اور حکومتی کارکنوں کا بے پناہ رعب طاری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب حکام کو عام آدمی کی حکمرانوں تک رسائی آسان ہونے کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ ظلم سے رک جاتے ہیں۔ مگر جب ان کو یہ پتا چلتا ہے کہ اُن تک عام لوگوں کی رسائی ناممکن یہ تو پھر وہ خوب ظلم کرتے ہیں۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ حاکم عام لوگوں سے دو اسباب کی بناء پر چھپتا ہے ایک تو اس کے ذاتی کردار کی کمزوری اور دوسرا بخل۔

چاہ کن را چاہ در پیش

ایک شخص کسی بادشاہ کا مقرب اور وفادار تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی اہم تھا۔ وہ جب بھی بادشاہ کی محفل میں بیٹھتا تو عموماً یہ ضرب المثل بیان کرتا:

«أَحْسِنْ إِلَى الْمُحْسِنِ بِإِحْسَانِهِ، فَإِنَّ الْمُسِيءَ سَيَكْفِيكَهُ إِسَاءَتُهُ».

”اپنے محسن کے ساتھ اس کے احسان کی وجہ سے اچھا سلوک کرو۔ رہا برائی کرنے والا تو اس کی برائی ہی اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔“

درباریوں میں ایک شخص کو اس کے ساتھ بیر تھا۔ خواہ مخواہ کا حسد۔ اس کی پوری خواہش تھی کہ یہ بادشاہ کا مقرب نہ رہے اور کسی طرح اسے بادشاہ سے بدظن کر دیا جائے۔ اس نے کئی کوششیں کیں مگر ناکام رہا، چنانچہ اس نے ایک چال چلی، ایک مرتبہ موقع پا کر اس نے بادشاہ کو بتایا: یہ شخص آپ کے سب سے زیادہ قریب ہے، آپ کے جوتے تک اٹھاتا ہے حالانکہ حقیقت میں یہ آپ کا دشمن ہے۔ آپ سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس کا کہنا ہے کہ آپ کے منہ سے نہایت گندی بدبو آتی ہے۔

بادشاہ بولا: تمہارے اس الزام کا ثبوت کیا ہے اور اس الزام کی تصدیق کیسے ہوگی؟

حاسد بولا: آپ اس شخص کو شام کے وقت بلوائیں اور اپنے قریب کریں۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے کہ وہ فوراً اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لے گا تاکہ آپ کی بدبو نہ سونگھ سکے۔

بادشاہ نے کہا: تم جاؤ، ہم خود اس کی تصدیق کریں گے۔

وہ حاسد بادشاہ کی مجلس سے نکل کر سیدھا اس آدمی کے پاس گیا اور اسے کھانے کی دعوت دی۔ اس شخص کو حاسد کے حسد اور چال کا قطعاً علم نہ تھا۔ وہ تو اسے دوست ہی سمجھتا تھا اور یوں بھی اس کے تعلقات سب کے ساتھ اچھے تھے۔

حاسد نے اسے کھانا کھلایا جس میں لہسن شامل تھا۔

کھانے کے بعد وہ بادشاہ کے دربار میں جا پہنچا، بادشاہ چلنے لگا تو اس نے اس کے جوتے پکڑ لیے اور ساتھ ہی اپنی عادت کے مطابق بولا:

«أَحْسِنْ إِلَى الْمُحْسِنِ بِإِحْسَانِهِ، فَإِنَّ الْمُسِيءَ سَيَكْفِيكَهُ إِسَاءَتُهُ».

”اپنے محسن کے ساتھ اس کے احسان کی وجہ سے اچھا سلوک کرو۔ رہا برائی کرنے والا تو اس کی برائی ہی اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔“

بادشاہ نے اس سے کہا: ذرا میرے قریب آؤ۔ جب وہ بادشاہ کے قریب ہوا تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، مبادا بادشاہ اس کے منہ سے لہسن کی بدبو نہ سونگھ لے۔

بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ میرے درباری نے بلاشبہ اس کے بارے میں درست ہی بیان دیا تھا۔

اس واقعہ کے راوی بکر بن عبداللہ المزنی بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزا اور سزا لکھتا تھا۔ جب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ شخص میرا مخلص نہیں بلکہ اندر سے میرا مخالف ہے تو اس نے ایک تحریر اپنے چیف سکریٹری کو لکھی جس کا مضمون یہ تھا:

”جب اس تحریر کا حامل تمہارے پاس آئے تو اس کو قتل کرنے کے بعد اس کی کھال اتار دو اور اس میں بھس بھر کر میرے پاس بھجوا دو۔“

بادشاہ نے اس شخص کو یہ خط دیا اور کہا: اسے چیف سکریٹری کے پاس لے جاؤ۔

وہ اس سر بمہر خط کو لے کر دربار سے باہر آیا تو اس کو وہی حاسد ملا۔

حاسد نے اس خط کو دیکھا تو پوچھا: ارے! یہ تمہارے پاس کیسا خط ہے؟ ذرا مجھے دکھاؤ۔

اس نے کہا: بادشاہ نے مجھے صلے کے طور پر یہ انعام دیا ہے۔ اس حاسد نے اصرار کیا: خط مجھے دے دو۔ اس شخص نے کہا: یہ رہا خط۔ یہ تمہارا ہو گیا۔ اس نے خط لیا اور خوشی خوشی چیف سکریٹری کے پاس جا پہنچا۔ اس نے خط کو کھولا تو کہنے لگا: اس خط میں لکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر کے اس کی کھال اتار کر بادشاہ کے پاس بھجواؤں۔

وہ حاسد بولا: نہیں نہیں یہ خط میرے لیے نہیں ہے۔ بلکہ میرے فلاں دوست کا ہے۔ غلطی سے میں نے لے لیا ہے۔

چیف سکریٹری بولا: دیکھو! اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ خط میں واضح طور پر ہدایات ہیں کہ جو بھی اس کا حامل ہے، اس کو قتل کر کے اس کی کھال میں بھس بھر دو۔ اس نے بڑا واویلا کیا کہ ایک مرتبہ مجھے بادشاہ کے پاس جانے کا موقع دو۔ یہ میرے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے۔

چیف سکریٹری بولا: اس خط کے حصول کے بعد تمہارے پاس واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے اور اب موت تمہارا مقدر ہے۔

چنانچہ چیف سکریٹری نے اس کو قتل کروایا اور حسب ہدایت اس کی لاش بادشاہ کے پاس بھجوادی۔ وہ شخص جو بادشاہ کا مقرب تھا، اپنی عادت کے مطابق دربار میں پہنچا اور اتفاق سے اپنی عادت کے مطابق اس نے وہ ضرب المثل بادشاہ کے سامنے دہرادی۔

بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے پوچھا: میرے خط کا کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا: جب میں آپ کا خط لے کر نکلا تو مجھے فلاں شخص ملا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ یہ خط اس کو دے دوں؛ چنانچہ میں نے خط اس کو بخش دیا۔

بادشاہ نے اس سے کہا: اس شخص نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم میرے بارے میں کہتے ہو کہ میرے منہ سے بدبو آتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

اس نے کہا: حاشا وکلا، میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں کی۔

بادشاہ نے کہا: اچھا یہ بتاؤ، کل جب میں نے تمہیں بلایا تھا تو تم نے اپنے منہ پر ہاتھ کیوں رکھ لیا تھا؟

وہ کہنے لگا: بادشاہ سلامت! اس شخص نے مجھے کھانے کی دعوت دی جس میں مجھے خوب لہسن کھلایا، میں نے ہاتھ اس لیے منہ پر رکھا تھا کہ کہیں آپ کو اس ناگوار بو سے تکلیف نہ ہو۔

بادشاہ کہنے لگا: تم سچ اور درست کہتے ہو۔ اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے جاؤ۔ تمہارا قول درست تھا کہ ”برائی کرنے والا اپنے کرتوت کا مزہ از خود چکھ لیتا ہے۔“

اسی کو کہتے ہیں: ”چاہ کن را چاہ درپیش“

یعنی کنواں کھودنے والا خود ہی اس میں جا گرتا ہے۔ (1)

---

(1) غرائب الأخبار، احمد عیسی عاشور۔

زیادہ سخی کون؟

ہیثم بن عدی کہتے ہیں کہ تین افراد کا بیت اللہ میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ اس دور کا سب سے بڑا سخی کون ہے؟ ایک نے کہا: عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما ہیں۔ دوسرا بولا: قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ تیسرا بولا: نہیں، عَرابہ اَوسی رضی اللہ عنہ ہیں گفتگو نے طول کھینچا' ہر ایک اپنے اپنے حق میں دلائل دے رہا تھا؛ حتی کہ آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ کچھ لوگ بھی اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے ایک شخص بولا: بھائیو! کیوں لڑائی کرتے ہو؟ ایسا کرو کہ ہر شخص اپنے اپنے پسندیدہ شخص کے پاس چلا جائے، اس سے کچھ مانگے اور جو کچھ ملے، وہ آ کر یہاں بتا دے، پھر اس بات کا جائزہ لے لیتے ہیں کہ بڑا سخی کون ہے؟

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کا عقیدت مند اُن کے گھر گیا اور ان سے کہا: اللہ کے رسول ﷺ کے بھتیجے! میں مسافر ہوں اور زادِ راہ ختم ہے، مدد کا طلب گار ہوں۔

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما اس وقت گھوڑے پر سوار کہیں جانے کے لئے تیار تھے۔ اسی وقت گھوڑے سے نیچے اترے اور فرمایا: گھوڑے کی رکاب پر پاؤں رکھو اور اس پر سوار ہو جاؤ، اب یہ تمہارا ہے، اس کے ساتھ ایک تھیلا بھی ہے، اس میں جو کچھ ہے وہ بھی تمہارا ہے اور ہاں، اس میں ایک تلوار بھی ہے، اس کو معمولی نہ سمجھنا، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تلوار ہے۔

جب وہ خوبصورت سا گھوڑا لے کر اپنے دوستوں کے پاس واپس آیا اور تھیلا کھولا تو اس میں چار ہزار دینار اور ریشمی چادریں تھیں، اور ان سب پر مستزاد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار تھی۔

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا عقیدت مند جب ان کے گھر گیا تو وہ سوئے ہوئے تھے۔ لونڈی نے پوچھا: تمہاری ضرورت کیا ہے؟

اس نے کہا: مسافر ہوں اور زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔

لونڈی نے کہا: تمہاری اس معمولی حاجت کے لیے آقا کو اٹھانا اچھی بات نہیں۔ یہ تھیلی پکڑو اس میں سات سو دینار ہیں، اس وقت قیس کے گھر میں یہی کچھ موجود ہے۔ گھر کے ساتھ ہی حویلی میں اونٹ بندھے ہوئے ہیں۔ اپنی مرضی کا اونٹ پسند کر لو اور ایک غلام کو اپنی خدمت کے لیے لے کر سفر پر روانہ ہو جاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد قیس رضی اللہ عنہ بھی اٹھ بیٹھے۔ لونڈی نے ان سے قصہ بیان کیا۔ کہنے لگے: بہتر تھا مجھے اٹھا لیتی اور میں خود اس کی حاجت پوری کرتا، نہ معلوم جو کچھ تم نے اسے دیا ہے، اس کی ضرورت کے مطابق ہے یا نہیں۔ تاہم تم نے جو اچھا کام کیا ہے اس کے بدلے میں تم کو آزاد کرتا ہوں۔

ادھر عرابہ اَوسی رضی اللہ عنہ کا عقیدت مند بھی ان کے گھر جا پہنچا۔ اس وقت نماز کا وقت ہو چکا تھا، عرابہ رضی اللہ عنہ بوڑھے تھے اور نابینا ہو چکے تھے، نماز کے لیے گھر سے نکل رہے تھے، دو غلاموں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد کی طرف رخ کیے ہوئے تھے۔ اس آدمی نے کہا: اے عرابہ! میری بات سنیں گے؟

عرابہ رضی اللہ عنہ بولے: بولو کیا کہتے ہو؟

کہنے لگا: میں مسافر ہوں اور میرا زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔

عرابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں ہاتھ غلاموں کے کندھوں سے ہٹائے اور بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر زور سے مارا، اور کہنے لگے: عرابہ نے اپنا تمام مال و دولت خرچ کر دیا ہے، مگر یہ دو غلام باقی ہیں۔ تم ان دونوں کو لے جاؤ، اب یہ تمہارے ہو گئے۔

اس آدمی نے کہا: حضرت! ایسے کیسے ہو سکتا ہے، آپ خود سخت ضرورت مند ہیں، میں ان کو نہیں لوں گا۔

عرابہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: سنو! اب یہ تمہارے ہیں اور اگر تم نہیں لیتے تو بھی ان دونوں کو آزاد کرتا ہوں، اگر تم چاہو تو لے لو چاہو تو انکار کر دو۔ یہ کہنے کے بعد آگے بڑھے، دیوار کا سہارا لیا اور اسے ٹٹولتے ہوئے مسجد کی طرف چل دیے۔

اس شخص نے ان دونوں غلاموں کو ہمراہ لیا اور اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آ گیا۔

تینوں دوست پھر سے اکٹھے ہوئے، ہر ایک نے اپنے عطیے اور سلوک کا ذکر کیا اور ان تینوں کی تعریف کی۔ بلاشبہ یہ تینوں بہت سخی ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں۔

اب رہا یہ فیصلہ کہ سب سے بڑا سخی کون ہے؟ تو فیصلہ عَرابہ اَوسی رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا، کیوں کہ انھوں نے تنگ دستی کے باوجود جو پایا خرچ کر دیا۔ (1)

---

(1) البداية والنهاية (11/356-357) دار هجر، تاريخ دمشق لابن عساكر (14/458)۔

ہر مصیبت کا علاج

تین افراد حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے پاس آئے۔ ایک نے بارش کی قلت کی شکایت کی کہ کافی عرصہ سے بارش نازل نہیں ہوئی۔

آپ نے فرمایا: «أَكْثِرْ مِنَ الاِسْتِغْفَارِ» .

”کثرت سے توبہ واستغفار کرو۔“

دوسرے نے کہا: میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی، میں اولاد کا خواہشمند ہوں۔

فرمایا: کثرت سے استغفار کرو۔

تیسرے شخص نے شکوہ کیا: زمین میں قحط پڑ گیا، غلہ پیدا نہیں ہوتا، یا بہت کم ہوتا ہے۔ اس سے بھی فرمایا: کثرت سے توبہ واستغفار کرو۔

آپ کے پاس جو لوگ بیٹھے تھے، عرض گزار ہوئے: نواسۂ رسول ﷺ! تینوں افراد مختلف شکایات لے کر آئے، مگر آپ نے ایک ہی جواب دیا؟

فرمایا: کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں پڑھا ہے؟

﴿ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ إِنَّهُۥ كَانَ غَفَّارًا ۝١٠ يُرْسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا ۝١١ وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّٰتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَٰرًا ۝١٢﴾.

”اپنے رب سے اپنے گناہ بخشواؤ (اور معافی مانگو)، وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان کو خوب برساتا ہوا چھوڑ دے گا اور تمہیں خوب مال واولاد میں ترقی دے گا، اور تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لئے نہریں نکالے گا۔“ (1)

---

(1) نوح: 10-12

ایثار کی عمدہ مثال

مسلم بن سعد کہتے ہیں: میں حج کے لیے جانے لگا تو میرے ماموں نے مجھے دس ہزار درہم دیے اور کہا کہ جب تم مدینہ منورہ جاؤ تو مدینے میں اہل بیت میں سب سے زیادہ فقیر گھرانے کا پتا لگا کر یہ رقم اس کو ادا کر دینا۔

جب وہ مدینہ منورہ پہنچے تو لوگوں سے پوچھا: اہلِ بیت میں سب سے مفلس اور فقیر گھرانا کون سا ہے؟

لوگوں نے ایک گھر کے بارے میں بتایا کہ وہ ان کی نظر میں نہایت مستحق گھرانا ہے اور وہ اہلِ بیت میں سے ہیں۔

مسلم بن سعد نے اس گھر کے دروازے پر دستک دی، اندر سے ایک خاتون کی آواز آئی: تم کون ہو؟

مسلم بن سعد: میں بغداد سے آیا ہوں، میرے پاس بطورِ امانت دس ہزار درہم ہیں، مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں مدینہ منورہ کے اہل بیت میں سب سے زیادہ مستحق گھرانے تک یہ امانت پہنچا دوں۔ لوگوں نے میرے استفسار پر آپ کا گھر بتایا ہے، لہٰذا یہ رقم میں آپ کے حوالے کرتا ہوں۔

وہ عورت کہنے لگی: اے اللہ کے بندے! یہ درہم دینے والے نے شرط لگائی تھی کہ سب سے زیادہ محتاج اہلِ بیت کو یہ رقم دینا تو دراصل بات یہ ہے کہ یہ جو ہمارے ہمسائے ہیں، ہم سے زیادہ محتاج اور فقیر ہیں۔ یہ درہم ان کو دے دو، وہ ہم سے زیادہ مستحق ہیں۔

مسلم بن سعد کہتے ہیں: جب میں نے ان کے ہمسائے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک عورت نے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میں نے اسے پورا قصہ بتایا کہ تمہاری ہمسایہ خاتون نے تمہارے گھر کا پتا دیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ گھرانا اس سے زیادہ محتاج اور مستحق ہے۔

وہ عورت کہنے لگی: اے اللہ کے بندے! دراصل ہم اور ہمارے ہمسائے دونوں ہی نہایت محتاج اور فقیر اور دونوں ہی حاجت مند ہیں۔ تم ایسا کرو کہ اس رقم کو ہم دونوں کے درمیان برابر تقسیم کر دو۔

ایک دوسرے کے بھائی

عمر فاروقؓ نے اپنے غلام کو چار ہزار یا چار سو دینار دیے اور کہا کہ اسے ابوعبیدہ بن جراحؓ(1) کو دے آؤ اور ہاں تھوڑی دیر انتظار کرنا اور دیکھنا کہ وہ ان دیناروں کو کہاں خرچ کرتے ہیں۔

غلام نے دینار پکڑے اور ابوعبیدہؓ کے پاس آیا، سلام پیش کیا اور کہا: یہ دینار امیر المومنین نے آپ کو ارسال کیے ہیں اور کہا ہے کہ اپنے مصرف میں لائیں۔ ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو دعائیں دیں کہ اللہ ان کو اپنی رحمت اور تندرستی سے نوازے، پھر اپنی لونڈی کو بلا کر فرمایا: یہ سات دینار فلاں کو دے آؤ، یہ پانچ فلاں کے گھر دے دینا، یہ دس دینار فلاں شخص کے لیے اور یہ بیس فلاں

---

(1) یہ جلیل القدر صحابی عامر بن عبد اللہ بن جراح بن ہلال قرشی فہری ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے جنگِ بدر و احد اور دیگر تمام غزوات میں نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ شرکت فرمائی اور حبشہ کی طرف دوسری ہجرت کی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے ان کی شان میں فرمایا تھا:

«لِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينٌ وَأَمِينُ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ».

”ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت (محمدیہ) کا امین ابوعبیدہ بن جراح ہے۔“

(بخاری: 4382)

جس زمانے میں یہ ملک شام کے امیر تھے اور حضرت عمرؓ وہاں تشریف لے گئے تو ان کی خستہ حالی کو دیکھ کر امیر المؤمنین نے فرمایا:

«كُلُّنَا غَيَّرَتْهُ الدُّنْيَا ، غَيْرَكَ يَا أَبَا عُبَيْدَةَ».

”دنیا نے ہم سب کی حالت کو بدل کر رکھ دیا ہے، اے ابوعبیدہ! صرف آپ ہی اس سے محفوظ ہیں۔“

ان کی وفات طاعون کی بیماری سے عمواس میں 18ھ میں ہوئی اور نماز جنازہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے پڑھائی۔

گھرانے کے لیے ہیں، حتی کہ وہیں کھڑے کھڑے ساری رقم بانٹ دی۔

غلام واپس آیا اور جو منظر دیکھا تھا، اس کی تفصیل سے عمر رضی اللہ عنہ کو آگاہ کیا۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اتنے ہی دینار معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ (1) کو بھجوائے اور غلام کو وہی ہدایات دیں جو ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے لیے دی تھیں۔ غلام ان کے پاس دینار لے کر آیا، سلام پیش کیا اور دیناروں کی تھیلی سامنے رکھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو ہدیہ بھیجا ہے۔ انھوں نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دعائیں دی کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، ان کے مال وجان میں اضافہ فرمائے۔ اور پھر اپنی لونڈی کو بلایا کہ فلاں گھر کو پانچ دے دو، فلاں کو دس، فلاں گھرانے کو بیس، اس طرح ہدایات دیتے گئے اور تھیلی خالی ہوتی گئی۔ اتنے میں ان کی اہلیہ آئی اور آکر کہنے لگی

---

(1) یہ جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل بن عمرو بن اَوس انصاری خزرجی ہیں۔ یہ ان ستر انصاری صحابہ میں شامل تھے جنھوں نے بیعت عقبہ میں شرکت کی تھی۔ جنگ بدر اور احد کے علاوہ نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے۔ اسلام لانے کے وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی، ان کا شمار اپنی قوم کے خوبصورت نوجوانوں میں ہوتا تھا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے انھیں یمن کا امیر بنا کر بھیجا تھا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "صحابہ کرام میں حلال وحرام کے بارے میں سب سے زیادہ حضرت معاذ کو علم ہے۔" (ابن ماجہ (154)، احمد (281/3))

عہدِ نبوی میں قرآن جمع کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

«عَجِزَتِ النِّسَاءُ أَنْ يَلِدْنَ مِثْلَ مُعَاذٍ؛ وَلَوْلَا مُعَاذٌ لَهَلَكَ عُمَرُ».

"عورتیں معاذ جیسا بیٹا جننے سے عاجز ہوگئیں، اگر معاذ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے مناقب وفضائل بہت ہیں۔ ان کی وفات بھی طاعون کی بیماری سے عمواس میں 18ھ میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر 38 سال تھی۔

کہ ہم بھی تو مساکین ہیں، کچھ ہمیں بھی عطا ہو۔ اس وقت تھیلی میں محض دو دینار باقی رہ گئے تھے وہ اپنی بیوی کو ادا کر دیے۔ غلام واپس آیا اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو واقعہ سنایا، وہ نہایت خوش ہوئے اور فرمایا:

«إِنَّهُم إِخْوَةٌ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ».

”یہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہ (نیکی اور بھلائی میں) سب ایک جیسے ہیں۔“(1)

«رضوان الله عليهم أجمعين»

---

(1) طبقات ابن سعد (301/1/3)، سیر أعلام النبلاء (456/1)۔

میں دجال نہیں!

مغیرہ بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام بڑے نامور مجاہد اور سخی تھے۔ جب مسلمہ بن عبدالملک نے سرزمین روم میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو یہ اس لڑائی میں شامل تھے۔ اس لڑائی میں ان کی آنکھ زخمی ہوگئی جس کے سبب بینائی جاتی رہی۔ یہ جس بستی میں جاتے، وہاں اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھانا کھلاتے۔

ایک مرتبہ ان کا دسترخوان لگا ہوا تھا۔ ایک بدو بھی مہمانوں میں شامل تھا۔ وہ کھانے کی بجائے مسلسل مغیرہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

مغیرہ اس سے کہنے لگے:

«أَلَا تَأْكُلُ مِنْ هَذَا الطَّعَامِ؟ مَالِي أَرَاكَ تُدِيمُ النَّظَرَ إِلَيَّ».

”تم کھانا کیوں نہیں کھاتے، میں دیکھ رہا ہوں کہ ٹکٹکی باندھے میری ہی جانب دیکھے جا رہے ہو؟“

بدو نے کہا: تمہارا دسترخوان بڑا وسیع ہے اور کھانا بھی لذیذ ہے۔ مگر میں تمہاری آنکھ کی وجہ سے شک میں پڑ گیا ہوں۔

کہنے لگے: تمہیں کیا شک پڑ گیا ہے۔ بدو بولا: تم کانے ہو اور لوگوں کو کھانا کھلا رہے ہو۔ میں نے ایک مسجد کے خطیب سے سن رکھا ہے کہ یہ دجال کی نشانی ہے۔

مغیرہ بے اختیار ہنس دیے اور کہا: بھئی! اطمینان سے کھانا تناول کرو، میں دجال نہیں! دجال کی آنکھ جہاد فی سبیل اللہ میں ضائع نہیں ہوگی۔ (1)

---

(1) دیکھئے: تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر (8846)۔

ناکام سازش

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بحرین کے علاقے پر گورنر مقرر کیا تھا۔ یہ چونکہ اپنی سختی میں مشہور تھے، اس لیے بحرین کے لوگوں نے نہ انھیں قبول کیا اور نہ ہی وہ ان سے راضی تھے۔ سوچ بچار شروع ہوئی کہ ان کو کیسے گورنری سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ مشورہ ہوا کہ ان کی کوئی شکایت کی جائے۔ اب کیا شکایت ہو؟

اگر شکایت کا ثبوت نہ ہوا تو دوبارہ ان ہی کو گورنر مقرر کر دیا جائے گا۔

کافی غور خوض کے بعد وہاں کے ایک سردار نے کہا: ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے، اگر اسے استعمال کر لو تو کبھی بھی ان کو دوبارہ گورنر بنا کر اس علاقہ میں نہیں بھیجا جائے گا۔

لوگوں نے کہا: بتاؤ! کیا ترکیب ہے؟

سردار نے کہا: میرے پاس ایک لاکھ درہم جمع کرو۔ میں یہ لے کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ مغیرہ نے بیت المال سے یہ رقم چرا کر میرے پاس رکھوائی ہے۔ اس طرح ان پر چوری کا الزام لگے گا اور ان کو گورنری سے ہٹا دیا جائے گا، اور دوبارہ واپس بھی نہ آئیں گے۔

مخالفین نے ایک لاکھ درہم اکٹھے کر کے سردار کے پاس جمع کرا دیے اور وہ یہ درہم لے کر مدینے آ گیا۔

سردار نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملاقات کر کے عرض کیا: امیر المومنین! آپ کے گورنر نے یہ ایک لاکھ درہم بیت المال سے نکال کر مجھے دیے ہیں کہ اپنے پاس رکھوں، اس طرح وہ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ کو بلوا لیا اور ان سے پوچھا: یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اوراس کا جواب تمہارے پاس کیا ہے؟

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

«كَذَبَ - أَصْلَحَكَ اللهُ - إِنَّمَا كَانَتْ مِائَتَيْ أَلْفٍ».

”اللہ آپ کو صحیح سالم رکھے، یہ شخص جھوٹا ہے، ایک لاکھ نہیں بلکہ دو لاکھ درہم میں نے اسے دے رکھے تھے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مغیرہ! تم نے ایسا کیوں کیا؟

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: اہل وعیال اور ذاتی ضروریات کے لئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سردار سے پوچھا: اب تم کیا کہتے ہو؟ یہ تو دو لاکھ تھے، تم ایک لاکھ کی بات کر رہے ہو، دوسرا لاکھ کدھر ہے؟

وہ نادم اور شرمندہ ہو کر کہنے لگا: اللہ آپ کا بھلا کرے! مغیرہ نے اصل میں مجھے کوئی مال نہیں دیا تھا، نہ تھوڑا نہ زیادہ۔ دراصل یہ تو ان کے خلاف ایک سازش تیار کی گئی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: تم کیا کہتے ہو اور تم نے ایسا کیوں کہا کہ یہ دو لاکھ تھے؟

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

«الْخَبِيثُ كَذَبَ عَلَيَّ، فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُخْزِيَهُ».

”اس خبیث نے میرے اوپر جھوٹ باندھا، اس لئے میں نے چاہا کہ اس کو رسوا کروں۔ ورنہ میں نے کوئی رقم کسی کو نہیں دی تھی۔“ (1)

---

(1) دیکھئے: سیر أعلام النبلاء (27/3)، تاریخ ابن عساکر (38/18)۔

اعرابی کی حاضر جوابی

ایک اعرابی پر حاسدین نے الزام لگایا کہ اس نے حاکمِ شہر کے بارے میں کسی مجلس میں نازیبا گفتگو کی ہے۔ چنانچہ اسے حاکم کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اعرابی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے حاسدین نے اسے ناحق کیس میں پھنسایا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اسے قید کی سزا مل جائے، تاکہ ان کو اپنی من مانیاں کرنے کا موقع مل جائے۔ اس نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنا مقدمہ لکھا، تفصیل سے اپنی برارت کا ذکر کیا کہ کس طرح اس کے مخالف گروپ نے اس کے خلاف سازش تیار کی ہے اور یہ سارا مقدمہ محض الزامات پر مبنی ہے، حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔

اعرابی جب حاکم کی مجلس میں داخل ہوا تو اس نے حاضرین کے چہروں کی طرف دیکھا، سارے ہی اسے اپنے مخالف گروہ کے نظر آئے۔ اس نے اپنی جیب سے وہ خط جو کتاب کی صورت میں تھا' نکالا اور حاکم کو مخاطب ہو کر کہا:

﴿هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ١٩﴾

"یہ لو! میرا اعمال نامہ پڑھو۔"

حاکم پہلے سے ناراض بیٹھا تھا، اس نے خط کو پڑھے بغیر ہی اسے واپس کر دیا اور کہنے لگا کہ یہ کلمہ قیامت کے دن کہا جائے گا، یہاں دنیا میں نہیں اور نہ ہی یہ اس کا موقع و محل ہے۔

اعرابی نے فوراً کہا: امیرِ محترم! آج کا دن میرے لیے قیامت کے دن سے

بھی سخت ہے کہ اس روز تو میری نیکیاں اور برائیاں دونوں پیش کی جائیں گی، اور پھر ان کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ مگر! آج تو میری برائیاں ہی آپ کے حضور پیش کی گئی ہیں اور میری تمام تر نیکیاں اور خوبیاں پسِ پشت ڈال دی گئی ہیں۔

امیر کو اس کا جواب بڑا پسند آیا اور اُس نے اِس کے خلاف مقدمہ واپس لے لیا۔

لمحۂ فکریہ

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی سوال پوچھا گیا۔

جواب دیا: مجھے نہیں معلوم۔

کہا گیا: آپ عراق کے مفتی وفقیہ ہیں اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں، یقیناً آپ کو اپنے اس جواب سے شرم تو محسوس ہو رہی ہو گی۔

جواب دیا: فرشتے تو اس وقت نہیں شرمائے تھے جب انھوں نے کہا:

﴿لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ﴾

"ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے"۔ (1)

عتبہ بن مسلم کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں 34 ماہ تک رہا۔ اس دوران کتنے ہی لوگوں نے آپ سے سوالات کیے جن کا جواب یہ ہوتا: "مجھے معلوم نہیں۔"

مشہور تابعی سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ سے جب فتویٰ پوچھا جاتا تو فرماتے:

«اللَّهُمَّ، سَلِّمْنِي وَسَلِّمْ مِنِّي».

"اے اللہ! مجھے غلط فتویٰ دینے سے محفوظ رکھ اور لوگوں کو مجھ سے غلط فتویٰ لینے سے محفوظ رکھ!"

ایک مرتبہ امام شافعی رحمہ اللہ سے مسئلہ دریافت کیا گیا تو جواب میں خاموش رہے، پوچھا گیا: جواب کیوں نہیں دیتے؟ فرمایا:

---

(1) البقرة :32

«حَتَّى أَدْرِيَ، الْفَضْلُ فِي سُكُوتِي أَوْ فِي الْجَوَابِ».

”میں اس وقت تک جواب نہیں دیتا جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ فضیلت میرے خاموش رہنے میں ہے یا جواب دینے میں۔“

ابن ابی لیلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

”میں نے ایک سو بیس انصاری صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھا، ان میں سے کسی ایک سے سوال کیا جاتا تو دوسرے کے پاس جانے کو کہتے، دوسرا تیسرے کے پاس تیسرا چوتھے کے پاس، حتیٰ کہ سوال ہوتے ہوتے پہلے کے پاس واپس آ جاتا۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب کوئی صحابی حدیث بیان کرتے اور ان سے سوال ہوتا تو وہ پوری کوشش کرتے کہ اس کا جواب ان کا کوئی دوسرا بھائی دے۔

ابوالحسین ازدی کہا کرتے تھے:

«إِنَّ أَحَدَهُمْ لَيُفْتِي فِي الْمَسْأَلَةِ، لَوْ وَرَدَتْ عَلَى عُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ لَجَمَعَ لَهَا أَهْلَ بَدْرٍ».

”لوگ مسئلہ میں بے جھجک فتویٰ دیتے ہیں، اگر یہی مسئلہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھا جاتا تو اس کے جواب کے لیے اہل بدر کو جمع کر لیتے۔“

قاسم بن محمد سے سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: مجھے اس کا جواب نہیں آتا۔

سائل نے کہا: حضرت، آپ کے پاس آیا ہوں، آپ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا، مجھے تو جواب چاہیے۔

قاسم بن محمد نے فرمایا: بھائی! میری لمبی داڑھی کی طرف مت جاؤ! اور نہ یہ دیکھو کہ میرے اردگرد کتنے لوگ جمع ہیں۔ اللہ کی قسم! ”مَا أُحْسِنُهُ“ میں اچھے طریقے سے جواب نہیں دے سکتا۔

قریش کے ایک آدمی نے اس سائل سے کہا تھا: اے میرے بھتیجے! قاسم کی صحبت اختیار کرو، آج کے دن ان سے زیادہ علم و فضل والا کوئی شخص نہیں۔

قاسم فرمانے لگے:

«وَاللهِ! لَأَنْ يُقْطَعَ لِسَانِي أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَتَكَلَّمَ بِمَا لَا عِلْمَ لِي بِهِ».

''اللہ کی قسم! میری زبان کٹ جائے، یہ میرے لیے اس بات سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں ایسی بات کے بارے میں گفتگو کروں جس کا مجھے علم نہیں۔''

ایک مرتبہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کو خط لکھا:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم طبیب کی حیثیت سے کام کر رہے ہو۔ اس بات سے ڈرنا کہ کہیں تم عطائی نہ بن جاؤ یا اپنی کم علمی کے باعث کسی مسلمان کو قتل نہ کر دو۔''

اس تنبیہ کے بعد حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فیصلہ کرنے میں بہت احتیاط کرنے لگے، بلکہ کئی بار ایسا ہوا کہ دو آدمی ان کے پاس جھگڑا لے کر آئے تو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے بعد فرمایا: فریقین کو دوبارہ میرے پاس لے کر آؤ، میں عطائی ہوں۔ جب وہ آ جاتے تو ان سے دوبارہ معاملہ سنتے، اس پر دوبارہ غور و فکر کرتے اور پھر فیصلہ کرتے۔

اللہ اللہ! کتنا خوف اور ڈر تھا کہ کہیں ان سے عجلت میں غلط فیصلہ نہ ہو جائے!

کیا آج کل کے علمائے کرام اس پر غور فرمائیں گے؟

موت

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے ایک وزیر کے ساتھ مجلس میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ ایک شخص نہایت خوبصورت حلیے میں، عمدہ پوشاک پہنے، اعلیٰ وضع قطع کے ساتھ مجلس میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ شخص چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وزیر نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے پوچھا:

«مَنْ هَذَا الَّذِي كَانَ مَعَكَ يَا نَبِيَّ اللهِ ؟»

”اللہ کے نبی! یہ ابھی جو شخص آپ کے پاس تھا کون تھا“؟

ارشاد ہوا:

«إِنَّ الَّذِي كَانَ مَعِي هُوَ مَلَكُ الْمَوْتِ»

”میرے پاس جو شخص بیٹھا تھا ملک الموت تھا“

جیسے ہی وزیر نے موت کے فرشتہ کا ذکر سنا، اس کا رنگ فق ہوگیا، جسم کپکپانے لگا۔ عرض کرنے لگا:

«أَرْجُوكَ أَيُّهَا الْمَلِكُ أَنْ تَأْمُرَ الرِّيحَ أَنْ تَحْمِلَنِي إِلَى بِلَادِ الْهِنْدِ. فَمَا كَانَ لِي أَنْ أَجْلِسَ فِي مَكَانٍ جَلَسَ فِيهِ مَلَكُ الْمَوْتِ».

”حضرت! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہوا کو حکم دیں وہ مجھے ہندوستان پہنچا دے۔ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں اس جگہ بیٹھوں جہاں ملک الموت بیٹھا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ ہوا کو حکم دیا اس نے وزیر کو ہندوستان منتقل کر دیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ملک الموت دوبارہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہوا۔ وزیر نظر نہ آیا۔ پوچھا: آپ کا وزیر کدھر گیا ہے؟ ارشاد فرمایا:

«حَمَلَتْهُ الرِّيحُ إِلَى بِلَادِ الْهِنْدِ خَوْفاً مِنْكَ».

”تیرے ڈر اور خوف کی وجہ سے ہوا نے اس کو ہندوستان پہنچا دیا ہے“۔

ملک الموت کہنے لگا: جب تھوڑی دیر پہلے آپ کی مجلس میں آیا تھا تو اس شخص کو آپ کی مجلس میں دیکھ کر بڑا متعجب ہوا۔ کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ فلاں وقت پر اس شخص کی ہندوستان کے فلاں علاقے میں جان قبض کرنا ہے۔ اور یہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور آپ کے پاس بیٹھا ہے۔

«سُبْحَانَ اللهِ إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ الزَّمَانَ وَلَا الْمَكَانَ».

”سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ (تقدیر میں لکھے ہوئے) وقت اور جگہ کو بدلتا نہیں“۔

بہر حال میں وقت مقررہ پر ہندوستان پہنچا تو یہ شخص اس جگہ موجود تھا۔ اور اب میں اس کی جان قبض کر کے آپ کے پاس آ رہا ہوں۔

عزت ووقار کا پیمانہ

ابو العباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک (مالدار) آدمی کا گزر ہوا۔ آپ نے اپنی خدمت میں بیٹھے ہوئے ایک صحابی سے فرمایا:

«مَا رَأْيُكَ فِي هَذَا؟».

''اس آدمی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

صحابی نے عرض کیا: اس آدمی کا شمار بڑے اور باعزت لوگوں میں ہے، اللہ کی قسم! یہ اس بات کا مستحق ہے کہ شادی کا پیغام دے تو اس کی شادی ہو جائے اور کسی کی سفارش کرے تو قبول کی جائے۔

رسولِ اکرم ﷺ یہ سن کر خاموش رہے۔ پھر ایک دوسرے آدمی کا گزر ہوا تو آپ نے مذکورہ صحابی سے فرمایا: اس شخص کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! اس کا شمار مسلمانوں کے فقراء میں ہے، یہ اس بات کا مستحق ہے کہ اگر کسی کے پاس پیغامِ نکاح دے تو اس کی شادی نہ ہو، اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول نہ کی جائے اور اگر کوئی بات کہے تو کوئی کان نہ دھرے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«هَذَا خَيْرٌ مِنْ مِلْءِ الْأَرْضِ مِثْلَ هَذَا».

''اللہ کے نزدیک یہ محتاج شخص اس مالدار شخص سے زمین بھر بہتر ہے۔''(1)

آخر وہ میزان کیا ہے؟ وہ ناپنے کا کون سا آلہ ہے؟ اور انسان کی وہ کون سی

---

(1) بخاری: کتاب الرقاق، باب فضل الفقر (6447)

صلاحیتیں اور لیاقتیں ہیں جو اسے اوجِ ثریا پر پہنچاتی ہیں یا تحت الثریٰ میں گرا کر ذلیل وخوار کرتی ہیں؟ درحقیقت وہ میزان اسلام کی میزان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میزان اور آلہ کو تقویٰ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾.

”جان لو! اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی (ڈرنے والا) ہے۔“ (1)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو یہ گمان تھا کہ غریب لوگوں پر انھیں کچھ اہمیت حاصل ہے اور وہ ان سے بلند درجہ ہیں۔ جب اس بات کی خبر رسولِ اکرم ﷺ کو ہوئی تو آپ نے فرمایا:

«هَلْ تُنْصَرُونَ وَتُرْزَقُونَ إِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ» (2).

”تم لوگ صرف اپنے کمزور ومعذور لوگوں کی دعاؤں کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے مدد پہنچائے جاتے ہو اور ان ہی کی دعاؤں سے رزق دیے جاتے ہو۔“

نبیٔ کریم ﷺ نے فقراء ومحتاجین کی شان میں فرمایا ہے:

«ابْغُونِي الضُّعَفَاءَ، فَإِنَّمَا تُرْزَقُونَ وَتُنْصَرُونَ بِضُعَفَائِكُمْ» (3).

”مجھے کمزور لوگوں میں تلاش کیا کرو، کیونکہ تم لوگ اپنے کمزوروں کی بدولت رزق ومدد دیے جاتے ہو۔“

---

(1) الحجرات: 13۔

(2) بخاری: کتاب الجهاد، باب من استعان بالضعفاء والصالحين فی الحرب، (2896)۔

(3) [صحيح] ابو داود، كتاب الجهاد، باب فی الانتصار برذل الخيل والضعفة (2594)، نسائی (3181)۔

اور نبی کریم ﷺ کی یہ دعا صحیح سند سے ثابت ہے:

«اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مِسْكِينًا وَتَوَفَّنِي مِسْكِينًا وَاحْشُرْنِي فِي زُمْرَةِ الْمَسَاكِينِ».

''اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ اور مسکینی میں موت دے اور قیامت کے روز مسکینوں کے زمرے میں مجھے اٹھا!'' (1)

---

(1) اسے بیہقی وطبرانی نے روایت کیا ہے اور شیخ البانی نے صحیح الجامع (1261) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا مزاح

حضرت انس ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: «يَا رَسُولَ اللهِ ! احْمِلْنِي»

”اے اللہ کے رسول! مجھے سواری فراہم کریں۔“

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّا حَامِلُوكَ عَلَى وَلَدِ نَاقَةٍ»

”ہم تجھے اونٹنی کے بچے پر سوار کریں گے۔“

اس نے کہا:

«وَمَا أَصْنَعُ بِوَلَدِ النَّاقَةِ؟»

”میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا؟“

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«وَهَلْ تَلِدُ الْإِبِلَ إِلَّا النُّوقُ»

”اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔“(1)

حضرت صہیب رومی ؓ کہتے ہیں: میں ایک مرتبہ خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ کے سامنے روٹی اور کھجوریں تھیں، آپ نے فرمایا:

«اُدْنُ فَكُلْ» ”قریب ہو جاؤ اور کھاؤ۔“

چنانچہ میں کھجوریں کھانے لگا۔ مجھے آشوبِ چشم تھا اور میری ایک آنکھ سرخ تھی۔ آپ نے میری طرف دیکھا اور فرمایا:

---

(1) [صحيح]، أبوداود (4998)۔

«تَأْكُلُ تَمْرًا وَبِكَ رَمَدٌ!؟».

”کھجوریں کھا رہے ہو حالانکہ تمھاری آنکھ خراب ہے!“

میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں اس آنکھ کی طرف سے نہیں کھا رہا ہوں جس میں مرض لاحق ہے بلکہ دوسری جانب سے کھا رہا ہوں۔ اللہ کے رسول ﷺ میری بات سن کر مسکرانے لگے۔ (1)

ایک بوڑھی عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرما دیں کہ وہ مجھے جنت میں داخل کر دے۔ آپ نے اس سے فرمایا:

«يَا أُمَّ فُلَانٍ! إِنَّ الْجَنَّةَ لَا تَدْخُلُهَا عَجُوزٌ».

”اے فلاں کی ماں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت داخل نہیں ہو سکتی۔“

بڑھیا یہ سن کر رنجیدہ ہو گئی اور روتے ہوئے واپس ہوئی۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَخْبِرُوهَا أَنَّهَا لَا تَدْخُلُهَا وَهِيَ عَجُوزٌ، إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَقُولُ: ﴿إِنَّا أَنشَأْنَٰهُنَّ إِنشَآءً ۝٣٥ فَجَعَلْنَٰهُنَّ أَبْكَارًا ۝٣٦ عُرُبًا أَتْرَابًا ۝٣٧﴾»(2)

”اس خاتون کو خبر دو کہ وہ بوڑھی ہونے کی حالت میں جنت میں داخل نہیں ہوگی (بلکہ جوان ہو کر داخل ہوگی)، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے ان (اہل جنت کی بیویوں) کو خاص طور پر بنایا ہے، اور ہم نے انھیں کنواریاں بنایا ہے، محبت والی اور ہم عمر ہیں۔“(3)

---

(1) [حسن]، ابن ماجه (3443)۔ (2) الواقعة: (35-37)۔

(3) الشمائل النبوية للترمذي، رقم (240)، الدرالمنثور (158)، مجمع الزوائد (419/10)۔

سوچ کا انداز

اس واقعہ کے راوی مصر کے مشہور عالم شیخ محمد غزالی ہیں۔ وہ اپنی کتاب «تَأَمُّلَاتٌ فِي الدِّينِ وَالْحَيَاةِ» میں لکھتے ہیں:

مصر میں ایک نہایت امیر شخص کا بیٹا ضعفِ بصر کا شکار تھا۔ اس کا علاج شروع ہوا مگر ڈاکٹروں کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کی آنکھ کی بینائی کم ہوتی چلی گئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ اس کی بینائی اتنی کمزور ہوگئی کہ وہ روشنی اور اندھیرے میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ والدین کے دل پر جو گزرتی ہوگی، اس کا اندازہ قارئین خوب کر سکتے ہیں۔

اس بچے کا والد ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اردگرد کافی لوگ جمع تھے۔ گفتگو کا رخ بچے کی بینائی کی طرف مڑ گیا۔ بچے کے باپ نے کہا کہ میں نے اس بچے کو دین کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اسے اب قرآن کریم حفظ کروائیں گے اور حفظ کے بعد عالم دین بنانے کے لیے اسے یونیورسٹی میں داخل کروائیں گے۔ لوگوں نے اس کی خوب تحسین کی کہ دیکھیں ان کو اسلام سے کتنی محبت ہے کہ اپنے بیٹے کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ہے۔

بچے کے لیے ایک مشہور قاری و حافظِ قرآن کا بندوبست کیا گیا جو صبح و شام بچے کو حفظ کراتا اور قرأت سکھاتا۔ کچھ ہی مدت میں بچے نے کافی سورتیں حفظ کر لیں اور تلاوت میں تو اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔

ادھر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کی آنکھیں ٹھیک ہونا شروع ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے ایک مرتبہ پھر اس پر بھرپور توجہ دی، قدرت الٰہی بھی مہربان ہوگئی۔ چنانچہ بچے کی بصارت بتدریج واپس آ گئی اور اب وہ بالکل تندرست تھا، اس کو عینک

کی بھی ضرورت نہ تھی۔

ادھر بچے کے والد نے مختلف انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے تو اپنے بیٹے کو جامعہ ازہر کے لیے اس لیے وقف کیا تھا کہ وہ بڑی حد تک نابینا تھا۔

دراصل اس نے دینی تعلیم دلانے کا اہتمام تو ضعفِ بصر کی وجہ سے کیا تھا۔ بالکل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ مَا يَكْرَهُونَ﴾ ”اللہ کے لیے اس چیز کی نسبت کر دیتے ہیں جسے خود اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں“(1)

اب وہ مسلسل سوچتا رہا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے، اور پھر وہی ہوا جو دنیادار کرتے ہیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم سے نکال کر ایک انگلش اسکول میں داخل کر دیا۔

شیخ محمد غزالی لکھتے ہیں کہ یہ ہے مسلمانوں کا اپنے دین کے ساتھ تعلق اور رابطہ۔ دین کو حاصل کرنے کے لیے لوگوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو خدانخواستہ بہرے، کانے اور نابینا بچے ہیں ان کو تو دینی مدارس میں داخل کر دیا جائے، اور جو نہایت قابل اور ذہین بچے ہیں ان کو اسکولوں' کالجوں میں داخل کر دیا جائے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ذہین اور سمجھدار بچے دین کے عالم بنیں اور اسلام کی روشنی کو مزید عام کریں۔

---

(1) النحل: 62

موتیوں کا ہار

قاضی ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھا۔ ایک دن مجھے بہت سخت بھوک لگی، مجھے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے اپنی شدید بھوک مٹا سکوں۔ اس دوران مجھے ریشم کی ایک تھیلی گری ہوئی ملی۔ اس کا منہ بھی ریشمی تاگے سے بندھا ہوا تھا۔ میں نے تھیلی لی اور سیدھا اپنے گھر آیا۔ جب تھیلی کھولی تو اس کے اندر موتیوں کا ایک نہایت خوبصورت ہار تھا۔ اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا خوبصورت ہار نہیں دیکھا تھا۔ تھیلی کو گھر میں رکھا اور باہر نکلا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی پانچ سو دینار ہاتھوں میں لیے اعلان کر رہا تھا: میری ریشمی تھیلی گم ہوگئی ہے جس میں موتیوں کا ہار ہے، جو شخص اسے واپس دے گا، یہ پانچ سو دینار اسے بطور انعام دوں گا۔

میں نے اس کا اعلان سن کر دل میں کہا: میں اس کا ضرورت مند ہوں۔ فاقہ کشی ہے۔ مگر یہ ہار میرا نہیں ہے۔ نہ ہی میرا اس پر کوئی حق ہے۔ مجھے ہر حالت میں اسے واپس کر دینا چاہیے۔ اچانک دل میں خیال آیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے:

«مَنْ تَرَكَ شَيْئًا لِلّٰهِ عَوَّضَهُ اللّٰهُ خَيْرًا مِّنْهَا»

"جس نے اللہ کے لیے کوئی چیز چھوڑی، اللہ تعالیٰ اس کو اس سے بہتر عطا فرمائیں گے۔"

اس حدیث کو یاد کرنے کے بعد میں نے اپنے عزائم کو اور پختہ کیا اور گھر جا کر وہ تھیلی لایا۔ بوڑھے نے مجھے تھیلی کی علامت، اس کے پھندنے کی علامت اور اس کے اندر ہار میں موتیوں کی لڑیوں کی تعداد بتا دی، نیز جس تاگے سے تھیلی بندھی ہوئی تھی، اس کی علامت بھی بتا دی، میں نے تھیلی بوڑھے کے سپرد کر دی۔

بوڑھے نے اپنی تھیلی پا کر مجھے پانچ سو دینار دینے کی کوشش کی لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: اس تھیلی کو اس کے مستحق تک پہنچانا میرے اوپر واجب تھا، اس لیے میں اس کا بدلہ نہیں لے سکتا۔

بوڑھے نے کہا: نہیں، تمھیں یہ ضرور لینا ہوگا۔ پھر اس نے بار بار اصرار کیا لیکن جب میں نے لینے سے انکار کر دیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلتا بنا۔

میرے پاس کوئی بھی ذریعۂ معاش نہیں تھا جس سے میں اپنی زندگی گزارتا، میں نے ذریعۂ معاش کی تلاش میں مکہ مکرمہ سے رختِ سفر باندھا اور سمندر کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے میری کشتی ٹوٹ گئی اور لوگ غرقاب ہو گئے۔ کشتی میں جو کچھ ساز و سامان تھا، وہ سب کا سب سمندر کی نذر ہو گیا۔ اتفاقاً کشتی کا ایک تختہ میرے ہاتھ آ گیا، میں اس پر بیٹھ گیا، نہ جانے کب تک سمندر کے تھپیڑوں سے دوچار ہوتا رہا، مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میری منزل کدھر ہے؟

سمندر کے تھپیڑوں نے مجھے ایک ایسے جزیرہ میں لا ڈالا جہاں کچھ لوگ آباد تھے۔ میں جزیرے کے اندر داخل ہوا اور وہاں ایک مسجد میں جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ میں مسجد میں بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا۔ جزیرے کے لوگوں نے میری قرأت سنی تو بڑے خوش ہوئے، میرے پاس اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے: ہمیں اور ہمارے بچوں کو بھی قرآن پڑھنا سکھلاؤ۔ چنانچہ میں ان لوگوں کو قرآنِ کریم کی تعلیم دینے لگا۔ انھوں نے میری کافی خاطر و مدارات کی۔

ایک روز میری نگاہ مسجد کے اندر قرآن کریم کے چند اوراق پر پڑی تو میں انھیں لے کر لکھنے لگ گیا۔ لوگوں نے پوچھا: کیا تمھیں اچھی طرح لکھنا بھی آتا ہے؟

میں نے جواب دیا: ہاں۔ ان لوگوں نے مجھ سے درخواست کی: ہمارے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھلاؤ۔

اس کے بعد وہ لوگ اپنے بچوں اور نوجوانوں کو میری خدمت میں بھیجنے لگے اور میں انہیں پڑھنے لکھنے کی تعلیم دینے لگا۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت سا مال بھی حاصل ہوگیا، اور گاؤں میں میری خاصی اہمیت بھی ہوگئی۔

چند دنوں کے بعد ان لوگوں نے مجھ سے کہا: ہمارے ہاں ایک یتیم لڑکی ہے، نیک سیرت اور خوبصورت ہے۔ اس کے پاس ورثے میں کچھ دولت بھی آئی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس سے تمہاری شادی کر دیں۔ لیکن میں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے کہا: نہیں، نہیں! ہم تمہاری شادی کر کے چھوڑیں گے، پھر انھوں نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں نے کچھ پس وپیش کے بعد ہاں کر دی۔

شادی کے بعد جب بیوی سامنے آئی تو میں نے دیکھا کہ بالکل وہی موتیوں کا ہار اس کے گلے کی زینت بنا ہوا ہے جس کو میں نے مکہ مکرمہ میں پایا تھا۔ میں ٹکٹکی باندھ کر ہار کی جانب دیکھنے لگا۔ لوگوں نے مجھ سے کہا بھائی! تم اس یتیم لڑکی کی طرف سے نگاہ پھیر کر اس کے ہار کی طرف دیکھ رہے ہو، تم نے تو اس یتیم کا دل توڑ دیا!

میں نے ان لوگوں کو اس ہار کا قصہ تفصیل سے بتایا۔ ان لوگوں نے میری بات سن کر بلند آواز سے «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ» کا نعرہ لگایا۔ میں نے پوچھا: بات کیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ وہ بوڑھا آدمی جس کا ہار تمہیں ملا تھا، اسی یتیم لڑکی کا باپ تھا۔ وہ بسا اوقات کہا کرتا تھا: میں نے پوری دنیا میں صرف ایک ہی کامل مسلمان دیکھا ہے اور وہ وہی ہے، جس نے موتیوں کا ہار پا کر میرے حوالے کر دیا۔ نیز وہ برابر اپنی دعا

میں کہا کرتا تھا: اے اللہ! مجھے اور اس آدمی کو ایک ساتھ اکٹھا کر دے تا کہ میں اپنی صاحبزادی کی اس سے شادی کر دوں۔ اور اب یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس کی مراد پوری کر دی اور تم خود بخود یہاں آن پہنچے۔

قاضی ابوبکر کا بیان ہے: پھر میں اس لڑکی کے ساتھ جو اب میری بیوی تھی، ایک زمانے تک زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ اس سے دو بچے پیدا ہوئے۔ پھر اس کی وفات ہوگئی۔ وہ ہار مجھے اور میرے دونوں بچوں کو وراثت میں ملا۔ کچھ دنوں بعد میرے یہ دونوں بچے بھی اللہ کو پیارے ہوگئے اور یہ ہار میری وراثت میں آ گیا۔

میں نے بعد میں یہ ہار ایک لاکھ دینار میں فروخت کر دیا، یہ جو دولت تم میرے پاس دیکھ رہے ہو، یہ اسی ہار کی بدولت ہے۔ (1)

---

(1) دیکھیئے :کتاب الذیل علی طبقات الحنابلہ 196/3 لابن رجب الحنبلی۔

بدعتی اور حوض کوثر

آج کا دور فتنوں کا دور ہے۔ ہر طرف بدعات و خرافات ہیں اور دین میں دانستہ و غیر دانستہ بعض ایسی اشیاء داخل کر دی گئی ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے' انھیں بدعات کہا جاتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں بدعت کا مطلب دین میں حصولِ ثواب کے لیے کسی ایسی چیز کا اضافہ کرنا ہے جس کی بنیاد یا اصل شریعت میں موجود نہ ہو۔ جامع و مانع اور وسیع مفہوم میں بدعت کا مطلب یہ ہے کہ عادی امور سے ہٹ کر محض ثواب کی غرض سے شریعت کی شکل میں کوئی چیز ایجاد کرنا' جس کا وجود نہ قرآن و سنت میں ہو' نہ خلفائے راشدین کی سنت میں پایا جائے۔ (1)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ، فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ».

"دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنے سے بچو، اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے (جو جہنم میں لے جاتی ہے)۔" (2)

دین کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی چیز بدعات ہیں۔ چونکہ بدعات نیکی سمجھ کر کی جاتی ہیں اس لیے بدعتی انھیں ترک کرنے کا تصور تک نہیں کرتا' جبکہ دوسرے گناہوں کے معاملہ میں گناہ کا احساس موجود رہتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَبَى اللهُ أَنْ يَقْبَلَ عَمَلَ صَاحِبِ بِدْعَةٍ حَتَّى يَدَعَ بِدْعَتَهُ». (3)

"اللہ تعالیٰ بدعتی کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں کرتا' جب تک وہ بدعت نہ چھوڑ دے۔"

---

(1) دیکھئے: امام شاطبی کی کتاب "الاعتصام"۔

(2) [صحیح]، ابوداود (4607)، ترمذی (2676)، ابن ماجہ (42)، ابن حبان (5)۔

(3) ابن ماجہ (50)۔

گویا بدعتی کی ساری محنت اور مشقت کی مثال اس مزدور کی سی ہے جو دن بھر محنت اور مزدوری کرتا رہے لیکن اسے کوئی مزدوری یا اجرت نہ ملے' سوائے تھکاوٹ اور بربادی کے۔

ہر وہ عمل بدعت ہے جو ثواب اور نیکی سمجھ کر کیا جائے لیکن شریعت میں اس کی کوئی بنیاد یا ثبوت نہ ہو' یعنی نہ تو رسول پاک ﷺ نے خود کیا ہو' نہ کسی کو اس کا حکم دیا ہو اور نہ کسی کو اس کی اجازت دی ہو۔ ایسا عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود (نا قابل قبول) ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ».

''جو کوئی ہمارے دین میں کوئی ایسی بات پیدا کرے جو اس میں نہیں، وہ مردود ہے۔''(1)

بدعتی اللہ تعالیٰ کی نظر میں اتنا مبغوض ہے کہ اسے حوض کوثر پر پہنچنے کے بعد وہاں پانی پینے سے روک دیا جائے گا اور رسولِ اکرم ﷺ وہاں سے ان بدعتیوں کو بھگا دیں گے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ، مَنْ مَرَّ عَلَيَّ شَرِبَ، وَمَنْ شَرِبَ لَمْ يَظْمَأْ أَبَدًا، لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ أَقْوَامٌ أَعْرِفُهُمْ وَيَعْرِفُونِي، ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ، فَأَقُولُ: إِنَّهُمْ مِنِّي، فَيُقَالُ: إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أَحْدَثُوا بَعْدَكَ، فَأَقُولُ: سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِي».

---

(1) بخاری (2697)، مسلم (1718)۔

17662

''میں حوضِ کوثر پر تمہارا پیشرو ہوں گا۔ جو وہاں آئے گا' پانی پیے گا اور جس نے ایک بار پانی پی لیا' اسے کبھی پیاس نہیں لگے گی۔ بعض ایسے لوگ بھی وہاں آئیں گے، جنہیں میں پہچانوں گا اور وہ بھی مجھے پہچانیں گے (کہ میں ان کا رسول ہوں)، پھر انھیں مجھ تک آنے سے روک دیا جائے گا۔ میں کہوں گا: یہ تو میرے امتی ہیں۔ لیکن مجھے بتایا جائے گا: آپ نہیں جانتے آپ کے بعد ان لوگوں نے کیسی بدعات رائج کیں۔ پھر میں کہوں گا: دوری ہو' دوری ہو' ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے میرے بعد میرا دین بدل ڈالا۔'' (1)

---

(1) بخاری (6583-6584)، مسلم (2290-2291)۔

قیامت کی نشانیاں

ایک مرتبہ انس بن مالک ؓ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے فرمایا:

«أَلَا أُحَدِّثُكُمْ حَدِيثًا سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ، لَا يُحَدِّثُكُم أَحَدٌ بَعْدِي سَمِعَهُ مِنْهُ»

''لوگو! میں تمہیں ایک ایسی حدیث نہ سناؤں جس کو میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، ہوسکتا ہے میرے بعد کوئی شخص آپ کو ایسا نہ ملے جس نے اس حدیث کو خود نبی کریم ﷺ سے سنا ہو۔''

«إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ»

''قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ''

«يُرْفَعَ الْعِلْمُ»

''علم اٹھ جائے گا (ختم ہو جائے گا)۔''

«وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ»

''جہالت عام ہو جائے گی۔''

«وَيَفْشُوَ الزِّنَا»

''زنا عام ہو جائے گا۔''

«وَيُشْرَبَ الْخَمْرُ»

''شراب پی جائے گی۔''

«وَيَذْهَبَ الرِّجَالُ»

''مرد ختم ہو جائیں گے (کم ہو جائیں گے)۔''

«وَتَبْقَى النِّسَاءُ»

’’عورتیں باقی رہ جائیں گی (زیادہ ہو جائیں گی)۔‘‘

«حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً قَيِّمٌ وَاحِدٌ»

’’یہاں تک کہ پچاس عورتوں کی نگرانی ایک ہی مرد کرے گا (یعنی جنگ وجدال اور حادثات وغیرہ میں مردوں کی موت زیادہ ہونے کے سبب عورتیں زیادہ ہوں گی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری ایک مرد کے اوپر ہوگی)۔‘‘ (1)

---

(1) بخاری(5231)، مسلم(2671) الفاظ مسلم کے ہیں۔

حق گوئی

خلیفہ ہشام بن عبدالملک حج کے لیے مکہ مکرمہ آیا ہوا تھا۔ ایک دن اہلِ مکہ سے کہا کہ کوئی صحابیٔ رسول اگر زندہ ہیں تو ان سے ملنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ کہا گیا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وفات پا چکے ہیں۔ کہنے لگا: اچھا تابعی ہی سہی' چنانچہ حضرت طاووس بن کیسان یمانی رحمۃ اللہ علیہ مکہ میں موجود تھے۔ لوگ گئے اور ان کو خلیفہ کے پاس لے آئے۔ جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اپنے جوتے قالین کے کنارے سے لگا کر اتارے اور اس کو امیر المومنین کہنے کی بجائے پکارا: السلام علیکم! پھر اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

ہشام کے چہرے پر غصے کے آثار دکھائی دیے۔ اس وقت کا دستور تھا کہ خلیفہ کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ امیر المومنین کہہ کر کنیت کے ساتھ پکارا جاتا تھا۔ لیکن حضرت طاووس نے کنیت کی بجائے اس سے کہا:

«كَيْفَ أَنْتَ يَا هِشَامُ؟».

''ہشام، تم کیسے ہو؟''

اب تو ہشام کو اور زیادہ غصہ آیا اور آپے سے باہر ہو کر بولا:

«يَا طَاوُوسُ، مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا صَنَعْتَ؟».

''اے طاووس! آپ کو ایسا کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

حضرت طاووس نے فرمایا:

«وَمَا صَنَعْتُ؟».

''میں نے کیا کیا ہے؟''

اب خلیفہ ہشام کے غصے میں اور اضافہ ہوگیا۔

بولا: پہلی غلطی یہ کہ آپ نے قالین کے کنارے سے لگا کر اپنے جوتے اتارے (یہ ادب کے خلاف ہے)، دوسری غلطی یہ کہ آپ نے مجھے امیر المومنین کہہ کر سلام نہیں کیا اور مجھے میری کنیت سے پکارنے کی بجائے میرے نام سے پکارا ہے۔ مزید یہ کہ آپ نے کہا: اے ہشام! تم کیسے ہو؟ بھلا حکمرانوں کو ایسے پکارا جاتا ہے؟ اور اس پر بھی طرہ یہ کہ میری اجازت کے بغیر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے؟

حضرت طاووس نے فوراً جواب دیا: ہاں، میں نے تمہارے پاس داخل ہونے سے پہلے اپنے جوتے اتارے، مگر سنو! میں تو ہر روز پانچ مرتبہ اپنے رب تعالیٰ کے گھر کے دروازے پر جوتے اتارتا ہوں اور وہ کبھی مجھ سے ناراض نہیں ہوا۔

تمہارا یہ کہنا کہ میں نے تمہیں امیر المومنین کہہ کر سلام نہیں کیا، تو بات یہ ہے کہ تمام لوگ تو تمہاری خلافت سے راضی نہیں ہیں اور نہ ہی تمام مسلمان تمہیں امیر المومنین مانتے ہیں۔ لہٰذا اس میں جھوٹ کا احتمال تھا، اس لیے میں نے تمہیں امیر المومنین کہہ کر سلام نہیں کیا۔

تمہارا یہ کہنا کہ میں نے تمہیں کنیت کے ساتھ کیوں نہیں پکارا اور نام لے کر کیوں پکارا ہے؟ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے دوستوں (نبیوں) کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: "یاداود، یایحییٰ، یا موسیٰ"

اور اپنے بدترین دشمن کا کنیت سے ذکر کیا اور کہا:

"تَبَّتْ یَدَا أَبِی لَھَبٍ" (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں)

رہا تمہارا یہ کہنا کہ میں بغیر اجازت کے تمہارے پاس آ کر بیٹھ گیا، تو سنو! میں نے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب ؓ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

«إِذَا أَرَدْتَ أَنْ تَنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَانْظُرْ إِلَى رَجُلٍ جَالِسٍ وَحَوْلَهُ قَوْمٌ قِيَامٌ».

’’اگر تو کسی جہنمی کو دیکھنا چاہے تو اس آدمی کو دیکھ لے جو بیٹھا ہو اور اس کے اردگرد لوگ ادب کے ساتھ کھڑے ہوں۔‘‘ اس لیے میں کھڑا رہنے کے بجائے بیٹھ گیا۔

خلیفہ ہشام بن عبدالملک لاجواب ہو گیا اور غصہ ضبط کرنے کے کچھ دیر بعد بولا:

”عِظْنِي“ ’’آپ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔‘‘

حضرت طاوس نے فرمایا:

«إِنِّي سَمِعْتُ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُولُ: إِنَّ فِي جَهَنَّمَ حَيَّاتٍ كَالْقِلَالِ وَعَقَارِبَ كَالْبِغَالِ تَلْدَغُ كُلَّ أَمِيرٍ لَا يَعْدِلُ فِي رَعِيَّتِهِ».

’’میں نے امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جہنم میں پہاڑ کی چوٹیوں کی طرح لمبے تڑنگے سانپ ہوں گے اور خچروں کی طرح بڑے بڑے بچھو ہوں گے، جو رعایا کے ساتھ عدل و انصاف نہ کرنے والے امیر کو ڈسیں گے۔‘‘

حضرت طاوس (1) کی وفات 106ھ میں ہوئی۔

---

(1) حوالہ کیلئے دیکھئے: وفيات الأعيان، ابن خلكان (510/2) دار صادر، بيروت۔

گدڑی پوش مجاہد

یہ سن ۱۴ ہجری کی بات ہے ایرانی سپہ سالار رستم کی قیادت میں بیاسی ہزار (۸۲۰۰۰) کافر فوجیں تھیں۔ جب مجاہدین اسلام (جن کی تعداد سات یا آٹھ ہزار تھی) اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایرانی سرحد پر قادسیہ کے مقام پر جمع ہوئے تو رستم نے مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس یہ کہہ کر اپنا ایلچی بھیجا کہ تم فوجیوں میں سے کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجو، تاکہ اس سے تبادلہ خیال کروں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا جو تیس سالہ جوان تھے اور فقراءِ صحابہ میں سے تھے، اور ان سے فرمایا: جاؤ اور اپنی وضع قطع میں کچھ تبدیلی نہ کرنا، کیونکہ ہم ایسی قوم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے عزت و شان بخشی ہے، اگر ہم نے اسلام کو چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے عزت و شان طلب کی تو اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل و رسوا کر دے گا۔

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی نصیحت سن کر اپنے دبلے پتلے اور لاغر گھوڑے پر سوار ہوئے اور پھٹا پرانا کپڑا پہنے ہوئے ہاتھ میں چھوٹا سا نیزہ لے کر روانہ ہو گئے۔ جب رستم کو خبر پہنچی کہ مسلمانوں کا نمائندہ اس کی خدمت میں حاضر ہونے والا ہے تو اس نے اپنے اردگرد حکماء و وزراء اور فوجیوں کو اکٹھا کیا۔ وہ تمام کے تمام صف بندی کر کے تیار ہو گئے تاکہ ان کی یہ ہیئت دیکھ کر مسلمان نمائندہ مرعوب ہو جائے اور اچھی طرح گفتگو نہ کر سکے۔ علاوہ ازیں مسلم نمائندے کی آمد کی خبر سن کر رستم نے اپنی مجلس

کو سونے کے تاروں سے کڑھے ہوئے تکیوں اور ریشم کی مسندوں سے سجایا اور قیمتی یاقوت و جواہرات سے مزین تاج پہنے ہوئے سونے کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

جب ربعی بن عامر ؓ وہاں پہنچے تو رستم نے اپنے فوجیوں اور وزیروں کو انھیں اندر لانے کا حکم دیا۔ حضرت ربعی بن عامر ؓ بوسیدہ کپڑوں میں اپنے چھوٹے سے گھوڑے پر سوار ہی داخل ہوئے اور ریشم کی مسندوں کے کناروں کو اپنے گھوڑے کے سُموں سے روندتے ہوئے آگے بڑھے، آپ کے جسم پر ہتھیار، زرہ اور خود تھا۔

سپاہیوں نے کہا: اپنے ہتھیار اتار دو۔

ربعی بن عامر ؓ نے کہا:

«إِنِّي لَمْ آتِكُمْ، وَإِنَّمَا جِئْتُكُمْ حِينَ دَعَوْتُمُونِي، فَإِنْ تَرَكْتُمُونِي هَكَذَا، وَإِلَّا رَجَعْتُ».

''میں خود سے بغیر بلائے تمھارے پاس نہیں آیا، بلکہ تمھاری دعوت پر یہاں آیا ہوں۔ لہٰذا اگر تم نے مجھے اس حال میں چھوڑا تو ٹھیک ورنہ واپس جاتا ہوں۔''

یہ سن کر رستم نے اپنے سپاہیوں سے کہا: اس کو ایسے ہی آنے دو۔

حضرت ربعی بن عامر ؓ مسندوں کے اوپر اپنے نیزے پر ٹیک لگاتے ہوئے اور اکثر مسندوں کو نیزے کی اَنی سے پھاڑتے ہوئے داخل ہوئے، تاکہ رستم اور اس کے سپاہیوں کے سامنے یہ ظاہر کریں کہ یہ دنیا انتہائی حقیر و ذلیل ہے، اللہ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں اور اس کی حقارت و ذلالت کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ناز و نعم اپنے ایک کافر بندے کے حوالے کر دیے ہیں۔

ادھر مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کا حال یہ تھا کہ وہ زمین پر بغیر کسی بچھونے کے سو جاتے تھے۔

جب حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ رستم کے سامنے کھڑے ہوئے تو اس نے کہا: بیٹھ جاؤ۔

ابن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تیرے پاس مہمان بن کر نہیں آیا کہ بیٹھوں، بلکہ ایک نمائندے کی حیثیت سے آیا ہوں۔ تمہیں جو بات کرنی ہے کرو۔ رستم نے ترجمان کی وساطت سے کہنا شروع کیا:

اہلِ عرب! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ قسم میرے معبود کی! تم لوگوں سے زیادہ ذلیل وخوار قوم ہم نے کہیں اور نہیں دیکھی؛ رومیوں کی اپنی ایک تہذیب ہے، اہلِ فارس کی اپنی ایک تہذیب ہے، یونان کی اپنی ایک تہذیب ہے، ہندوستانیوں کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ مگر تم اہلِ عرب جھگڑالو اور ضدی لوگ ہو، بکریوں اور اونٹوں کو ریگستان میں دوڑانے والے ہو، آخر تم لوگ کس نیت سے ہماری سرحد میں آئے ہو؟

ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں اے بادشاہ! ہم ویسے ہی تھے جیسا کہ تم نے کہا ہے بلکہ ہم اس سے بھی گئے گزرے تھے۔ ہم جاہل وگنوار تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے، بکریوں کو پانی پلانے پر جھگڑتے، اپنے قریبی عزیز کو معمولی بات پر قتل کر دیتے ہمیں کسی نظام اور دستور کا کچھ علم تھا اور نہ ہی ہمارے پاس تہذیب وتمدن نام کی کوئی چیز تھی۔ یہ کہہ کر ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے اپنے سر کو تھوڑا سا جھٹکا دیا اور پھر رستم کی طرف مخاطب ہوئے۔ ان کی آواز بلند ہو گئی تھی اور وہ کہہ رہے تھے:

«وَلَكِنَّ اللهَ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ الْعِبَادَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ رَبِّ الْعِبَادِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سَعَةِ الآخِرَةِ، وَمِنْ جورِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ»

”لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کی طرف لے جائیں، دنیا کی تنگی و پریشانی سے نکال کر آخرت کی وسعت وفراوانی کی طرف لے جائیں اور مختلف مذاہب کے ظلم وجور سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لے جائیں۔“

یہ سننا تھا کہ رستم غصے میں آگ بگولا ہوگیا اور کہنے لگا:

«وَاللهِ! لَا تَخْرُجُ حَتَّى تَحْمِلَ تُرَابًا مِنْ بِسَاطِي».

”اللہ کی قسم! تم اس وقت تک واپس نہیں جا سکتے جب تک کہ اپنے سر پر میری سرزمین کی مٹی اٹھا کر نہ لے جاؤ۔“

رستم نے حکم دیا کہ ان کے سر پر مٹی کا ٹوکرا رکھ دیا جائے۔ کسریٰ کے غلام نے حکم کی تعمیل میں مٹی کا ٹوکرا ان کے سر پر رکھ دیا جسے لے کر وہ تیزی سے مسلمانوں کے کیمپ میں واپس آئے۔ سعد بن ابی وقاص ؓ ان کے منتظر تھے۔ دیکھا کہ ربعی کے سر پر مٹی کا ٹوکرا ہے۔

پوچھا: یہ کیا ہے؟

عرض کیا: آپ کو فتح مبارک ہو۔ دشمن نے اپنی سرزمین کی مٹی لڑائی سے پہلے ہی آپ کے حوالے کر دی ہے۔

مسلمانوں نے ربعی ؓ کو دیکھا تو بلند آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ خیمے گونج اٹھے۔ آواز بلند ہوئی: یہ مٹی کا ٹوکرا فتح کی نشانی ہے۔

اگلا دن مسلمانوں کے لیے فتح ونصرت کا تھا۔ سورج کی شعاعیں کفر کی ظلمت کو مٹانے کے لیے روشن ہوئیں۔ مسلمانوں کے سپہ سالار سعد بن ابی وقاص ؓ مجاہدین کی صف اول میں نکلے۔ پھر مجاہدینِ اسلام اور دشمنان اسلام آمنے سامنے ہوئے اور

دونوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ تین دن تک گھمسان کا رن پڑا۔ اس مدت میں ضلالت وگمراہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ایرانی فوجیوں کے سروں کو، جو کلمہ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کی پہچان سے خالی تھے، مجاہدین اسلام کچلتے رہے۔ اور کفار کے سروں کو اڑاتے رہے، یہاں تک کہ دشمنان اسلام شکست فاش سے دوچار ہو گئے۔ وہ مسلمانوں کی تلواروں کی جھنکار اور ان کے خنجروں کی چمک کی تاب نہ لا سکے، مسلمانوں کو تاریخ ساز فتح نصیب ہوئی۔ چوتھے روز سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایوانِ کسریٰ میں داخل ہوئے جس نے ایک ہزار سال تک لوگوں پر حکمرانی کی تھی۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے محل میں سونے سے ملمع سازی کا کام دیکھا اور وہاں ہیرے جواہرات، قیمتی پتھر اور موتیوں کے نقش ونگار دیکھے تو اللہ کے اس انعام پر بے اختیار رونے لگے اور قرآن کریم کی ان آیات کی تلاوت کرنے لگے:

﴿كَمْ تَرَكُوا۟ مِن جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ﴿٢٥﴾ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿٢٦﴾ وَنَعْمَةٍ كَانُوا۟ فِيهَا فَٰكِهِينَ ﴿٢٧﴾ كَذَٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنَٰهَا قَوْمًا ءَاخَرِينَ ﴿٢٨﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ ٱلسَّمَآءُ وَٱلْأَرْضُ وَمَا كَانُوا۟ مُنظَرِينَ ﴿٢٩﴾﴾

''وہ (فرعون اور اس کی جماعت) بہت سے باغات اور چشمے چھوڑ گئے، کھیتیاں اور راحت بخش ٹھکانے، اور وہ آرام کی چیزیں جن میں عیش کر رہے تھے۔ اسی طرح ہو گیا (جس طرح بیان کیا گیا ہے) اور ہم نے ان سب کا وارث دوسری قوم کو بنا دیا۔ چنانچہ ان پر آسمان وزمین روئے نہ انھیں مہلت ملی۔''(1)(2)

---

(1) الدخان:25-29

(2) اس واقعہ کی تفصیل البداية والنهاية (621/9)، حياة الصحابة (515/4)، تاریخ طبری (33/3) اور دیگر تاریخ کی کتب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

شہزادے کو قیمتی وصیّت

سلطان محمد فاتح عثمانی عہد کے مشہور خلیفہ گزرے ہیں۔ ان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے عہد میں قسطنطنیہ (استنبول) فتح ہوا۔ ان سے پہلے کئی حکمرانوں نے کوشش کی کہ قسطنطنیہ فتح ہو جائے، کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس جنگ کے لشکر کو جنت کی بشارت دی تھی۔ سلطان محمد فاتح بڑے عالم، بہادر تھے، عدل و انصاف کرنے والے، متقی اور متواضع تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جب انھوں نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو ان کی عمر کیا تھی؟ صرف ۲۳ سال‘ جی ہاں، تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔

جب سلطان محمد فاتح کی موت کا وقت قریب آن پہنچا تو انہوں نے اپنے صاحبزادے کو بلایا اور اسے کچھ وصیتیں کیں۔ آیئے! پڑھتے ہیں کہ ایک سلطان‘ حاکم اور خلیفہ اپنے بیٹے کو کیا وصیت کرتا ہے:

”بیٹے! میں موت کے کنارے پر کھڑا ہوں، کسی وقت بھی موت آ سکتی ہے مگر مجھے مرنے کا افسوس نہیں، اس لیے کہ میں اپنے بعد تمہارے جیسی لائق اولاد چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

اپنی قوم کے ساتھ عدل و انصاف اور رحم و کرم کا برتاؤ کرنا، بغیر کسی تمیز کے رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کرنا اور دین اسلام کو پھیلانے کی پوری کوشش کرنا کہ یہ روئے زمین کے تمام حکمرانوں پر فرض ہے۔

دین کو ہر کام پر مقدم رکھنا اور ایسے اشخاص کو اپنا ملازم نہ رکھنا جو دین کو اہم نہیں سمجھتے، کبیرہ گناہوں سے نہیں بچتے اور فحاشی کو پسند کرتے ہیں۔ بدعات و خرافات

سے دور رہنا اور ایسے لوگوں سے دور رہنا جو ان کاموں کو پسند کرتے ہیں اور ان کو بجالاتے ہیں۔

اپنے ملک میں جہاد کے جھنڈے کو کبھی سرنگوں نہ ہونے دینا، بیت المال کی حفاظت کرنا، اس میں سے بے جا خرچ نہ کرنا اور ہاں خبردار! کبھی بھول کر بھی اپنی رعیت کے مال و دولت کی طرف نہ دیکھنا، البتہ اسلام کی اجازت کے مطابق اس میں تصرف کر سکتے ہو، نیز محتاجوں کی روزی کا بندوبست کرنا، حقداروں پر خرچ کرنا اور ان کی عزت وتکریم کرنا۔"

گھر سے مسجد تک

عزیز بہنو، بیٹیو، اور بھائیو! ایک حدیث شریف پڑھتے ہیں جسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے اور راوی ہیں سہل بن سعد الساعدی۔

اللہ کے رسول ﷺ اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے۔ دیکھا گھر پر حضرت علی ؓ موجود نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

«أَيْنَ ابْنُ عَمِّكِ؟» .

”تمہارے چچا کے بیٹے کدھر ہیں؟“

حضرت فاطمہ ؓ نے جواب دیا:

«كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ شَيْءٌ فَغَاضَبَنِي فَخَرَجَ، وَلَمْ يَقِلْ عِنْدِي».

”میرے اور ان کے درمیان کچھ اَن بن ہو گئی تھی، چنانچہ وہ مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے اور میرے پاس قیلولہ نہیں کیا۔“

اللہ کے رسول ﷺ نے کسی شخص سے کہا:

«انْظُرْ أَيْنَ هُوَ». ”دیکھو علی کہاں ہیں؟“

وہ آدمی گیا اور آ کر بتایا: اے اللہ کے رسول! وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، دیکھا حضرت علی ؓ مسجد میں لیٹے ہوئے ہیں۔ حضرت علی ؓ کی چادر ان کے پہلو سے اتر گئی تھی اور جسم کو مٹی لگ گئی تھی۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «قُمْ يَا أَبَا تُرَابٍ، قُمْ يَا أَبَا تُرَابٍ».

”اٹھو، اے ابو تراب! اٹھو، اے ابو تراب!“ (1)

---

(1) بخاری (441)، مسلم (2409)۔

حضرت سہل بن سعد ؓ کہتے ہیں کہ (پھر) حضرت علی ؓ کی سب سے پسندیدہ کنیت ابوتراب (ہوگئی) تھی۔

حضرت علی ؓ حضرت فاطمہ ؓ سے ناراضی کے سبب گھر سے نکلے تھے۔ وہ گھر سے اس لیے نکل گئے تا کہ دونوں کو اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے اور غور وفکر کا موقع مل جائے۔

ذرا غور فرمائیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کس قدر حکمت اور دانشمندی سے کام لیا کہ آپ نے فوراً حضرت علی ؓ کو تلاش کیا۔ جب پتا چلا کہ وہ مسجد کے اندر ہیں تو اسی وقت ان کے پاس پہنچے اور بڑے ہی پیارے انداز میں ان کو پکارا: ”يَا أَبَا تُرَابٍ!“ ان سے ہرگز یہ نہیں پوچھا کہ گھر میں کیا جھگڑا ہوا ہے؟ اس کی تفاصیل کیا ہیں؟ کون سچا ہے‘ اس کا سبب کیا ہے؟ وغیرہ۔

ادھر فاطمہ زہرا ؓ کے اسوہ کو بھی دیکھیں اور غور فرمائیں۔ والد گھر پر آئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ہرگز اپنے اختلاف کی تفصیل بیان نہیں کی کہ خاوند کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ بس اتنی بات کہی:

«كَانَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ شَيْءٌ فَغَاضَبَنِي فَخَرَجَ وَلَمْ يَقِلْ عِنْدِي»

”میرے اور ان کے درمیان کچھ ان بن ہوگئی تھی چنانچہ وہ مجھ سے ناراض ہوکر گھر سے چلے گئے اور میرے پاس قیلولہ نہیں کیا۔“

لہٰذا اے میری بیٹیو‘ بہنو‘ عزیز بھائیو! اللہ کے رسول ﷺ سے اپنے گھر کے مسائل کے حل کے بارے میں سیکھو ...... اور ہاں ذرا فاطمہ ؓ اور حضرت علی ؓ کا بہترین اسوہ یاد رکھنا، اس کو بھول نہ جانا!

عظیم سخاوت

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ عراق کے شہر ''مرو'' میں قیام پذیر تھے۔ اکثر و بیشتر حج کرتے۔ ان کے عزیز، رشتہ دار اور دوست اس بات کی تمنا کرتے کہ ان کے ہمراہ حج کے لیے جائیں۔ خود مخیرؒ تھے۔ حجاج پر خوب خرچ کرتے۔ ایک سال حج کے موقع پر لوگ ان کے پاس آئے اور عرض کیا: حضرت! آپ حج پر جانا چاہتے ہیں، ہمیں بھی ساتھ لے لیں۔ فرمایا: ٹھیک ہے اپنا زادِراہ میرے پاس جمع کروادو۔ ان کا زادِراہ لے لیا اور اس کو ایک بڑے صندوق میں ڈال کر تالا لگا دیا۔ پھر کرایہ پر سواریاں لے کر مرو سے بغداد تک گئے، اس دوران سارے قافلے کو عمدہ کھانا پینا مہیا کیا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے پھل اور حلوہ جات مہیا کیے، یہاں تک کہ بغداد پہنچ گئے۔ پھر قافلے کو لے کر پوری شان و شوکت کے ساتھ بغداد سے نکلے اور مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ ہر ایک کو فرداً فرداً بلوا کر پوچھا کہ تمہارے گھر والوں نے مدینۃ الرسول سے کیا تحفے تحائف لانے کے لیے کہا تھا؟

لوگ بتلانے لگے کہ فلاں فلاں چیز لانے کے لیے کہا تھا۔ ان کو وہ چیزیں خرید کر دے دیں۔ اسی طرح مکہ مکرمہ پہنچے، حج کے بعد پھر فرداً فرداً ہر ایک سے پوچھا کہ مکہ مکرمہ سے تمہارے گھر والوں نے تم سے کیا کیا تحائف لانے کے لیے کہا تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ فلاں فلاں چیز، تو ہر ایک کو اس کی پسند خرید کر دے دی، مکہ سے مرو تک وہ مسلسل اخراجات کرتے رہے۔ جب ادائیگی حج کے بعد مرو واپس آئے اور دو تین دن کے بعد حجاج کی تھکاوٹ دور ہوگئی تو ایک بڑی دعوت کی اور تمام حجاج کو کپڑے بھی دیے۔ اس کے بعد انھوں نے صندوق منگوا کر اسے کھولا اور اس میں سے ہر آدمی کی زادِراہ والی تھیلی نکالی جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا وہ اس کو واپس کر دی۔ (1)

یہ تھی ہمارے سلف صالحین کی عظیم سخاوت اور اعلیٰ اخلاق و کردار کی ایک مثال۔

---

(1) دیکھئے: سیر أعلام النبلاء (386,385/8)۔

نیند اور موت

امام ابو حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا: حضرت! ہم علمائے کرام سے عذابِ قبر کے بارے میں سنتے ہیں کہ میت کو اس کے گناہوں کی بدولت قبر میں عذاب ہوتا ہے۔ بعض ایسے مواقع آتے ہیں کہ قبر کو دوبارہ کھودنا پڑتا ہے، تو ہمیں عذاب کی کوئی قسم یا اس کی کوئی علامت تو نظر نہیں آتی۔ مثلاً نہ تو آگ نظر آتی ہے، نہ ہی کوئی سانپ اور نہ ہی بچھو، اس کا سبب کیا ہے؟

انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے سر جھکایا، غور و فکر کیا اور فرمایا:

کبھی کبھار آپ نے سوتے ہوئے آدمی کو دیکھا ہوگا کہ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ کبھی دیکھتا ہے کہ قاتل اس کی تلاش میں ہے۔ کبھی سانپ یا بچھو کو اپنے تعاقب میں دیکھتا ہے۔ کبھی آگ لگی ہوئی ہے اور وہ اس سے بھاگ رہا ہے۔ یا جل رہا ہے اور خوف سے چیخ رہا ہے، اس کو باقاعدہ درد ہوتا ہے۔ وہ بعض اوقات چلاتا ہے مگر اس کے ساتھ کے لوگوں کو پتا نہیں چلتا کہ اس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے۔ بعض اوقات اگر ڈراؤنا خواب دیکھا تو نیند سے فوری اٹھنے کے بعد اس کی علامات بھی چہرے سے نظر آتی ہیں۔ چہرہ فق ہوتا ہے’ رنگ پیلا ہوتا ہے’ پسینہ آیا ہوتا ہے۔

یہ نیند موت کی چھوٹی سی قِسم ہے۔ قبر کی نیند تو بڑی ہے۔ قبر میں تکلیف اور عذاب اس کو ضرور ہوتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے، خواہ ہماری آنکھیں اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں۔

کامیاب حکمران

شیخ علی طنطاوی ؒ اپنی کتاب ''رجال من التاریخ'' میں لکھتے ہیں:

حضرات! ہم اس وقت ''دار الخضراء'' میں کھڑے ہیں۔ یہ عظیم الشان محل جو اموی خلافت کے وقار اور سطوت کا امین ہے۔ ہجرت کا 86 واں سال ہے۔ ولید بن عبدالملک ؒ کی حکومت ہے۔ اس شخصیت نے ایسے کارنامے سرانجام دیے ہیں کہ خواب محسوس ہوتا ہے۔ اس نے ایسا اجتماعی نظام امتِ اسلامیہ کو دیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک رسی میں پرو دیا ہے۔

فقر و فاقہ، بیماری اور جہالت پر قابو پایا گیا، دائمی مریضوں کی لسٹیں تیار کی گئیں، ایسے مریضوں کے لیے ان کے گھروں میں خادم مہیا کیے گئے جو ان کے لیے ہمہ وقت خدمت سرانجام دیتے تھے۔ ان کی تنخواہ سرکاری خزانے سے دی جاتی۔ نابینا لوگوں کے لیے ہمہ وقت ساتھ رہنے والے خادم مقرر کیے گئے۔ یہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ یتیم بچوں کے لیے مفت سکول کھولے گئے۔ ان کے تمام کھانے پینے کے اخراجات حکومت کے ذمہ تھے۔ جہالت اور ناخواندگی کے خلاف مہم چلائی گئی۔ علماء کے بھاری وظیفے مقرر کیے گئے۔ ملک بھر میں بھیک مانگنے پر پابندی تھی۔ کہیں کوئی بھکاری نظر نہیں آتا تھا۔ فقراء، عاجزوں اور پناہ گزینوں کے لیے وظائف اور تنخواہیں مقرر کی گئیں؛ تاکہ وہ اطمینان سے اپنی زندگی گزاریں اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔

قارئین! اس بات کو ذہن نشین کرلیں کہ ان کی خلافت کا دائرہ کوئی معمولی نہ تھا۔ آج کے تمام عرب ممالک اور افریقہ کے بعض ممالک ان کی قلمرو میں شامل تھے۔

اور ہاں یہ 7 ویں صدی عیسوی کی بات ہے 21 ویں صدی کی نہیں۔

کاتب وحی کی ذہانت

امیر المومنین حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی پوری زندگی نہایت سادگی سے گزاری۔ باوجودیکہ دنیا کے ایک بڑے حصے کے حکمران تھے مگر شان وشوکت ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ چونکہ خود اپنے نفس پر بڑی حد تک قابو تھا، اس لیے تمام گورنر اور مختلف علاقوں کے امراء بھی ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنے عہدِ خلافت میں ملک شام تشریف لے گئے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وہاں کے گورنر تھے۔ وہ ایک عالیشان جلوس کے ساتھ، بڑی شان وشوکت سے ان کے استقبال کے لئے نکلے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بڑا تعجب ہوا، بے اختیار بول پڑے:

«هَذَا وَاللهِ هُوَ كِسْرَى الْعَرَبِ»

”اللہ کی قسم! یہ عرب کا کسریٰ ہے۔“

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر ناراض بھی ہوئے کہ یہ میں کیا منظر دیکھ رہا ہوں؟

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا جواب نہایت ذہانت سے دیا۔

عرض کیا: امیر المومنین! ہم ایک ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں دشمن کے بہت سے جاسوس ہیں۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر اپنی دھاک بٹھائے رکھیں تاکہ وہ مسلمانوں سے خوف زدہ رہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی شان وشوکت کا اظہار کریں، اسلحے کی نمائش کریں اور فوجی پریڈ ہو وغیرہ وغیرہ تاکہ دشمن ہمارے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ اب آپ کی مرضی ہے، اگر

آپ مجھے حکم دیں تو میں رک جاؤں اور ایسا نہ کروں، اور اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اس کام کو جاری رکھوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر بات وہی ہے جیسا کہ آپ نے بیان کیا ہے تو پھر آپ کا جواب بہتر اور تشفی بخش ہے۔ اور اگر درست نہیں ہے تو:

«فَإِنَّهُ لَخُدْعَةُ أَدِيبٍ»

”تو پھر یہ ایک ادیب کی دھوکہ بازی ہے۔“

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: امیر المومنین! تو پھر مجھے واضح حکم دیجیے۔

عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«لَا آمُرُكَ وَلَا أَنْهَاكَ».

”نہ تو میں تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ ہی اس سے روکتا ہوں۔“ (1)

---

(1) دیکھیے: کتاب الأذکیاء، ابن جوزی۔

صحرا کا بیٹا

اس بات کو کئی صدیاں گزر چکی ہیں، روم کے ایک عالیشان محل کے کشادہ کمرے میں ایک پادری رئیسِ قبیلہ کے ساتھ محوِ گفتگو ہے۔ گفتگو کا محور عیسائیت ہے کہ رفتہ رفتہ اس کے مخالفین میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور بے شمار لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کا انکار کرنے لگے ہیں۔ اچانک پادری نے پرجوش انداز میں کہنا شروع کیا:

”جزیرۂ عرب کے شہر مکہ میں ایک نبی کے ظہور کا وقت قریب آ چکا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کی تصدیق کریں گے اور لوگوں کو ظلم و ستم سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائیں گے۔“

یہ گفتگو ان کا ایک غلام بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ گفتگو سنتا گیا، اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑتی چلی گئی۔

اس نوعمر غلام کے چہرے سے ذہانت و متانت ٹپکتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ وہ اس معاشرے سے بخوبی واقف تھا جس میں سوائے فحاشی، عریانی، بے حیائی اور ایک دوسرے پر ظلم و ستم ڈھانے کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ پہروں بیٹھ کر سوچا کرتا کہ آخر وہ کب تک غلامی کی زندگی بسر کرتا رہے گا؟ وہ ان ہزاروں غلاموں میں سے ایک تھا جن کو زبردستی پکڑ کر بازارِ غلاماں میں بیچ دیا گیا تھا۔ کبھی کبھار اس کو اپنا ماضی یاد آتا، اپنی مادری زبان یاد آتی جس کو وہ آہستہ آہستہ بھول رہا تھا اور رومیوں کی زبان اس کی مادری زبان پر غالب آ رہی تھی۔ اب اس کی عمر 30 سال سے اوپر ہو چلی تھی، بھر پور جوانی اس سے بار بار مطالبہ کرتی تھی کہ وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ

ڈالے، آخر وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا تھا جو کبھی ایک بستی پر حکمران تھا۔

وہ اس دن کو کبھی نہیں بھول سکا تھا کہ جب وہ اپنی والدہ کے ہمراہ سیر وتفریح کے لیے فرات کے کنارے کسی بستی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا والد سنان النمیری ایران کے بادشاہ کسریٰ کی جانب سے عراق کی ایک بستی کا گورنر تھا اور خالص عربی النسل تھا۔ اس کی والدہ بھی عرب کے مشہور قبیلے بنی تمیم سے تعلق رکھتی تھی۔ والدہ کی طرح اس کا باپ بھی اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ گورنر کا بیٹا ہونے کے ناطے اس کا بچپن بڑا خوبصورت اور خوب ناز ونعم میں گزرا تھا۔ بچپن سے وہ تیر اندازی کا ماہر تھا' تلوار کے کرتب دکھاتا اور دوڑ میں اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جاتا۔

اس کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی مگر وہ اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے اپنی عمر سے سے کہیں بڑا نظر آتا تھا۔ اس زمانے میں وقت کی دو بڑی طاقتوں ایران اور روم میں مسلسل لڑائی رہتی تھی۔ کبھی ایک کا پلہ بھاری ہو جاتا' کبھی دوسرے کا۔ ایک دوسرے کے علاقوں میں شب خون مارے جاتے' مال ومتاع لوٹ لیا جاتا، عورتوں کو لونڈیاں اور مردوں کو غلام بنا لیا جاتا۔

اس نوجوان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، یہ اپنے وطن سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اچانک رومی لٹیروں نے شب خون مارا' سامان لوٹ لیا' کتنے ہی قتل ہو گئے اور بقایا کو گرفتار کر کے غلام بنا لیا گیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں یہ نوجوان بھی شامل تھا جو مختلف لوگوں کے ہاتھوں بکتا بکاتا روم پہنچ گیا تھا اور اب غلامی کی زندگی گزار رہا تھا۔ مقامی زبان پر خوب دسترس حاصل ہو چکی تھی اور عربی زبان آہستہ آہستہ بھول رہا تھا۔ مگر جب وہ اپنے ماضی پر غور کرتا تو بے اختیار کہہ اٹھتا کہ میں عربی النسل ہوں اور صحرا کا بیٹا ہوں۔

یہ نوجوان جس کا تذکرہ ہم پڑھ رہے ہیں مشہور صحابیٔ رسول ﷺ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ تھے، ان کی کنیت ابو یحییٰ تھی اور ان کے بارے میں عموماً یہ تصور پایا جاتا تھا کہ وہ رومی النسل تھے۔ پادری سے اللہ کے رسول کی آمد کی بشارت سنی تو مکہ کی طرف بھاگنے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ایک لمبی جدوجہد کے بعد وہ مکہ پہنچ گئے۔ ان کے سر کے بال سرخ تھے۔ رومی زبان بھی عربی زبان پر غالب آ چکی تھی، لہٰذا مکہ والوں نے ان کا نام صہیب رومی رکھ دیا۔ مکہ کے سادات میں سے عبداللہ بن جُدعان کی کفالت میں کاروبار شروع کیا اور جلد ہی ان کا شمار امیر ترین تاجروں میں ہونے لگا۔

تجارت کے ساتھ ساتھ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اپنے مقصد کو کبھی نہیں بھولے۔ ایک دفعہ ایک لمبے تجارتی سفر پر انھیں جانا پڑا۔ جب سفر سے واپس آئے تو لوگوں نے بتایا کہ ایک شخص محمد بن عبداللہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور وہ لوگوں کو مکارمِ اَخلاق کا درس دیتے ہیں، نیکی کی دعوت دیتے اور برائی سے منع کرتے ہیں، ایک رب کی طرف بلاتے ہیں اور غیر اللہ کی پوجا سے روکتے ہیں۔

حضرت صہیب نے پوچھا: ”کہیں وہی تو نہیں جن کا نام امین ہے؟“

جواب ملا: ”ہاں وہی۔“

مزید تصدیق چاہی: ”اچھا جن کو صادق بھی کہا جاتا ہے؟“

لوگوں نے کہا: ”ہاں وہی ہیں۔“

”تو ان سے کہاں ملا جا سکتا ہے، ان کا پتا اور ٹھکانا کیا ہے؟“ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے پوچھا۔ اللہ کے رسول ﷺ ان دنوں صفا پہاڑی کے دامن میں واقع ارقم بن ابی ارقم کے گھر (دارِ اَرقم) کو اسلام کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم کے لیے خاموشی سے استعمال کر رہے تھے۔ کسی بہی خواہ نے پتا بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ ذرا دیکھ بھال کر

جانا، کہیں قریش کو پتا نہ چل جائے۔ کیونکہ وہ اس دعوت کے سخت مخالف ہیں اور اگر اسلام قبول کرنے والے کا طاقتور قبیلہ نہ ہو یا غلام اور کمزور ہو تو اسے خوب مارتے اور تنگ کرتے ہیں۔ اور پھر ایک دن حضرت صہیب دارِ ارقم پہنچ گئے۔

گھر میں داخل ہونے لگے تو عمار بن یاسر نظر آئے۔ پوچھا: ''عمار، تم یہاں کہاں؟''

عمار نے پوچھا: ''آپ کہاں؟''

دراصل دونوں کی منزل ایک ہی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور اکٹھے ہی بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں داخل ہوئے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے دونوں کو گلے لگایا اور اکٹھے ہی کلمہ پڑھایا؛ چنانچہ یہ دونوں عظیم شخصیات ایک ہی دن، ایک ہی وقت میں اسلام لائیں۔

سیرت کے قارئین کے لیے دورِ مکی کی آزمائشوں اور تکالیف کا تذکرہ ضروری نہیں ہے۔ تاہم جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ کمزوروں‘ غلاموں‘ یتیموں اور بے قبیلہ لوگوں پر قریش کا خوب زور چلتا تھا‘ اس ضمن میں حضرت صہیب رومی ؓ نے وافر حصہ پایا اور بے پناہ طور پر ستائے گئے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں کو پہلے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے لیے اذنِ عام دیا۔ لوگ رفتہ رفتہ جیسے جیسے حالات اجازت دیتے‘ ایک ایک کر کے مکہ سے ہجرت کرتے گئے۔ حضرت صہیب ؓ کی دلی خواہش تھی کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی معیت میں ہجرت کریں مگر اللہ تعالیٰ کو ابھی ان کے ایمان کا مزید امتحان مقصود تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو باقی ماندہ مسلمانوں پر عرصۂ حیات مزید تنگ ہو گیا۔ ان میں

صہیب رومی رضی اللہ عنہ سرِفہرست تھے، یہ مالدار تو تھے مگر ان کا کوئی قبیلہ نہ تھا۔ مشرکین نے ان پر پہرے دار مقرر کر دیے کہ ہجرت نہ کرنے پائیں۔ ادھر انھوں نے جو مال کمایا تھا اس کو سونے، چاندی کی صورت میں جمع کر کے گھر کے کونے میں دفن کر دیا۔

اور پھر ایک سرد رات کو تیر کمان سنبھالی، تلوار گلے میں لٹکائی، پہرے داروں کو چکما دیا اور مدینے کی راہ پر چل دیے۔ پہرے داروں کو جب احساس ہوا کہ صہیب رضی اللہ عنہ نکل چکے ہیں تو فوراً پیچھا کیا۔ اتنے میں صبح نمودار ہو چکی تھی، چنانچہ انھوں نے صہیب رومی رضی اللہ عنہ کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ کوشش کر کے ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور اپنی کمان میں تیر چڑھا کر قریش کو للکارا:

«وَاللهِ! لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي مِنْ أَرْمَاكُمْ رَجُلًا، وَاللهِ! لَا تَصِلُونَ إِلَيَّ حَتَّى أَقْتُلَ بِكُلِّ سَهْمٍ مِنْ هَذِهِ رَجُلًا مِنْكُمْ، ثُمَّ أُقَاتِلَكُمْ بِسَيْفِي حَتَّى أُقْتَلَ».

"اللہ کی قسم! تم لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ میں تم سب سے زیادہ ماہر تیر انداز ہوں اور میرا نشانہ بڑا زبردست ہے۔ اللہ کی قسم! تم میری طرف بڑھنے کی غلطی کرو گے تو میں اپنے ایک ایک تیر سے تمہارے ایک ایک آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا (کیونکہ تم سب میرے تیروں کی زِد میں ہو)، پھر جو بچ گئے ان کا اپنی تلوار سے مقابلہ کروں گا، تا آنکہ میں قتل ہو جاؤں۔"

قریش میں سے ایک بولا: دیکھو صہیب! ایسا ممکن نہیں کہ تم اپنا مال اور جان دونوں سلامتی کے ساتھ مدینے لے جاؤ۔ تم اپنے ماضی کو فراموش کر بیٹھے، تم تو مکہ میں فقیر، مفلس اور قلاش ہو کر آئے تھے۔ یہاں تم نے بہت کچھ کمایا، کاروبار کیا اور مال دار بن گئے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے ان کی گفتگو سنی، ذرا سا تأمل کیا اور پوچھا: اگر میں

تمھیں اپنا سارا مال دے دوں تو میرا راستہ چھوڑ دو گے؟

انھوں نے کہا: ہاں!

آپ نے ان کو دفینے والی جگہ بتائی اور انھوں نے آپ کا راستہ چھوڑ دیا۔

حضرت صہیب ؓ نے ساری زندگی کی کمائی اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کی خاطر لٹا دی۔ اب وہ تھے اور مدینے کا سفر تھا۔ خواہش یہی تھی کہ جلد از جلد اللہ کے رسول ﷺ کے قدموں میں پہنچ جائیں۔ سفر میں تھکاوٹ محسوس ہوتی تو اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کو دل میں تازہ کر لیتے اور تازہ دم ہو کر پھر چل پڑتے۔ اللہ کے رسول ﷺ ابھی قبا میں ہی مقیم تھے کہ حضرت صہیب ؓ پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھی کا والہانہ استقبال کیا، محبت سے گلے لگایا اور تین مرتبہ فرمایا:

«رَبِحَ الْبَيْعُ أَبَا يَحْيَىٰ».

”ابو یحیٰ، تجارت نہایت کامیاب رہی۔“(1)

حضرت صہیب کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور انھوں نے فوراً کہا: اللہ کی قسم! اس واقعے کا میرے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا، یہ یقیناً حضرت جبریل آپ کو بتا کر گئے ہیں۔

اللہ رب العزت کو اپنے بندے پر پیار آ گیا اور جبریل امین آسمان سے وحی لے کر آ گئے:

﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشۡرِي نَفۡسَهُ ٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ ٱللَّهِۚ وَٱللَّهُ رَءُوفُۢ بِٱلۡعِبَادِ ٢٠٧﴾

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی طلب میں اپنی جان

---

(1) البداية والنهاية (434/4) و (670/10). دارهجر قاهره۔

تک بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑی شفقت کرنے والا ہے۔'' (1)

حضرت صہیب ؓ کا صحابہ کرام میں نہایت اعلیٰ مقام و مرتبہ تھا‘ اللہ کے رسول ﷺ بھی ان سے خوب محبت فرماتے۔ بعض اوقات ہنسی مذاق کی نوبت بھی آ جاتی‘ لیکن یہ ایک اسلامی معاشرے کا لطیف مزاح ہوتا۔

ایک مرتبہ حضرت صہیب ؓ کی آنکھ دکھ رہی تھی۔ آنکھ میں درد اور سامنے تازہ کھجوروں کا خوشہ‘ وہ چن چن کر کھا رہے تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے متبسم نگاہوں سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے فرمایا:

«أَتَأْكُلُ الرُّطَبَ وَفِي عَيْنِكَ رَمَدٌ؟».

''صہیب، تمہیں تو آشوب چشم ہے‘ اس کے باوجود کھجوریں کھا رہے ہو؟''

فوراً عرض کیا: میں بیمار آنکھ کی طرف سے نہیں بلکہ دوسری آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں (جس میں درد نہیں ہے)۔ (2)

حضرت صہیب ؓ نہایت نڈر اور دلیر تھے۔ محبت رسول ﷺ سے سرشار تھے۔ اپنی زندگی کے بارے میں خود فرماتے ہیں: ''اللہ کے رسول ﷺ جس میدانِ جنگ میں بھی تشریف لے گئے‘ میں آپ کے ہمراہ ہوتا تھا۔ جب کبھی آپ نے کسی سے بیعت لی‘ میں وہاں حاضر ہوتا تھا۔ کوئی بھی فوجی دستہ حرکت میں آتا‘ میں اس کے ساتھ جاتا۔ آپ کسی بھی غزوے میں شریک ہوتے‘ میں ہمیشہ آپ کے دائیں بائیں ہوتا۔ مسلمانوں کو کہیں سے کوئی خوف و خطرہ

---

(1) البقرة: 207

(2) ابن ماجه (3443)۔

محسوس ہوتا تو میں ہمیشہ اس کو ٹالنے میں سبقت کرتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دشمن کو اللہ کے رسول ﷺ کے قریب پھٹکنے دیا ہو۔"

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ اتنے سخی تھے کہ جو مال بھی ملتا اس کو مستحقین میں تقسیم فرما دیتے۔ دستر خوان نہایت وسیع تھا۔ مسکین، یتیم، قیدی، مسافر سبھی شریکِ طعام ہوتے، وہ نبی ﷺ کے اس فرمان پر عمل پیرا رہتے تھے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

«أَيُّهَا النَّاسُ أَفْشُوا السَّلَامَ وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ».

"اے لوگو! آپس میں خوب سلام پھیلایا کرو اور کثرت سے کھانا کھلایا کرو۔"(1)

حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو آپ نے اپنے مصلّٰی پر حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو کھڑا کیا۔ بلکہ حکماً فرمایا کہ لوگوں کو نماز صہیب رومی رضی اللہ عنہ پڑھائیں، حالانکہ اس وقت دوسرے کبار صحابہ کرام موجود تھے۔

آپ کا انتقال مدینہ منورہ میں ۳۸ھ میں ہوا۔

---

(1) ترمذی (2485)، إرواء الغليل (239/3)۔

امیر ہو تو ایسا!

مصعب بن احمد کہتے ہیں کہ ابو محمد مروزی بغداد آئے۔ ان کا قصد مکہ مکرمہ کی طرف تھا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ان کے ساتھ سفر کروں۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ سفر میں مجھے بھی ہمراہ لے جائیں۔ مگر انھوں نے بوجوہ انکار کر دیا اور کہا کہ پھر کبھی دیکھیں گے۔ اصل میں میرا ارادہ حج کا تھا۔ میری خواہش تھی کہ نیک آدمی کے ساتھ سفر کروں۔ لہٰذا اگلے سال پھر میں نے درخواست کی لیکن قبول نہ ہوئی۔ تیسرے سال پھر حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے بھی سفر میں شریک کر لیں۔ اس سال انھوں نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا مگر ساتھ ایک شرط عائد کی کہ ہم میں سے ایک امیرِ سفر ہوگا اور دوسرا اس کی اطاعت کرے گا۔ میں نے کہا: پھر آپ ہی امیر ہوں گے۔ کہنے لگے: نہیں تم امیرِ سفر ہو گے۔ میں نے کہا: نہیں آپ مجھ سے عمر میں زیادہ اور علم و فضل میں افضل ہیں، لہٰذا آپ امیر ہوں گے۔ کہنے لگے: درست ہے مگر دورانِ سفر تمہیں میری اطاعت اور فرمانبرداری کرنا ہوگی۔ میں نے عرض کیا: آپ کی شرط منظور ہے۔

اب ہمارا سفر شروع ہوا۔ جب کھانے کا وقت آتا تو وہ مجھے ترجیح دیتے اور ایثار کرتے۔ جب میں اس پر اعتراض کرتا تو فرماتے: میری شرط یاد کرو، تم نے وعدہ کیا تھا کہ میری مخالفت نہیں کرو گے۔ اسی طرح وہ ہر مقام پر ہر وقت اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتے اور مجھے سہولت مہیا کرتے، حتیٰ کہ میں خاصا شرمندہ ہو جاتا۔

ایک دن راستے میں شدید بارش شروع ہوگئی۔ سردی کا موسم تھا۔ کہنے لگے:

ابواحمد! بارش شروع ہوگئی ہے، ذرا رکتے ہیں۔ چنانچہ ہم رک گئے۔ انھوں نے موٹی اونی چادر نکالی، اس سے میرے سر پر چھتری کر دی اور مجھے حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیٹھا رہا۔ خود وہ سردی برداشت کرتے رہے اور بارش سے ان کے کپڑے بھیگ گئے۔ اب میں پچھتا رہا تھا اور بار بار اپنے آپ کو کوستا تھا کہ ان کے ہمراہ کیوں نکلا تھا۔ خود انھوں نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالے رکھا اور مکہ مکرمہ پہنچنے تک انھوں نے میری اتنی زیادہ خدمت کی کہ مجھے بار بار شرمندہ ہونا پڑا۔

یہ تھی ایک ادنیٰ سی جھلک ہمارے سلف صالحین کی۔ رحمہم اللہ اَجمعین۔

عزت والا کون؟

خلیفہ ہارون رشید کے دو بیٹے امین اور مامون، امام کسائی کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ استاد اپنی مجلس سے اٹھے تو دونوں بھائی جلدی سے استاد کو جوتے پکڑانے کے لیے لپکے۔ دونوں میں تکرار ہوگئی کہ کون استاد کے جوتے پیش کرے۔

بالآخر دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ دونوں ایک ایک جوتا پیش کر دیں۔

جب ہارون رشید کو قصے کا پتا چلا تو اس نے امام کسائی کو بلایا۔ جب وہ آئے تو ہارون نے کہا: لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟

امام کسائی نے کہا: میری رائے میں امیر المومنین سے زیادہ عزت والا کون ہوسکتا ہے!

خلیفہ نے کہا: عزت والا تو وہ ہے کہ جب وہ اپنی مجلس سے اٹھے تو خلیفہ کے دونوں صاحب زادوں میں اس بات پر جھگڑا ہو کہ ان میں سے کون استاد کو جوتے پہنائے۔

امام کسائی نے سوچا کہ شاید خلیفہ اس بات سے ناراض ہوا ہے، لہٰذا اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔

ہارون رشید نے کہا: سنیئے! اگر آپ نے میرے بیٹوں کو اس ادب واحترام سے روکا تو میں آپ سے سخت ناراض ہوجاؤں گا۔ اس کام سے ان کی عزت اور وقار میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اس میں اضافہ ہوا ہے اور ان کے اندر چھپی ہوئی فراست کا اظہار ہوا ہے کہ وہ کتنے عقلمند اور دانا ہیں۔

سنیئے! خواہ کوئی شخص کتنا ہی عمر، علم یا مرتبے میں بڑا کیوں نہ ہو، تین افراد کے سامنے بڑا نہیں ہوتا: قاضی، استاد اور اپنے والدین کے سامنے۔

پانچ خاص چیزیں

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي» .

”مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو اس سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں۔“

«نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ» .

”ایک ماہ کی مسافت سے دشمن پر رعب و دبدبے کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے۔“

«وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُورًا ، فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ» .

”زمین میرے لیے مسجد اور پاک کرنے والی بنائی گئی ہے، لہٰذا میری امت کے کسی بھی شخص کو نماز کا وقت آ لے تو وہ نماز پڑھ لے۔“

«وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ ، وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي» .

”میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال کر دیا گیا ہے۔ جبکہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں تھا۔“

«وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ» .

”مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔“

«وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً» .

”پچھلے نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جب کہ مجھے تمام کائنات کے لیے رسول بنایا گیا ہے۔“ (1)

---

(1) بخاری (335)، مسلم (521)۔

ابو دجانہ ؓ کی شجاعت

حضرت ابو دجانہ ؓ بڑے بہادر، دلیر اور میدانِ جنگ میں اگلی صفوں میں لڑنے والے مجاہد تھے۔ ان کا نام سماک بن اوس بن خرشہ ہے۔ غزوۂ احد میں ان کے بہادری کے کارنامے اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں۔ انھوں نے بدر واُحد کے علاوہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تمام جنگوں میں شرکت فرمائی۔ اُحد کے دن رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يَأْخُذُ هَذَا السَّيْفَ بِحَقِّهِ؟».

”اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا؟“

لوگ اس کے لیے آگے بڑھے لیکن آپ نے انھیں تلوار نہیں دی۔ اتنے میں ابو دجانہ ؓ کھڑے ہوئے اور پوچھا:

«وَمَا حَقُّهُ؟» ”اس کا حق کیا ہے؟“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْ تَضْرِبَ بِهِ فِي الْعَدُوِّ حَتَّى يَنْحَنِيَ»

”حق یہ ہے کہ اس سے دشمن کو اتنا مارو کہ یہ ٹیڑھی ہو جائے“ (اور دشمن دم دبا کر بھاگ جائے)۔

چنانچہ ابو دجانہ ؓ نے آگے بڑھ کر رسولِ اکرم ﷺ کے ہاتھ سے تلوار لی اور لال پٹی سر پر باندھ کر اکڑتے ہوئے دشمن کی صف میں جا گھسے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی چال دیکھ کر فرمایا:

«إِنَّهَا لَمِشْيَةٌ يُبْغِضُهَا اللهُ إِلَّا فِي سَبِيلِ اللهِ، مِثْلَ هَذَا الْمَوْطِنِ».

”یہ ایسی چال ہے جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، مگر اس مقام پر نہیں۔“

اللہ کے رسول ﷺ کی وفات کے بعد کئی قبائل اسلام سے مرتد ہو گئے اور مسیلمہ کذاب ان کا لیڈر بن گیا، چنانچہ ان مرتدین نے زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ مرتدین کی سرکوبی کے لیے جو لشکر روانہ ہوا، اس میں حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یمامہ کے مقام پر بنوحنیفہ کے مرتدین سے جو جنگ ہوئی، اس میں ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے بہادری کے وہی جوہر دکھائے جو رسالت مآب ﷺ کے دور میں دکھائے تھے۔

یمامہ میں ایک بڑے باغ کے درمیان قلعہ تھا جس میں مرتدین جمع تھے، وہ قلعہ بند ہو کر لڑائی کر رہے تھے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی شخص قلعہ کے اندر کود جائے اور قلعے کا دروازہ کھول دے تاکہ مجاہدین قلعے میں داخل ہو سکیں۔

ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کسی طرح مجھے اٹھا کر قلعے کے اندر اتار دو تاکہ میں دروازہ کھول سکوں۔ ساتھیوں نے تامل کیا کہ انھیں اکیلا دشمن کے نرغے میں چھوڑا جائے۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے بڑے زور سے اپنے مطالبے کو دہرایا۔ جب ادھر سے انکار رہا تو سخت ناراض ہوئے اور ساتھیوں کو مجبور کیا کہ انھیں لازماً قلعہ کے اندر اتارا جائے۔ چنانچہ سپاہیوں نے ان کو اٹھا کر قلعے میں اتارا۔ جب انھوں نے دیوار سے چھلانگ لگائی تو ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ مگر ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے ٹانگ کی قطعاً پروانہ کی۔ اپنی تلوار اٹھائی اور مرتدین سے اکیلے ہی قلعے کے اندر لڑائی شروع کر دی۔ وہ لڑتے لڑتے دشمنوں کو دروازے کی طرف لے آئے اور اچانک دروازہ کھول دیا۔(1)

---

(1) أسد الغابة (92، 93)، دلائل النبوة، بیہقی (234/3)، سیرة ابن هشام (10/3)۔

ادھر مسلمان دروازہ کھلنے کے منتظر تھے۔ وہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوئے۔ ادھر ابودجانہ رضی اللہ عنہ اپنی ٹانگ کے درد کو چھپائے مسلسل لڑتے رہے۔ لڑائی کے دوران ان کی ٹانگ کثرتِ حرکت کی وجہ سے اور زیادہ خراب ہوگئی اور درد میں بے تحاشا اضافہ ہوگیا۔

ادھر مرتدین ان کی تاک میں تھے۔ بالآخر یہ بہادر مجاہد زمین پر گر پڑے۔ کثرت سے خون بہنے کی وجہ سے وہ یمامہ کی جنگ میں شہید ہوگئے اور رہتی دنیا تک تاریخ کے سنہرے اوراق میں اپنا نام رقم کرگئے، رضی اللہ عنہ۔ (1)

---

(1) دیکھئے: أسد الغابہ لابن الأثیر (551/2)۔

سب سے پہلے سفیر

وہ نہایت خوبصورت تھا، امیر والدین کا بیٹا تھا۔ نئی نئی پوشاکیں پہنتا، گفتگو میں اس قدر مٹھاس تھی کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ اتنا ذہین تھا اور باتیں اتنی مزیدار کرتا کہ ہر مجلس کی جان ہوتا۔ اس کے ساتھی اس کی آمد کا انتظار کرتے اور جب وہ مجلس میں بیٹھ جاتا تو سب خاموش اس کی طرف دیکھتے، اس کی سنتے اور سر دھنتے۔ اس کے دلائل بڑے وزنی اور زبردست ہوتے، کوئی اس سے گفتگو میں آگے نہیں نکل سکتا تھا۔

وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ جب کوئی عزم وارادہ کر لیتا ہے تو پھر کوئی اس کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا، تاہم ایک ایسی شخصیت تھی جس سے وہ خوب ڈرتا تھا اور اس کے سامنے اس کی گھگھی بندھ جاتی اور یہ اس کی والدہ تھی۔ اور آج وہ اپنی والدہ، قریبی رشتہ داروں اور قوم کے اشراف کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی والدہ نے تھپڑ کھینچ رکھا تھا اور قریب تھا کہ اپنے بیٹے کو دے مارتی کہ اشراف میں سے ایک نے اسے منع کیا: ابھی ہم اس کو سمجھا دیتے ہیں۔ اتنا زیادہ غصہ نہ کرو، یہ سمجھ جائے گا۔

مگر یہ نوجوان ان سے مرعوب ہوئے بغیر ان کو نہایت دلنشیں انداز میں قرآن حکیم کی آیات سنا رہا تھا۔ والدہ خُناس بنت مالک نے اس کو خوب سمجھایا بھی تھا، ڈرایا بھی تھا، لالچ بھی دیا تھا مگر یہ کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

یہ نوجوان مکہ مکرمہ کا باسی تھا اور مؤرخین کے مطابق سب سے مہنگا اور اعلیٰ عطر استعمال کرنے والا مصعب بن عمیر تھا، اسے اسلام کا پہلا سفیر بننے کی سعادت

حاصل ہوئی۔ اگر آپ سیرتِ پاک کا بغور مطالعہ کریں تو اللہ کے رسول ﷺ کی بے شمار خوبیوں میں ایک بات یہ بھی نمایاں تھی کہ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیتے تھے۔ جس کے اندر جو صلاحیت ہوتی، اس کے مطابق اس سے کام لیا جاتا۔

دیگر بہت سارے نوجوانوں کی طرح مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے بھی محمد الامین الصادق کے بارے میں سنا کہ وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو پوری کائنات کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

صفا پہاڑی کے دامن میں واقع دارِ ارقم اس دعوت کا مرکز تھا۔ لوگ وہاں جمع ہوتے، تزکیہ نفس ہوتا، قرآن سیکھا جاتا اور نمازیں ادا کی جاتیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چوری چھپے اس دعوت کو آگے پھیلا رہے تھے۔

مکہ مکرمہ اس زمانے میں کوئی بہت بڑا شہر نہیں تھا' وہاں کسی قسم کی سرگرمیاں کیسے خفیہ رہ سکتی تھیں جب کہ قریش مکہ بطور خاص مسلمانوں پر گہری نظریں رکھے ہوئے تھے۔

ایک دن عثمان بن طلحہ نے اپنی آنکھوں سے مصعب رضی اللہ عنہ کو دارِ ارقم میں داخل ہوتے دیکھا اور پھر کسی دوسرے دن دیکھا کہ محمد ﷺ جیسی نماز پڑھ رہا ہے۔ اُمِ مصعب تک یہ خبریں مسلسل پہنچ رہی تھیں۔ اس نے اپنے لخت جگر کو رسیوں سے باندھا' مارا اور سارے طریقے آزمائے۔ ادھر مسلمان حبشہ کی طرف ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ مصعب بھی اپنی والدہ کو جل دے کر اسی قافلے میں شامل ہو گئے۔

کچھ عرصے کے بعد پھر مکہ آ گئے' عرصۂ حیات تنگ ہوا تو دوبارہ حبشہ چلے گئے اور پھر ایک مختصر سی مدت کے بعد واپس مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ ماں نے اپنی سختی

برقرار رکھی اور ساری سہولتیں واپس لے لیں۔

ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کے رسول ﷺ کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے کہ مصعب آ گئے۔ آج ان کی پوشاک ٹاٹ کی تھی، بمشکل ستر چھپایا ہوا تھا۔ کہاں وہ خوش لباس اور مہنگا عطر استعمال کرنے والا مصعب اور کہاں یہ حالت، صحابہ کرام کی آہیں نکل گئیں۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے ساتھی کی طرف شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر فرمایا: میں نے مصعب کو اسلام لانے سے پہلے بھی دیکھا ہے۔ پورے مکے میں اس سے زیادہ والدین کا لاڈلا کوئی نہ تھا، ساری سہولتیں اور آسائشیں اس کو میسر تھیں مگر اس نے یہ ساری نعمتیں اللہ اور اس کے رسول کے لیے قربان کر دیں۔

ماں نے آخری حربے کے طور پر اسے پھر قید کرنے کا پروگرام بنایا، حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا:

جس کسی نے مجھے رسیوں سے باندھنے میں تمہاری مدد کی، میں اس کو قتل کر دوں گا۔

والدہ کو اپنے بیٹے کے عزم اور ارادے کا خوب اندازہ تھا۔ چنانچہ اس نے روتے ہوئے اپنے بیٹے کا راستہ چھوڑ دیا۔ بیٹے نے گھر پر الوداعی نظر ڈالی اور پھر ماں کے راستے میں کھڑا ہو گیا اور نہایت پیار سے بولا:

”پیاری اماں! میں تمہارا نہایت ہمدرد اور خیر خواہ ہوں، بس ایک مرتبہ اپنی زبان سے «لا إله إلا الله محمد رسول الله» کی شہادت دے دو۔“

ماں نے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور کہا: ستاروں کی قسم! جب تک میری عقل اور ہوش وحواس کام کرتے ہیں، میں تمہارے مذہب میں کبھی داخل

نہ ہوں گی۔

بیٹے کے دل پر اس گفتگو کو سننے کے بعد کیا گزری ہوگی؟ پریشان حال اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آتے ہیں اور ادھر اللہ کے رسول ﷺ اپنے اس پیارے ساتھی کو ایک ایسی ذمہ داری سونپتے ہیں جو اس سے قبل کسی کو میسر نہ آئی تھی۔ مدینہ منورہ کے کچھ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کی تربیت، اور اسلام کی تعلیمات کو مزید پھیلانے کے لیے سفیر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس عہدے کے لیے حضرت مصعب ابن عمیر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا گیا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے گھر قیام فرمایا اور دونوں نے مل کر اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مصعب نہایت خوش شکل، عقل مند اور بہترین گفتگو کرنے والے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے اعلیٰ اخلاق سے بہت سارے لوگوں کو اسلام میں داخل کر لیا۔ ایک دن اسعد بن زرارہ کے ساتھ مل کر بنی عبداشہل کے محلے میں تشریف لائے۔ وہاں ایک باغ کے اندر مرق نامی کنویں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت تک اس قوم کے دو بڑے سردار سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ سعد نے اسید سے کہا: ”دیکھو! اسعد بن زرارہ میری خالہ کا بیٹا ہے اور میں خود جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ لوگ ہمارے قبیلے کے کمزوروں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، ذرا جا کر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کردو۔“

اسید غصے کے عالم میں اس باغ میں پہنچ گئے اور گویا ہوئے: تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ ہمارے کمزوروں کو بے وقوف بنا رہے ہو۔ یاد رکھو! اگر تمھیں اپنی

جان کی ضرورت ہے تو ہم سے الگ ہی رہو۔

یہ کہہ کر انھوں نے اپنا شدید غصہ ظاہر کیا۔

اس قسم کی سخت گفتگو کے بعد حضرت مصعب ؓ نے مسکراتے ہوئے زبان کھولی: آپ ہم سے ناحق ناراض ہو رہے ہیں۔ ذرا تشریف رکھیں، ہماری بات سنیں، اگر پسند آ جائے تو قبول کر لیں، پسند نہ آئے تو چھوڑ دیں، ہم دوسرے محلے میں چلے جائیں گے۔

اسید نے کہا: یہ تم نے انصاف کی بات کہی۔ اور بیٹھ گئے۔ ادھر حضرت مصعب ؓ نے قرآن کریم کی تلاوت کی اور اس کی تشریح شروع کی اور ادھر اسید کے ذہن میں تبدیلی آنے لگی۔ ”کتنی اچھی باتیں ہیں، کیا پیارا کلام ہے یہ!“ وہ گویا ہوئے۔

اور یہ چند منٹوں کی بات تھی، سارا انداز تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ درشت کلامی اب محبت بھری باتوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ”اگر اسلام قبول کرنا ہو تو اس کی شرط کیا ہے؟“ سوال پوچھا گیا۔

”بس غسل کریں، کپڑے تبدیل کریں اور کلمۂ شہادت کی گواہی دیں“۔ انھیں جواب ملتا ہے۔

اور پھر حضرت اسید ؓ خود اسلام کے داعی بن گئے اور اسلام کی یہ روشنی سعد بن معاذ ؓ تک پہنچتی ہے، وہ بھی اسلام قبول کر لیتے ہیں، اور اسی شام اس وقت کے ایک بہترین مفکر اور سردار سعد بن عبادہ بھی اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور پھر پورے مدینے میں ایک ہی بات گشت کرنے لگی:

”اگر ان سمجھ دار، ذہین و فطین افراد اور ہمارے سرداروں نے اسلام قبول کر لیا ہے تو

اس کو قبول کرنے میں ہمارے لیے کیا ممانعت ہے؟“

چنانچہ اسی دن شام تک بہت سارے لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔

اسلام کے اس پہلے سفیر نے اپنے اخلاص' اخلاق اور جدوجہد سے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ اگلے حج سے پہلے مکہ پہنچے اور آپ ﷺ کو ساری رپورٹ پیش کی۔ قبائل کے حالات اور مدینہ منورہ کی اقتصادی و سیاسی صورت حال سے آگاہ کیا۔

اسی سال بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی اور اللہ کے رسول ﷺ کی ہجرت کی روانگی کی راہ ہموار ہوئی۔ ہجرت کے بعد غزوۂ بدر ہوا جس میں مشرکین مکہ کو شکست فاش ہوئی۔ اسلامی ریاست مضبوط ہوگئی۔ بدر میں جھنڈا انہی کے ہاتھ میں تھا۔

ابھی کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ مکہ والے ایک لشکرِ جرّار لے کر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر مہاجرین اور انصار کو جھنڈے عطا فرمائے۔ ان خوش قسمت لوگوں میں حضرت مصعب ؓ بھی شامل تھے۔ جھنڈے کا ملنا ایک بڑی سعادت ہے اور اس کی حفاظت کرنا اس سے بھی بڑی ذمہ داری! حضرت مصعب بن عمیر ؓ اس ذمہ داری کو خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ احد کے دن آپ نے اس ذمہ داری کا حق ادا کر دیا۔ مؤرخین نے اس دن حضرت مصعب ؓ کا کردار کچھ یوں بیان کیا ہے:

جنگِ احد میں جھنڈا مصعب ؓ کے پاس تھا۔ مسلمان جب تتر بتر ہوئے تو مصعب ثابت قدم رہے۔ ابن قمئہ لیثی آگے بڑھا اور اس نے آپ کے داہنے ہاتھ پر زور کا وار کیا، آپ نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا' اب اس نے بائیں ہاتھ پر تلوار کا وار کیا۔ بایاں بازو بھی کٹ گیا اور آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾.

"اور محمد ﷺ صرف اللہ کے رسول ہی ہیں، آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔"(1)

اب حضرت مصعب ؓ نے کٹے ہوئے بازوؤں کے بقایا حصوں کو سہارا دے کر جھنڈا اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب کی بار اس نے نیزے سے حملہ کیا۔ آپ کی زبان پر مسلسل قرآن پاک کی آیت تھی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾.

نیزے کی انی آپ کے سینے کے پار ہو گئی اور آپ زمین پر گر گئے اور اس کے ساتھ ہی شہید ہو گئے۔ شہادت کے وقت عمرِ مبارک چالیس سال تھی۔ جھنڈا زمین پر گرا تو حضرت علی ؓ نے آگے بڑھ کر جھنڈا سنبھال لیا۔ معرکہ ختم ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ دیگر صحابہ کے ساتھ شہداء کو الوداع کر رہے تھے۔ ان صحابہ میں حضرت مصعب بن عمیر ؓ بھی شامل تھے۔

حضرت خباب بن اَرت ؓ نے آنسوؤں کے ساتھ ان کو یوں نذرانۂ عقیدت پیش کیا:

ہم لوگوں نے محض رضائے الٰہی کی خاطر اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہجرت کی۔ اس کا اجر و ثواب اور بدلہ یقیناً اللہ تعالیٰ سے ملے گا۔ ہم میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ہجرت کا بدلہ دنیا میں بھی پایا اور کچھ ایسے تھے جن کو کوئی مادی فائدہ دنیا میں حاصل نہ ہوا، ان میں مصعب بن عمیر ؓ بھی شامل تھے۔ جب ان کو دفن کرنے لگے تو کفن میسر نہ تھا، ایک چھوٹی سی چادر تھی؛ جس کو سر پر ڈالتے تو پاؤں ننگے رہ جاتے اور پاؤں پر سرکاتے تو سر مبارک ننگا رہ جاتا۔

---

(1) آل عمران:144

رؤف رحیم پیغمبر کو خبر دی گئی۔ آپ ﷺ تشریف لائے، اپنے پیارے ساتھی کی نعش پر کھڑے ہوئے۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ، لَقَدْ رَأَيْتُكَ بِمَكَّةَ وَمَا بِهَا أَرَقُّ حُلَّةً وَلَا أَحْسَنُ لِمَّةً مِنْكَ، ثُمَّ هَا أَنْتَ ذَا، شَعِثُ الرَّأْسِ فِي بُرْدَةٍ!».

"مومنوں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ وعدے کو سچا کر دکھایا۔ مصعب! میں نے تمہیں مکے میں دیکھا تھا۔ تم سے زیادہ نفیس لباس اور تم سے زیادہ خوبصورت بال کسی کے نہیں تھے اور اس وقت میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ ایک معمولی چادر میں لپٹے ہوئے ہو۔"

پھر آپ ﷺ نے تمام شہدا کی طرف ایک نظر ڈالی اور فرمایا: "اللہ کا رسول گواہی دیتا ہے کہ تم قیامت والے دن شہدا میں اٹھائے جاؤ گے۔"

پھر آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا:

«غَطُّوا بِهَا رَأْسَهُ، وَاجْعَلُوا عَلَى رِجْلَيْهِ الْإِذْخِرَ».

"مصعب کے سر کو چادر سے ڈھانک دو اور قدموں کو اذخر گھاس سے ڈھانک دو (اور پھر قبر میں دفن کر دو)۔" رضی اللہ عنہ۔ (1)

---

(1) بخاری (4047)، أبوداود (2876)۔ حضرت مصعب کی سوانح کے لیے ملاحظہ کریں: البداية والنهاية، أسد الغابة، الاستيعاب، سير أعلام النبلاء وغيره۔

غیبی طاقت

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی تھے۔ ان کی کنیت ابو مِعلق تھی۔ وہ تجارت کرتے تھے۔ اپنا سامان خریدتے، اس کے علاوہ لوگوں کا مال لے کر مختلف علاقوں میں جاتے۔ نہایت عبادت گزار اور پرہیزگار بھی تھے۔ ایک مرتبہ سامانِ تجارت لے کر کسی شہر جا رہے تھے کہ راستہ میں انہیں ایک ڈاکو نے روک لیا۔ کہنے لگا:

«ضَعْ مَا مَعَكَ فَإِنِّي قَاتِلُكَ».

”جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے رکھ دو، کیونکہ میں تمہیں قتل کروں گا۔“

ابو مِعلق نے کہا: ٹھیک ہے، تم ڈاکو ہو تمہیں میرے مال و متاع سے غرض ہے۔ مجھے قتل کر کے تمہیں کیا ملے گا! تم میرا سامان لے لو اور مجھے جانے دو۔

ڈاکو مسکرایا اور کہنے لگا کہ دیکھو جہاں تک مال کا تعلق ہے، وہ تو میرا ہے ہی، مگر میں مال کے ساتھ صاحبِ مال کو قتل بھی کرتا ہوں۔

ابو مِعلق نے اس کو بہت سمجھایا اور قائل کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ آخر کار ابو معلق اس سے کہنے لگے:

«إِذْ أَبَيْتَ فَذَرْنِي أُصَلِّي أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ»

”ٹھیک ہے، اگر تم مجھے قتل ہی کرنا چاہتے ہو تو مجھے چار رکعت نماز پڑھنے کی اجازت دے دو۔“

ڈاکو کہنے لگا: جتنی مرضی نماز پڑھو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

ابو معلق نے وضو کیا اور نفل پڑھنے لگے، ادھر ڈاکو ان کے سر پر کھڑا ہے اور منتظر ہے، کب وہ نماز ختم کریں اور وہ ان کو قتل کر دے۔ آخری سجدہ میں انھوں نے اللہ کے حضور خصوصی دعا فرمائی:

«يَا وَدُودُ، يَا ذَا الْعَرْشِ الْمَجِيدِ، يَا فَعَّالُ لِمَا يُرِيدُ، أَسْأَلُكَ بِعِزِّكَ الَّذِي لَا يُرَامُ، وَمُلْكِكَ الَّذِي لَا يُضَامُ وَبِنُورِكَ الَّذِي مَلَأَ أَرْكَانَ عَرْشِكَ، أَنْ تَكْفِيَنِي شَرَّ هَذَا اللِّصِّ يَا مُغِيثُ أَغِثْنِي، يَا مُغِيثُ أَغِثْنِي، يَا مُغِيثُ أَغِثْنِي».

”اے بہت زیادہ محبت کرنے والے! اے بزرگ ترین عرش کے مالک! اے جو چاہے وہ کرنے والے! میں تیری اس عزت کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں جس تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی اور تیری اس سلطنت کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں جہاں ظلم وزیادتی نہیں ہوتی اور تیرے اس نور کا واسطہ دے کر تجھ سے سوال کرتا ہوں جس نے تیرے عرش کے اردگرد کو بھر رکھا ہے‘ کہ تو اس ڈاکو کے شر سے میری حفاظت فرما‘ اے فریاد رس! میری فریاد رسی فرما۔ اے پکار سننے والے! میری پکار سن۔ اے مظلوموں کا جواب دینے والے! مجھے اس ظالم سے بچا۔“

تین مرتبہ انھوں نے اس دعا کو دہرایا اور ادھر اللہ کی رحمت جوش میں آ گئی۔ ایک گھڑسوار اپنے بھالے کو سنبھالتا ہوا سیدھا اس ڈاکو کی طرف بڑھا اور آناً فاناً اس کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ پھر ابو معلق اس شہسوار کی طرف بڑھے اور اس سے پوچھا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کون ہیں؟ آج آپ کی بروقت مدد کی وجہ سے میری جان بچ گئی، ورنہ یہ ڈاکو تو مجھے قتل ہی کر دیتا۔

شہسوار نے کہا: میں چوتھے آسمان کا فرشتہ ہوں، جب تم نے پہلی مرتبہ دعا مانگی

تو میں نے آسمان کے دروازوں پر کھٹکھٹانے کی آواز سنی، جب تم نے دوسری مرتبہ دعا مانگی تو میں نے آسمان والوں کی ایک زوردار آواز سنی، جب تم نے تیسری مرتبہ دعا مانگی تو کہا گیا کہ ایک پریشان حال دعا مانگ رہا ہے۔ میں نے اللہ رب العزت سے عرض کی کہ مجھے اس کے دشمن کے قتل پر مقرر فرما دیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص وضو کرے، چار رکعت نماز پڑھے اور مذکورہ دعا پڑھے تو اس کی دعا قبول کی جاتی ہے خواہ وہ پریشان حال ہو یا نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ (1)

---

(1) دیکھیے: الاستیعاب۔ دارالکتب العلمیة (323/4 حاشیه)، أسد الغابة (289/6)۔

سوء خاتمہ

عبدالعزیز بن ابی رواد سے ابن رجب روایت کرتے ہیں: میں ایک شخص کے وقت نزع اس کے پاس موجود تھا اور اس کو کلمہ طیبہ «لا إله إلا الله» کی تلقین کر رہا تھا مگر اس کی زبان پر یہ کلمات نہیں آ رہے تھے۔ آخری جملہ جو اس کی زبان سے نکلا، وہ اس کلمہ سے انکار پر مشتمل تھا، پھر اس کی موت واقع ہوگئی۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا کہ اس کی سابقہ زندگی کیسی تھی؟ جواب ملا: وہ شراب کا عادی تھا۔

شیخ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے: گناہوں سے بچو، یہ انسان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

ربیع بن سبرہ بن معبد جہنی سے جو کہ بصرہ کے مشہور عابدوں میں سے تھے، امام قرطبی روایت کرتے ہیں: وہ ملک شام میں چند لوگوں کے پاس تھے، ایک شخص قریب المرگ تھا۔ اس سے کہا گیا کہ «لا إله إلا الله» کہو۔ وہ جواب میں کہتا تھا کہ خود بھی پیو اور مجھے بھی جام بھر دو۔ اسی طرح ایک اور شخص سے کہا گیا کہ «لا إله إلا الله» کہو۔ وہ جواب میں کہتا تھا: دس کے دو، دس کے دو۔ یہ شخص اشیاء فروخت کرتا تھا اور ہر وقت یہی کلمات کہتا رہتا تھا۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب جواب الکافی میں فرماتے ہیں کہ ایک قریب المرگ آدمی کو «لا إله إلا الله» کہنے کی تلقین کی گئی تو جواب میں اس نے کہا: آہ! آہ! میری زبان ساتھ نہیں دے رہی۔ ایک اور شخص سے کہا گیا تو وہ جواب میں شطرنج کے دو پتھروں کے نام شاہ اور رخ پکارتا تھا۔ یہ اکثر شطرنج کھیلتا تھا اور یہ الفاظ آخری وقت اس کی زبان پر تھے۔

آخری جنتی

صحیح مسلم اور مسند امام احمد میں عبداللہ بن مسعود، مغیرہ بن شعبہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کی خدمت میں عرض کیا: اے میرے رب! جنت میں سب سے کم درجہ جس شخص کا ہوگا اس کا کیا حال ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے سب سے آخر میں جنت جانے والے شخص کا حال فرمایا کہ جب اسے جہنم سے نکالا جائے گا تو وہ اس کی طرف دیکھے گا اور کہے گا:

«تَبَارَكَ الَّذِي نَجَّانِي مِنْكِ ، لَقَدْ أَعْطَانِيَ اللهُ شَيْئًا مَا أَعْطَاهُ أَحَدًا مِنَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ» .

”بڑی عزت و برکت والی ہے وہ ذات جس نے مجھے تجھ سے نجات عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی نعمت سے نوازا ہے جیسی پہلے اور بعد کے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دی۔“

وہ اسی گمان میں جہنم کے کنارے بیٹھا ہوگا کہ اچانک دور سے ایک درخت نظر آئے گا۔ وہ درخت کو دیکھ کر کہے گا:

«أَيْ رَبِّ! أَدْنِنِي مِنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ فَلِأَسْتَظِلَّ بِظِلِّهَا وَأَشْرَبَ مِنْ مَائِهَا» .

”اے میرے رب! مجھے اس درخت کے قریب کر دے تاکہ میں اس کے سائے میں بیٹھوں اور اس کا پانی پیوں۔“

اللہ فرمائیں گے:

«يَا ابْنَ آدَمَ، لَعَلِّي إِنْ أَعْطَيْتُكَهَا سَأَلْتَنِي غَيْرَهَا» .

”اے ابن آدم! اگر میں تجھے یہ سایہ نصیب کردوں تو تو غالباً مجھ سے اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز مانگے گا۔‘

وہ پختہ وعدہ کرے گا: نہیں نہیں میرے رب! اور کچھ نہیں مانگتا۔ بس صرف اس درخت کے قریب کردے۔ چنانچہ اللہ اس کو اس درخت کے قریب کردیں گے کہ اس کے سائے میں بیٹھے اس کے پھل کھائے، اس کا پانی پیے۔ اسی حال میں ہو گا کہ پہلے درخت سے بہتر ایک اور درخت نظر آئے گا۔ وہ کہے گا: اے اللہ! مجھے اس درخت کے قریب کردے تا کہ اس کا پانی پیوں اس کے سائے میں بیٹھوں۔ تیری عزت وجلال کی قسم! بس یہ دے دے مزید کچھ نہیں مانگوں گا۔

اللہ فرمائیں گے:

«يَا ابْنَ آدَمَ، أَلَمْ تَكُنْ تُعَاهِدُنِي أَلَّا تَسْأَلَنِي غَيْرَهَا؟».

”اے ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ اس درخت کے بعد کچھ اور نہیں مانگوں گا؟“

وہ کہے گا: بس اللہ! یہ دے دے اور کچھ نہیں مانگوں گا؛ چنانچہ اللہ اسے اس درخت کے قریب کردے گا۔ اسی حالت میں ہو گا کہ پہلے دونوں درختوں سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوبصورت جنت کے دروازے کے قریب ایک اور درخت نظر آئے گا، وہ صبر کی کوشش کرے گا مگر صبر کہاں! کہے گا: میرے رب! اس درخت کے قریب کردے تا کہ اس کا پانی پیوں‘ اس کے سائے تلے رہوں، اب اس کے بعد کچھ نہیں مانگوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

اے ابن آدم! کیا تو نے مجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ اس کے بعد کچھ نہیں مانگے گا؟ پھر اللہ اسے اس تیسرے درخت کے پاس کردے گا۔ جب اس تیسرے

درخت کے نیچے جائے گا تو سامنے جنت نظر آئے گی، اہل جنت کی آوازیں سنے گا، اس کی نعمتیں، اس کے محلات، اس کے باغات نظر آئیں گے، وہ ان کو دیکھتا رہے گا۔ لیکن بالآخر صبر نہ کر سکے گا اور کہے گا:

«يَا رَبِّ، أَدْخِلْنِيهَا».

''میرے پروردگار! مجھے اس جنت میں داخل کر دے!''

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

«يَا ابْنَ آدَمَ! مَا يَصْرِينِي مِنكَ؟ أَيُرْضِيكَ أَنْ أُعْطِيَكَ الدُّنْيَا وَمِثْلَهَا مَعَهَا؟»

''اے ابنِ آدم! مجھ سے تیرے تقاضے کو کون سی چیز روکے گی؟ کیا تو اس بات سے راضی ہے کہ پوری دنیا تجھے دُگنی کر کے دے دوں؟''

بندہ کہے گا:

«يَا رَبِّ! أَتَسْتَهْزِئُ مِنِّي وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ».

''میرے پروردگار! کیا تو میرا مذاق اڑا رہا ہے حالانکہ تو سارے جہاں کا پروردگار ہے؟''

غرض اس بندے سے کہا جائے گا: جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ جب داخل ہونے کے لیے جائے گا تو اسے ایسا محسوس ہوگا کہ پوری جنت بھر چکی ہے۔ چنانچہ وہ کہے گا:

«أَيْ رَبِّ، كَيْفَ؟ وَقَدْ نَزَلَ النَّاسُ مَنَازِلَهُمْ وَأَخَذُوا أَخَذَاتِهِمْ؟».

''میرے پروردگار! یہ کیوں کر ممکن ہے؟ لوگ تو اپنی اپنی جگہ لے چکے ہیں اور اپنا اپنا حصہ قبضے میں کر چکے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم پسند کرو گے کہ تمہاری ملکیت دنیا میں کسی بادشاہ کے ملک جتنی ہو۔ وہ کہے گا: ہاں میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ہم نے تجھے اتنی بادشاہی بخش دی اور ”مِثْلُهُ وَ مِثْلُهُ وَمِثْلُهُ وَمِثْلُهُ وَمِثْلُهُ“ پانچ مرتبہ زیادہ بڑی سلطنت تمہیں عطا کر دی۔ وہ کہے گا: میرے رب میں خوش ہو گیا۔ اللہ فرمائے گا:

«هَذَا لَكَ وَعَشَرَةُ أَمْثَالِهِ، وَلَكَ مَا اشْتَهَتْ نَفْسُكَ وَلَذَّتْ عَيْنُكَ».

”یہ تیرے لئے ہے، اور دس گنا زیادہ اور بھی، اور تیرا دل جو چاہے اور تیری آنکھ کو جو کچھ بھلا لگے، سب ہم نے تجھے دیا۔“

پھر جب وہ جنت میں داخل ہو گا تو وہاں حورِعین میں سے اس کی دو بیویاں اس کا استقبال کریں گی اور کہیں گی:

«الْحَمْدُ لِلهِ الَّذِي أَحْيَاكَ لَنَا وَأَحْيَانَا لَكَ».

”تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے تمہیں ہمارے لیے اور ہمیں تمہارے لیے بنایا۔“

پھر وہ کہے گا:

«مَا أُعْطِيَ أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُعْطِيتُ».

”جو کچھ مجھے ملا ہے ویسا کسی کو نہیں ملا ہو گا۔“

یہ سب سے نچلے درجے والا جنتی ہو گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یہ تو سب سے کم تر درجے کا جنتی ہوا۔ اور اعلیٰ منزل والے جنتی کی شان کیا ہو گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«أُولَئِكَ الَّذِينَ أَرَدْتُ، غَرَسْتُ كَرَامَتَهُمْ بِيَدِي وَخَتَمْتُ عَلَيْهَا، فَلَمْ تَرَ عَيْنٌ وَلَمْ تَسْمَعْ أُذُنٌ، وَلَمْ

يَخْطُرْ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ».

''وہ ایسے لوگ ہیں جن کو میں نے چنا، اختیار کیا، ان کی عزت و بزرگی کو اپنے ہاتھ سے جمایا اور اس پر مہر ثبت کر دی، (میں نے ان کے لیے جنت میں جو نعمتیں تیار کر رکھی ہیں انہیں) نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی دل میں ان کے متعلق تصور تک گزرا۔''(1)

مذکورہ آخری جنتی کے بارے میں صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کر کے فارغ ہو جائے گا اور اپنی رحمت سے کچھ لوگوں کو جہنم کی آگ سے نکالنا چاہے گا تو فرشتوں کو حکم دے گا کہ وہ ان لوگوں کو جہنم سے نکال لائیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ہوگا، جن پر اللہ تعالیٰ نے رحم کرنا پسند کیا، اور وہ لا إله إلا الله کہتے رہے۔ فرشتے جہنم میں انھیں نکالنے جائیں گے تو انھیں سجدے کے نشان سے پہچانیں گے، کیونکہ آتشِ جہنم ابن آدم کو کھا جائے گی لیکن سجدے کے نشانات باقی رہیں گے۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ نے سجدے کے نشانات کو جلانا جہنم کی آگ پر حرام کر دیا ہے۔ پھر وہ جہنم کی آگ سے جلے بھنے (کوئلے کی طرح) نکالے جائیں گے، جب ان کے اوپر آبِ حیات چھڑکا جائے گا تو وہ تازہ ہو کر ایسے جی اٹھیں گے جیسے دانہ کچرے کے بہاؤ میں اگ جاتا ہے (چونکہ پانی جہاں پر کوڑا کرکٹ اور مٹی بہا کر لاتا ہے وہاں دانہ بہت جلد اُگ جاتا ہے اور جلدی سے سرسبز و شاداب ہو جاتا ہے، اسی طرح جہنمی بھی آبِ حیات پڑتے ہی تازہ دم ہو جائیں گے)۔

---

(1) اس واقعہ کو بخاری (6571)، (6573) اور مسلم (186 تا 189) وغیرہ سے یکجا کر کے ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندوں کے فیصلے سے فارغ ہوگا تو ایک آدمی باقی رہ جائے گا جس کا منہ جہنم کی طرف ہوگا اور جنت میں داخل ہونے والا آخری شخص ہوگا۔ وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میرا چہرہ جہنم کی طرف سے پھیر دے، اس کی بدبو نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی ہے اور اس کی لپٹ نے مجھے جلا ڈالا ہے، پھر جب تک اللہ کو منظور ہوگا وہ دعا کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

«هَلْ عَسَيْتَ إِنْ فَعَلْتُ ذَلِكَ بِكَ أَنْ تَسْأَلَ غَيْرَهُ».

”اگر میں تیرا یہ سوال پورا کردوں تو اس کے علاوہ مزید کوئی سوال تو نہیں کرے گا؟“

بندہ کہے گا: میں پھر کوئی سوال نہیں کروں گا اور جیسے اللہ کو منظور ہے وہ قول وقرار کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ جہنم کی طرف سے پھیر دے گا۔ جب اس کا چہرہ جنت کی طرف ہوگا اور وہ جنت کو دیکھ لے گا تو جب تک اللہ کو منظور ہوگا وہ خاموش رہے گا۔ پھر وہ کہے گا: اے میرے رب! مجھے جنت کے دروازے تک پہنچا دے! اللہ تعالیٰ اس سے کہے گا:

«أَلَسْتَ قَدْ أَعْطَيْتَ عُهُودَكَ وَمَوَاثِيقَكَ أَنْ لَّا تَسْأَلَنِي غَيْرَ الَّذِي أَعْطَيْتُكَ، وَيْلَكَ يَا ابْنَ آدَمَ، مَا أَغْدَرَكَ؟».

”کیا تو نے اپنا قول وقرار نہیں دیا تھا کہ تو پھر کوئی دوسرا سوال نہیں کرے گا، تیرا برا ہو، اے ابنِ آدم! تو کس قدر دغا باز ہے!“

بندہ کہے گا: اے رب! اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کہے گا: اگر میں تیرا یہ سوال پورا کردوں تو اس کے علاوہ مزید کوئی سوال تو نہیں کرے گا؟ بندہ کہے گا: تیری عزت کی قسم! میں دوسرا سوال نہیں کروں گا۔ پھر اللہ کو جو منظور ہوگا عہد و پیمان دے گا۔ تب اللہ اسے جنت کے دروازے تک پہنچا دے گا۔

جب بندہ جنت کے دروازے پر کھڑا ہوگا تو جنت اس کو دکھائی دے گی جس میں وہ خیر و بھلائی اور فرحت و شادمانی دیکھے گا۔ پھر جب تک اللہ کو منظور ہوگا، وہ خاموش رہے گا، پھر کہے گا: اے رب! مجھے جنت میں داخل کر دے! اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نے مجھے اپنا قول و قرار نہیں دیا تھا کہ تو پھر دوسرا کوئی سوال نہیں کرے گا؟ اے ابن آدم! تو کتنا مکار ہے؟! بندہ کہے گا: اے میرے رب! میں تیری مخلوق میں بدنصیب نہیں ہوں گا، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ ہنس دے گا تو اس سے فرمائے گا: جنت میں داخل ہوجا! جب بندہ جنت میں داخل ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اور کچھ تمنا کرو، وہ تمنا کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے مانگے گا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اسے یاد دلائے گا کہ فلاں فلاں چیز مانگ۔ جب اس کی آرزوئیں ختم ہوجائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

«ذَلِكَ لَكَ وَمِثْلُهُ مَعَهُ».

’’یہ سب نعمتیں تیری ہیں اور اتنی ہی مزید ملیں گی۔‘‘(1)

---

(1) بخاری (7437)، مسلم (182)۔

خلیفہ اور رعایا

حضرت عمر فاروق ؓ اپنی عادت کے مطابق رات کو مدینہ منورہ کا گشت کر رہے تھے۔ لوگ سو رہے تھے اور خلیفہ وقت ان کی مشکلات جاننے کے لیے، ان کی مدد کرنے کے لیے جاگتے پھر رہے تھے۔ وہ ایک میدان سے گزرے‘ میدان کے کنارے ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے خیمے کے اندر ایک عورت کے رونے اور کراہنے کی آواز سنی۔ اس طرف تشریف لے گئے۔ خیمے کے دروازے پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت عمر ؓ نے اس کو سلام کیا اور پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس شخص نے کہا کہ وہ دیہی علاقے کا رہنے والا ہے اور اس شہر میں اجنبی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ امیر المومنین سے ملنا چاہتا ہے تا کہ ان سے کچھ امداد حاصل کر سکے۔ اب حضرت عمر ؓ نے عورت کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں کراہ رہی ہے؟

اس شخص کو غصہ آ گیا‘ اس کو کیا معلوم تھا کہ وہ امیر المومنین سے بات کر رہا ہے۔ کہنے لگا: اے اللہ کے بندے! اپنی راہ لے۔ جس بات سے تجھے کوئی غرض نہیں، اس کے بارے میں کیوں سوال کرتا ہے؟

اب عمر فاروق ؓ نے بڑی محبت اور پیار سے اس سے پوچھا: اجنبی بتاؤ تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ اگر ہو سکا تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ اس نے کہا: میاں کیا بتاؤں! دراصل میری بیوی کے ہاں ولادت متوقع ہے اور اس کے پاس کوئی عورت نہیں ہے جو اس کی اس حالت میں مدد کرے۔ عمرِ فاروق ؓ فوراً اپنے گھر کی طرف لوٹے۔ اپنی بیوی امِ کلثوم بنت فاطمہ ؓ کو جگایا۔ فرمانے لگے: بی بی!

اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجر وثواب کمانے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔ بیوی نے پوچھا: عمر! وہ کون سی خیر وبرکت اور اجر وثواب والی بات ہے؟

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیوی کو سارا قصہ بتایا کہ ایک عورت مدد کی منتظر ہے۔ امِ کلثوم رضی اللہ عنہا فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس موقع پر جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کو اپنے ہمراہ لیا اور اپنے خاوند کے ساتھ چل پڑیں۔ ادھر عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی فوراً ہانڈی اٹھائی‘ گھی لیا‘ کچھ آٹا‘ دانہ ساتھ لیا اور دونوں میاں بیوی اس خیمے میں پہنچ گئے۔

اُم کلثوم رضی اللہ عنہا خیمے کے اندر چلی گئیں اور دایہ کے فرائض سرانجام دینے لگیں۔ خیمے سے باہر امیر المومنین نے اس دیہاتی شخص کے ساتھ مل کر کھانا پکانا شروع کیا۔ آگ جلانے کے لیے وہ پھونکیں مار رہے تھے کہ ادھر اس عورت کے ہاں ولادت ہو گئی۔ ام کلثوم نے خیمے سے آواز دی: امیر المومنین! اپنے دوست کو خوشخبری دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹے سے نوازا ہے۔ اس دیہاتی نے جب یہ الفاظ سنے تو حیران رہ گیا کہ یہ امیر المومنین ہیں جو اس کے ساتھ کھانا پکا رہے ہیں اور آگ جلانے کے لیے پھونکیں مار رہے ہیں۔ اور ادھر اس دیہاتی کی بیوی حیران اور پریشان ہے‘ ہکا بکا ہے کہ جو عورت دایہ کے فرائض سرانجام دے رہی ہے وہ امیر المومنین کی اہلیہ محترمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور اللہ کے رسول ﷺ کی نواسی ہے۔

دوستی کا حق

سعودی عرب کی ایک بستی میں اسکول تھا، اس میں چھ اساتذہ تھے۔ میرا تقرر ہوا تو ہماری تعداد سات ہوگئی۔ اساتذہ میں سبھی نمازی تھے۔ بس ایک استاد نماز ادا نہیں کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دوسرے اساتذہ اس سے نفرت کرتے تھے اور اس سے دور بھی رہتے تھے۔ غالباً انھوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ڈٹا رہا۔ اس لیے اسکول میں اس کے اور دوسرے ٹیچروں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔

اب جب میں وہاں بطورِ مدرس گیا تو میں نے محسوس کیا کہ نماز نہ پڑھنے والے استاد کے ساتھ دیگر اساتذہ کا رویہ بڑا سخت ہے۔ جب وقفہ ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ الگ تھلگ ہے اور دوسرے ٹیچر ایک جگہ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ اور پھر میں نے اس کی اصلاح کا ارادہ کرلیا۔ چونکہ میں اسکول میں نیا آیا تھا، لہٰذا میں اس کے پاس گیا، اس سے تعارف کے بعد پاس ہی بیٹھ گیا۔ اگلے دن پھر میں اس کے پاس تھا۔ اس کے حالات دریافت کیے۔ اسے بھی مجھ سے کچھ اُنس سا ہوگیا۔ میں نے کہا کہ مجھے رہائش کا مسئلہ درپیش ہے، چونکہ تم بھی اکیلے رہتے ہو، اس لیے جب تک تمھاری بیوی اور بچے نہیں آجاتے، مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔ میں مکان کا کرایہ ادا کردوں گا۔ اتنی جلدی اس بستی میں مکان ملنا آسان نہیں۔ اس نے کچھ پس و پیش کے بعد میری بات مان لی اور مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ مگر اس نے ایک بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی: دیکھو میاں! میرے اندر خیر نہیں، میں بہت اچھا آدمی نہیں، نماز نہیں پڑھتا اور یوں بھی اسلام سے خاصا دور

ہوں۔ میں نے کہا: کوئی بات نہیں ہم کچھ دن اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر ہمارا گزارا ہو گیا تو ٹھیک ورنہ میں اپنا علیحدہ مکان تلاش کرلوں گا۔

اگلے دن سے میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اب میں نے اس کی خدمت کرنا شروع کی۔ میں صفائی کرتا، کھانا تیار کرتا، اپنے کپڑے استری کرتا تو اس کے بھی کر دیتا۔ اس دوران میں نے کبھی اس سے نماز یا دین کے حوالے سے گفتگو نہ کی۔ چند دنوں میں ہمارے تعلقات اور بہتر ہو گئے۔ وہ میرے اخلاق سے بڑا متاثر تھا۔ میں مزید اس کی خدمت میں لگ گیا۔

ایک دن عصر کے وقت میں نے چائے تیار کی۔ اس کو تھرمس میں ڈالا اور ٹیبل پر رکھ کر اسے بلایا۔ اب ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ اچانک قریب کی مسجد سے عصر کی اذان سنائی دی۔ میں نے چائے کا کپ وہیں رکھا اور نماز کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب اس نے مجھے اٹھتے دیکھا تو کہنے لگا: تم ہر روز پانچ مرتبہ مسجد جاتے ہو تھک نہیں جاتے؟ میں نے کہا: نہیں ہرگز نہیں! بلکہ مجھے تو بڑا سکون اور اطمینان ملتا ہے اور اگر چاہو تو تم بھی ایک مرتبہ آزما کر دیکھو۔ اس نے کہا: ہاں یہ ٹھیک ہے۔

اب ہم مسجد میں گئے، میرے ساتھی نے وضو بھی نہیں کیا تھا۔ جماعت کھڑی ہونے میں وقت تھا۔ میں نے تحیۃ المسجد پڑھی اور اپنے دوست کے پیچھے کھڑا ہو کر اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا لیا: اے اللہ! میں نے تیرے بندے کے ساتھ کیا کیا سلوک کیے، جتن کیے اور اب میں اس کو مسجد میں لے آیا ہوں۔ اے میرے رب! اس کو ہدایت دینا تیرا کام ہے۔ جب نماز ختم ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا: ذرا بتاؤ، تمہارے دل کی کیفیت کیا ہے؟ کہنے لگا: ایسی راحت جس کی کوئی مثال نہیں۔ میں نے کہا: اچھا تو تھوڑی دیر بعد مغرب کی نماز ہوگی۔ میری تم سے

درخواست ہے کہ غسل اور وضو کرو۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ہدایت عطا فرما دی۔ وہ دین کے اوامر پر سختی سے کاربند ہو گیا اور ہماری دوستی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اب میں نے مدرسے کے دیگر اساتذہ سے کہا کہ تمہارا اس سے معاملہ مبنی بر حکمت نہیں تھا۔ دیکھو اخلاق، حکمت اور دعا کے ساتھ میں نے اس کو دین کی طرف دعوت دی تو اس نے قبول کر لی۔ پھر یہی استاد جو کل تک نماز نہیں پڑھتا تھا وہ اسلام کا داعی بن گیا۔ حکومت نے اسے بیرون ملک بھیجا، وہاں بہت سے لوگوں نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

دراصل بہت سے لوگ اپنے دوستوں کے بارے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ وہ جب اپنے دوست کو بدی کی طرف مائل ہوتے ہوئے دیکھتے تو فوراً آگ بگولا ہو کر اس پر طرح طرح کے فتوے لگانا شروع کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے مقابل دوست شیطان کے نرغے میں آ کر غلط فیصلہ کر لیتا ہے اور ضدی بن جاتا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے جو تعلیمات دی ہیں ان کے مطابق کسی آدمی کو غلط راستے سے راہِ راست پر لانے کے لیے جذبات کی طغیانیوں میں ڈوب کر کوئی قدم اٹھانے کی بجائے مثبت انداز میں اخلاقِ کریمانہ کے ساتھ انتہائی دانشمندانہ قدم اٹھانا چاہیے اور بتدریج اسے اللہ اور رسول کی طرف دعوت دینی چاہیے تا کہ اسے کوئی الجھن محسوس نہ ہو اور وہ قبولیتِ حق کے لئے اپنا ذہن صاف کر لے۔ اس کے برعکس اگر کوئی جذباتی طور پر حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کیے بغیر کسی کو راہ راست پر لانے کے لیے جلدی مچانا شروع کر دے تو اس کا الٹا اثر یہ ہو گا کہ مقابل اسے اپنی اَنا کا مسئلہ

بنا لے گا اور اپنے برے کرتوتوں پر مصر رہے گا، نیز اپنے ناصح دوست کے ساتھ دیرینہ خوشگوار تعلقات، ناچاقی اور قلق واضطراب وکشمکش میں بدل جائیں گے جس کا نتیجہ آپس کی دشمنی پر منتج ہوگا۔ کیونکہ بتدریج دانشمندی کے ساتھ کیا جانے والا کام کامیابی کی علامت ہے جبکہ جلد بازی میں تدریج کا لحاظ نہ کرنا ناکامی کی! ویسے ہی جیسے کوئی گاڑی کا چوتھا گیئر لگا کر اسے سڑک پر دوڑانے کی بے جا کوشش کرے۔ جبکہ چوتھا گیئر، پہلے، دوسرے اور تیسرے کے بعد ہی لگتا ہے۔

خدمت کا صلہ

حضرت طاووس اپنے والد محترم کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں کہ ایک شخص کے چار بیٹے تھے۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کے ایک بیٹے نے اپنے بھائیوں سے کہا: یا تو تم والد محترم کی خدمت کرو اور تمہیں اس کی میراث میں کچھ نہیں ملے گا، یا صرف مجھے خدمت کرنے دو اور میں جائیداد میں سے کچھ مطالبہ نہیں کروں گا۔

بھائیوں کے لیے یہ بڑی عمدہ پیش کش تھی کہ خدمت بھی نہ کریں اور جائیداد بھی پوری ملے بلکہ ایک بھائی اپنا حصہ بھی نہ لے۔ چنانچہ وہ کہنے لگے: ہمیں کوئی اعتراض نہیں، تم والد کی خدمت کرو اور تمہیں میراث میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ جیسا کہ خود ہی تم نے تجویز پیش کی ہے۔

ان کا بھائی اپنے والد کی خدمت کرتا رہا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا، ایک دن قضائے الٰہی سے وفات پا گیا۔ معاہدے کے مطابق اس بھائی نے جائیداد میں سے کوئی حصہ نہ لیا۔ اب اللہ رب العزت نے اس کو والد کی خدمت کرنے کا صلہ اس طرح دیا کہ ایک دن اس نوجوان نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے: فلاں جگہ جاؤ وہاں تمہیں ایک سو دینار ملیں گے۔ اس نے پوچھا: کیا اس میں برکت ہے؟ جواب ملا: نہیں۔

صبح اس نے اپنی بیوی سے ذکر کیا۔ کہنے لگی: جاؤ اور سو دینار لے آؤ۔ ان سے ہم اپنے کپڑے سلوا لیں گے اور عمدہ زندگی گزاریں گے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔

اگلے دن پھر اس نے خواب دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے: فلاں جگہ جاؤ،

تمہیں دس دینار ملیں گے۔ اس نے پوچھا: کیا ان میں برکت ہے؟ جواب ملا: نہیں۔

صبح اس نے پھر اپنی بیوی سے ذکر کیا۔ اس نے پھر اسے مجبور کیا کہ جاؤ اور اس سے استفادہ کرو۔ مگر اس شخص نے انکار کر دیا، کیوں کہ اس میں برکت نہیں تھی۔

ایک دن پھر اس نے خواب دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے: فلاں جگہ جاؤ تمہیں ایک دینار ملے گا۔ پوچھا: کیا اس میں برکت ہے؟ بتایا گیا: ہاں۔

چنانچہ صبح وہ شخص اس مقام پر گیا اور واقعی اس کو ایک دینار ملا۔ راستے میں جب بازار سے گزر رہا تھا تو اسے ایک شخص ملا جو دو مچھلیاں فروخت کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا: کتنے کی ہیں۔ جواب ملا: ایک دینار کی۔ اس نے وہ مچھلیاں خرید لیں اور گھر آ کر جب ان کو چیرا تو دونوں مچھلیوں کے پیٹ سے ایک ایک موتی نکلا جو اتنا خوبصورت اور قیمتی تھا کہ بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ اس نے ان کو بڑی بھاری قیمت پر فروخت کیا اور خاصا امیر آدمی بن گیا۔

اسے اپنے والد کی خدمت کا صلہ مل گیا تھا۔ اس نے جائیداد میں حصہ تو نہ لیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے رزق کے دروازے کھول دیے۔

ایک حاجت مند حاکم کی کہانی

فاروقِ اعظم حضرت عمر بن خطابؓ کا دورحکومت اسلامی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ رعایا اور حکومت کے درمیان نہایت خوشگوار تعلقات تھے، حکام اپنے عوام کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ فتوحات کی بدولت اسلامی حکومت کا رقبہ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ مفتوحہ علاقوں میں مرکز سے نہایت قابل اور خوفِ الٰہی رکھنے والے گورنر بھیجے جاتے۔ حضرت عمر فاروقؓ نہایت درجہ مردم شناس تھے۔ چنانچہ کسی بھی صوبے کا گورنر منتخب کرتے وقت نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا۔ شام کا علاقہ فتح ہوا تو حمص شہر میں حضرت سعید بن عامرؓ کو والیٔ شہر بنا کر بھیجا گیا۔ ان دنوں بیت المال کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ جوں جوں بیت المال میں رقومات آتی گئیں لوگوں کے مسائل پر خلیفہ کی بھرپور توجہ بڑھتی گئی۔ مرکز مختلف علاقوں سے فقراء اور محتاجوں کی لسٹ طلب کرتا اور ان کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جاتیں۔ ان فہرستوں کا جائزہ حضرت عمر فاروقؓ خود لیتے اور ان پر احکامات جاری کرتے۔

اہل حمص کا ایک وفد مدینہ منورہ آیا ہوا تھا۔ عمرِ فاروقؓ نے ان میں سے بعض معتبر اور ثقہ افراد سے کہا کہ اپنے شہر کے حاجت مند افراد کی فہرست بنائیں تا کہ ان کی مدد کی جا سکے۔

شہر کے حاجت مند افراد کی فہرست حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے ہے اور آپ عمیق نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہے ہیں۔ اچانک ان کی نظر سعید بن عامرؓ کے نام پر پڑتی ہے۔ پوچھا: یہ سعید بن عامر کون ہے؟ جواب ملا:

ہمارا گورنر۔ فرمایا: تمہارا گورنر فقیر ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، اللہ کی قسم! کئی کئی دن گزر جاتے ہیں اور ان کے گھر آگ نہیں جلتی۔

عمرِ فاروق ؓ بے اختیار رو پڑے، روتے روتے داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ وفد کو ایک ہزار دینار دیے اور کہا کہ اپنے امیر کو میرا سلام پہنچا دو اور ان سے کہو کہ امیر المومنین نے یہ ہدیہ ارسال کیا ہے تا کہ آپ اپنی ضرورت پوری کرسکیں۔

یہ وفد حمص پہنچ کر اپنے امیر سے ملا، عمرِ فاروق ؓ کا پیغام اور امانت پیش کی۔ حضرت سعید بار بار «إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ» پڑھ رہے ہیں۔

بیوی نے حیران ہو کر پوچھا: آپ کو کیا صدمہ آ پہنچا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ امیر المومنین وفات پا گئے ہیں؟! کہا: نہیں، اس سے بھی بڑی بات ہے۔ کیا مسلمانوں کو کہیں شکست ہو گئی؟ بیوی نے پوچھا۔ کہا: نہیں، اس سے بھی بڑے صدمے اور دکھ کی بات ہے۔ کہنے لگیں: بتائیں تو سہی آخر کیا ہوا ہے جس سے آپ پریشان اور غم زدہ ہیں؟ فرمایا: میری آخرت کی بربادی کا سامان ہوا چاہتا ہے، گھر میں فتنہ داخل ہو گیا ہے۔ بیوی نے کہا: پھر اس سے نجات حاصل کر لیں۔ اب گھر والی کو تو معلوم نہیں اس معاملے کا تعلق درہم و دینار سے ہے۔ پوچھا: بی بی! کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گی۔ اس نے کہا کہ ہاں، کیوں نہیں۔ چنانچہ انھوں نے تمام دینار مساکین اور مستحقین میں تقسیم کر دیے۔ اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گزرے کہ خود عمرِ فاروق ؓ کا گزر حمص سے ہوا۔

اس دور میں اس شہر کو چھوٹا کوفہ کہا جاتا تھا کہ اہلِ حمص اپنے گورنر کے خلاف اکثر شکایات کرتے رہتے تھے۔ اور اہل کوفہ تو اس سلسلہ میں ضرب المثل تھے ہی۔

اہالیانِ شہر سے سوال ہوا: اپنے امیر کے بارے میں تمہاری آراء اور شکایات کیا ہیں؟ امیرِ شہر کے خلاف چار بڑی شکایات ان کی موجودگی میں پیش کی گئیں:

پہلی یہ تھی کہ وہ لوگوں سے خوب دن چڑھے ملاقات کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان سے ملاقات بڑی مشکل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا: امیر المومنین! میں آپ لوگوں کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ میرے پاس کوئی نوکر یا غلام نہیں ہے۔ بیوی میری بیمار رہتی ہے۔ میں پہلے خود آٹا پیستا ہوں، پھر اس کو گوندھتا ہوں، پھر اس میں خمیر اٹھنے کا انتظار کرتا ہوں، پھر روٹی پکاتا ہوں۔ اس دوران اشراق کا وقت ہو جاتا ہے‘ نفل ادا کر کے گھر سے نکلتا ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمہاری دوسری شکایت کیا ہے؟ کہا گیا کہ رات کو کسی سے ملاقات نہیں کرتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ہاں سعید، اس کی کیا وجہ ہے؟ جواب ملا: حضرت‘ میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا۔ دراصل میں نے پورا دن لوگوں کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر رکھا ہے اور رات اپنے رب کے لیے وقف کی ہوئی ہے۔

پوچھا گیا کہ تیسری شکایت کیا ہے؟ کہا گیا کہ مہینہ میں ایک دن ایسا بھی ہوتا ہے جب یہ گھر سے باہر نہیں آتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا۔ جواب دیا گیا: امیر المومنین‘ میرا کوئی خادم یا غلام نہیں ہے۔ میرے پاس پہننے کے لیے ایک ہی جوڑا ہے۔ مہینے میں ایک مرتبہ خود ہی اس کو دھوتا ہوں اور پھر سوکھنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اور اس طرح شام کے وقت ہی گھر سے نکل پاتا ہوں۔

پوچھا گیا کہ تمہاری چوتھی شکایت کیا ہے؟ بتلایا گیا کہ ان کو وقتاً فوقتاً غشی کے دورے

پڑتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ بتائی جائے۔

جواب ملا: میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو مکہ مکرمہ میں حضرت خبیب بن عدی ؓ کو سولی پر چڑھتے وقت دیکھ رہے تھے۔ میں اس وقت مشرک تھا۔ قریش ان کے جسم پر نیزوں سے کچوکے لگاتے اور پوچھتے:

«أَتُحِبُّ أَنَّ مُحَمَّدًا مَكَانَكَ» .

”کیا تم پسند کرتے ہو کہ تمہاری جگہ محمد ہوں؟“

خبیب ؓ جواب دیتے:

«وَاللهِ! مَا أُحِبُّ أَنِّي فِي أَهْلِي وَوَلَدِي وَأَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شِيكَ بِشَوْكَةٍ» .

”اللہ کی قسم! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ ان کو کوئی کانٹا چبھے اور میں اپنے اہل وعیال میں خوش وخرم رہوں۔“

میں اس غلط کام میں مشرکین کی مدد اور معاونت کر رہا تھا۔ جب وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ندامت اور شرم وحیا سے مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے فکر لگ جاتی ہے کہ قیامت کے دن میرا رب مجھ سے پوچھ نہ لے۔ اے کاش! میں اس وقت مسلمان ہوتا، حضرت خبیب ؓ کی مدد کرتا، کافروں کو روکتا یا پھر خود بھی خبیب کے ساتھ شہادت پا جاتا۔

عمر فاروق ؓ نے جب جوابات سنے تو ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور کہا:

«الْحَمْدُ لِلهِ الَّذِي لَمْ يَفِلْ فِرَاسَتِي» .

”اس اللہ کا شکر ہے جس نے میری فراست کو کمزوری سے بچا لیا۔“

حضرت عمر ؓ نے ایک ہزار دینار ان کو مزید ارسال کیے کہ اپنی گھریلو ضروریات پوری کر سکیں۔ حضرت سعید ؓ کی بیوی نے دیکھا تو کہنے لگیں: اب اس سے ہم سواری اور نوکر وغیرہ کا بندوبست کر لیں گے۔

حضرت سعید ؓ نے بیوی سے پوچھا: ان چیزوں سے بہتر چیز کا انتخاب کیوں نہ کریں۔ کہنے لگیں: وہ کیا چیز ہے؟ تجویز کیا: رب تعالیٰ کو قرض دے دیتے ہیں اور اس کا اجر اس سے لیں گے۔ نیک طینت بیوی نے اثبات میں سر ہلایا: اچھی بات' اللہ تمہیں اس کی جزا دے۔

اپنے خاندان کے کسی فرد کو آواز دی: یہ دینار لے جاؤ اور فلاں یتیم کو اتنے دینار' فلاں مسکین کو اتنے' فلاں بیوہ کو اتنے' فلاں حاجت مند کو اتنے دینار دے آؤ۔

اس طرح پوری رقم اس مجلس میں خیرات کر دی۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (1)

---

(1) دیکھئے: حلیة الأولیاء (1/245-247)، تاریخ دمشق الکبیر (23/115)۔

اللہ کے لیے محبت کا صلہ

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ”ایک آدمی کسی دوسری بستی میں اپنے بھائی کی زیارت کے لیے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو اس کے راستہ میں بٹھا دیا۔ جب وہ شخص وہاں سے گزرا تو فرشتے نے اسے روک کر پوچھا:

«أَيْنَ تُرِيدُ؟» .

” کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے جواب دیا:

«أُرِيدُ أَخًا لِي فِي هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ» .

”میں اس بستی میں اپنے بھائی کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔“ فرشتے نے اس آدمی سے پوچھا:

«هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا» .

”کیا تمہارا اس کے اوپر کوئی احسان ہے جس کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے کے لیے جا رہے ہو؟“

اس نے جواب دیا: نہیں، صرف اتنی بات ہے کہ میں اس سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ فرشتے نے یہ جواب سن کر کہا:

«فَإِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكَ ، بِأَنَّ اللهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَا أَحْبَبْتَهُ فِيهِ» .

”میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں تاکہ تمہیں اطلاع دے دوں کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے ویسے ہی محبت کرتے ہیں جیسے تم اس بھائی سے اللہ کے لئے محبت کرتے ہو۔“(1)

---

(1) مسلم (2567)، مسند احمد (292/2)۔

مسلمان کی پردہ پوشی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہمراہ رات کے وقت معمول کے مطابق گشت پر تھے۔ رات کے اندھیرے میں انھیں روشنی سی نظر آئی۔ انھوں نے روشنی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ایک گھر نظر آیا۔ اندر سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اچانک عمر فاروق رضی اللہ عنہ گھر کے صحن میں داخل ہوئے۔ ایک عجیب منظر دیکھا، ایک بوڑھا شخص، اس کے ہاتھ میں جام' سامنے گانے والی عورت، آدھی رات کا وقت۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو للکارا:

«مَا رَأَيْتُ كَاللَّيْلَةِ مَنْظَرًا أَقْبَحَ مِنْ شَيخٍ يَنْتَظِرُ أَجَلَهُ».

''میں نے آج رات اس بوڑھے شخص سے زیادہ قبیح اور شرمناک فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنے آخری وقت کے انتظار میں ہے مگر شراب و کباب میں مست گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لادے جا رہا ہے۔''

وہ بوڑھا شخص کہنے لگا: امیر المومنین! بلاشبہ میں جو کام کر رہا ہوں نہایت برا ہے۔ مگر ذرا غور کریں، جو کام آپ نے کیا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ برا ہے۔ آپ نے تجسس کیا ہے، حالانکہ اسلام نے تجسس سے منع کیا ہے اور آپ میرے گھر میں میری اجازت کے بغیر داخل ہوئے ہیں، حالانکہ یہ منع ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے سچ کہا۔ پھر وہاں سے روتے ہوئے نکلے اور زبان پر یہ الفاظ تھے:

«ثَكِلَتْ عُمَرَ أُمُّهُ إِنْ لَّمْ يَغْفِرْ لَهُ رَبُّهُ، يَجِدُ هَذَا - كَانَ

يَسْتَخْفِي بِهِ مِنْ أَهْلِهِ فَيَقُولُ: الآنَ رَآنِي عُمَرُ فَيَتَتَابَعُ فِيهِ».

”عمر کو اس کی ماں گم پائے، اگر اس کو اس کے رب نے بخش نہ دیا۔ یہ شخص اپنے گھر والوں سے چھپ کر یہ معصیت کر رہا تھا، اب وہ کہے گا: عمر نے تو مجھے دیکھ ہی لیا ہے، چنانچہ وہ بار بار اس معصیت کا ارتکاب کرے گا۔“

اس واقعہ سے پہلے یہ شخص حضرت عمر ؓ کی مجلس میں حاضری دیا کرتا تھا، اب اس نے خوف اور شرم کے باعث حاضری چھوڑ دی۔ کچھ عرصے کے بعد ایک دن عمر فاروق ؓ اپنی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یہی بوڑھا شخص اپنے آپ کو چھپائے ہوئے مجلس میں داخل ہوا، مجلس میں کافی لوگ بیٹھے تھے۔ یہ شخص مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا۔ حضرت عمر ؓ نے اسے دیکھ لیا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس بوڑھے کو میرے پاس بھجوادو۔ وہ شخص پریشان ہوا کہ میں تو اسی بات سے گھبراتا تھا۔ بہر حال لوگوں نے کہا کہ جاؤ عمر ؓ بلا رہے ہیں۔ وہ ڈرتا ڈرتا قریب آ کر بیٹھ گیا۔ آپ نے اسے مزید اپنے قریب بلایا، وہ ذرا قریب ہوا تو فرمایا: اور قریب آ جاؤ۔ اس طرح قریب کرتے کرتے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ پھر فرمایا: ذرا کان میرے قریب کرو۔ پھر اس کے کان میں فرمایا:

«أَمَا وَالَّذِي بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ رَسُولًا! مَا أَخْبَرْتُ أَحَدًا مِنَ النَّاسِ بِمَا رَأَيْتُ مِنْكَ، وَلَا ابْنَ مَسْعُودٍ فَإِنَّهُ كَانَ مَعِيَ».

”سنو! اس ذات کی قسم! جس نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا ہے، میں نے جو اس روز دیکھا، کسی شخص کو نہیں بتایا حتی کہ ابنِ مسعود کو بھی، حالانکہ وہ اس رات میرے ساتھ تھے۔“

اس شخص نے کہا: امیر المومنین! ذرا اپنا کان میرے قریب کریں۔ پھر اس نے کہا:

«وَلَا أَنَا وَالَّذِي بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ رَسُولًا، مَا عُدْتُ إِلَيهِ حَتَّى جَلَسْتُ مَجْلِسَ هَذَا».

’’اس ذات کی قسم جس نے محمد کو حق کے ساتھ رسول بنا کر بھیجا ہے! اس دن سے آج کی مجلس میں حاضر ہونے تک میں نے بھی دوبارہ ایسا کام نہیں کیا۔‘‘

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ کلمات سننے کے بعد اتنی خوشی ہوئی کہ آپ نے بلند آواز میں ’’اللہ اکبر‘‘ کہا۔ لوگوں کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ انھوں نے اللہ اکبر کس وجہ سے کہا ہے!(1)

---

(1) حياة الصحابة: (149/3)، كنز العمال: (141/2)۔

کسی کو پتا نہ چلے

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے مشہور محدث تھے۔ شام کے شہر طرسوس میں ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا، عموماً رقہ نامی جگہ پر قیام ہوتا۔ وہاں ایک نوجوان ان کے پاس آتا، ان کی خدمت کرتا، ان کے ضروری کام نمٹاتا، اور ان سے حدیث کا درس لیتا۔ اس طرح اس سے انہیں خاصا انس ہو گیا۔ ایک دفعہ تشریف لائے تو خلاف معمول وہ نوجوان نظر نہ آیا۔ جلدی میں تھے، قافلے کے ساتھ نکل گئے۔ کچھ دنوں کے بعد واپس آئے تو آتے ہی لوگوں سے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ نوجوان مقروض تھا، جب قرض واپس نہ کر سکا تو قرض خواہوں نے اس پر مقدمہ کر دیا، چنانچہ اب وہ جیل میں ہے۔ سوال کیا کہ نوجوان پر کتنا قرض تھا؟ بتایا گیا کہ دس ہزار درہم تھا۔ اب عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس آدمی کو تلاش کرنا شروع کیا جس کا اس نوجوان کے اوپر قرض تھا۔ رات گئے اس آدمی سے رابطہ ہو سکا، اس کو بلوایا، علیحدگی میں لے گئے اور کہنے لگے: میں تمہیں اس نوجوان کا قرض واپس کرنا چاہتا ہوں مگر اس کے لیے ایک شرط ہے۔ اس نے پوچھا: کیا شرط ہے؟ کہا: جب تک میں زندہ ہوں، اس نوجوان کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ اس کا قرض کس نے واپس کیا ہے۔ اس نے کہا: مجھے کیا اعتراض ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چنانچہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو دس ہزار درہم ادا کر دیے۔ چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے اس نوجوان کی قید سے رہائی کے امکانات اگلے دن ہی ممکن تھے۔ خود عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اسی رات اس شہر سے اگلے سفر پر تشریف لے گئے۔

اگلے دن اس نوجوان کو قید خانے سے رہا کر دیا گیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ادھر ہی تھے اور اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو ان کی محبت نے جوش مارا اور وہ لگا اپنے استاد کو تلاش کرنے۔ پوچھتا ہوا اگلی بستی میں ان سے جا ملا۔ انھوں نے پوچھا: نوجوان، تم کہاں تھے؟ میں تمھاری بستی میں تھا' نظر نہیں آئے۔ اس نے کہا: اے ابو عبدالرحمٰن! میں قرض کی مصیبت میں پھنس گیا تھا، اس لیے مجھے جیل جانا پڑا۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: مگر یہ تو بتاؤ کہ تم جیل سے کیسے رہا ہوئے؟ نوجوان نے تفصیل بتائی: کوئی اللہ کا نیک بندہ تھا' میں اسے نہیں جانتا۔ اس نے میرا قرض ادا کر دیا تو میرا مقدمہ واپس ہو گیا اور مجھے جیل سے رہائی ہو گئی۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے: میرے عزیز! اس شخص کے لیے دعا کرو اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں جیل سے رہا کیا ہے۔ اس نوجوان کو انھوں نے احساس تک نہ ہونے دیا کہ اس کا قرض انھوں نے ادا کیا ہے۔ اسے قید خانے سے اپنی رہائی کی وجہ کا علم اس وقت ہوا جب عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ (1)

بلاشبہ اللہ کے نیک بندے خفیہ طریقے سے لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور اس حدیث کے مصداق یقیناً ان کو اجر وثواب ملتا ہے کہ قیامت کے دن سات قسم کے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے جس دن اور کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں ایک خوش قسمت وہ آدمی بھی ہوگا جس نے صدقہ کیا تو اس کو چھپا کر دیا۔ حتی کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتا نہ چلا کہ اس نے دائیں ہاتھ سے کیا خرچ کیا ہے۔ (2)

یقیناً امام عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے یہ کام کیا۔

---

(1) سیر أعلام النبلاء (8/386، 387)، تاریخ بغداد (10/158)۔

(2) بخاری (660)، مسلم (1031)۔

وہ بلا کا ذہین و بہادر تھا

قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھنے والا حجاج بن یوسف تاریخ میں اپنے ظلم وزیادتی اور قتل وغارت گری کیلئے بہت مشہور ہے۔ ایک دن وہ اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ عراقی حاشیہ بردار ارد گرد موجود تھے۔ اچانک ایک خارجی لڑکے کو لایا گیا۔ لڑکے کی عمر کم وبیش بارہ تیرہ سال ہوگی، ابھی اس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، مگر چہرے سے ذہانت اور فطانت نمایاں تھی، اس کے سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ لڑکے نے حاضرین کی پرواہ کیے بغیر محل کی چیزوں کو دیکھنا شروع کیا۔ اسے قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ حجاج بن یوسف کے دربار میں آیا ہے۔ وہ گردن کو کبھی دائیں اور کبھی بائیں موڑ رہا تھا مگر اس کے چہرے پر مختلف چیزوں کو دیکھ کر تعجب کے آثار ضرور تھے۔ غالباً وہ پہلی مرتبہ کسی محل کی زیب وزینت اور اس کی آرائش دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنے کان پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز سے پکارا:

﴿أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ ءَايَةً تَعْبَثُونَ ⁽١٢٨⁾ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ⁽١٢٩⁾﴾ (1)

”کیا تم ایک ایک ٹیلے پر بطورِ کھیل تماشا یادگار (عمارت) بنا رہے ہو اور بڑی صنعت والے (مضبوط محل) تعمیر کر رہے ہو، گویا کہ تم ہمیشہ یہیں رہو گے۔“

حجاج تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ لڑکے کی بات سنتے ہی فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا: آؤ لڑکے! تمہارے چہرے سے ذہانت اور ذکاوت جھلکتی ہے۔ ”أَحَفِظْتَ الْقُرْآنَ؟“ ”کیا تم نے قرآن حفظ کیا ہے؟“ مگر لڑکے نے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے کہا:

---

(1) الشعراء: 128، 129

«أَوَ خِفْتَ عَلَيْهِ مِنَ الضِّيَاعِ حَتَّى أَحْفَظَهُ، وَقَدْ حَفِظَهُ اللهُ تَعَالَى».

”کیا تمہیں اس کے ضائع ہونے کا خوف ہے جو اس کو حفظ کروں۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری تو اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔“

حجاج: «أَفَجَمَعْتَ الْقُرْآنَ؟». ”کیا تم نے قرآن کو جمع کیا ہے؟“ مطلب وہی تھا کہ کیا تجھے قرآن یاد ہے؟

اس ذہین لڑکے نے الفاظ کو ظاہری معنی پر محمول کر کے ترکی بہ ترکی اسے جواب دیا:

«أَوَ كَانَ مُفَرَّقًا حَتَّى أَجْمَعَهُ؟». ”کیا قرآن بکھرا ہوا تھا جو میں اس کو اکٹھا کروں؟“

اب حجاج ذرا کھسیانا ہوا اور کہنے لگا: «أَفَأَحْكَمْتَ الْقُرْآنَ؟». ”کیا تم نے قرآن کو پختہ یاد کیا ہے؟“

لڑکے نے پھر ان الفاظ کے ظاہری معنی لیے اور فوراً جواب دیا:

«أَلَيْسَ اللهُ أَنْزَلَهُ مُحْكَمًا». ”کیا اللہ رب العزت نے اسے محکم اور پختہ نازل نہیں کیا ہے؟“

حجاج: «أَسْتَظْهَرْتَ الْقُرْآنَ؟». ”کیا تم نے قرآن کریم کا کچھ حصہ زبانی یاد کیا ہے؟“

لڑکے نے پھر ظاہری معنی لیے اور کہا: «مَعَاذَ اللهِ! أَنْ أَجْعَلَ الْقُرْآنَ وَرَاءَ ظَهْرِي». ”میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں قرآن کریم کو پیٹھ پیچھے ڈالوں۔“

اب حجاج سے کوئی جواب نہ بن پایا تو غصے میں بولا: تیری بربادی ہو! اللہ تجھے ہلاک کرے! میں کیا کہہ رہا ہوں، تُو ہی بتا مجھے کیا کہنا چاہیے؟

لڑکا: ہلاکت اور موت مجھے نہیں بلکہ تجھے اور تیری قوم کو آئے۔ تمہیں اس طرح کہنا چاہیے تھا: «أَوَعَيْتَ الْقُرْآنَ فِي صَدْرِكَ» ”کیا تم نے قرآنِ کریم کو اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے۔“

حجاج: چلو، قرآن پاک کا کچھ حصہ تلاوت کرو۔

لڑکے نے بڑی خوبصورت آواز میں تلاوت قرآن کریم شروع کی:

«أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ»

﴿إِذَا جَآءَ نَصْرُ ٱللَّهِ وَٱلْفَتْحُ ① وَرَأَيْتَ ٱلنَّاسَ - يخرجون من- دِينِ ٱللَّهِ أَفْوَاجًا ②﴾

”جب اللہ کی نصرت و فتح آجائے اور تم دیکھو کہ لوگ گروہ در گروہ اللہ کے دین سے نکلتے ہیں۔“

حجاج: تیری بربادی ہو، قرآن میں تو اللہ کے دین میں داخل ہونے کی بات ہے۔ اور آیت یوں ہے:

﴿وَرَأَيْتَ ٱلنَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ ٱللَّهِ أَفْوَاجًا ②﴾

لڑکا: ایک وقت تھا کہ لوگ دین میں فوج در فوج داخل ہوتے تھے مگر آج فوج در فوج دین سے نکل رہے ہیں۔

حجاج: آخر کیوں؟

لڑکا: لوگوں کے ساتھ تمہارے برے برتاؤ کی وجہ سے۔

حجاج: تیرا ستیاناس ہو! تجھے معلوم ہے کہ تو کس سے مخاطب ہے؟

لڑکا: ہاں، میں ثقیف قبیلے کے شیطان حجاج سے مخاطب ہوں۔

حجاج: تیرا برا ہو! تجھے کس نے پالا پوسا اور تربیت کی ہے؟

لڑکا: جس نے تجھے پروان چڑھایا ہے۔

حجاج: تیری ماں کون ہے؟

لڑکا: جس نے مجھے جنا ہے۔

حجاج: تو کہاں پیدا ہوا تھا؟

لڑکا: جنگل میں۔

حجاج: اور پروان کہاں چڑھا؟

لڑکا: صحرا میں۔

حجاج: کیا تو دیوانہ ہے کہ تیرا علاج کراؤں؟

لڑکا: اگر میں دیوانہ ہوتا تو تیرے دربار تک رسائی نہ ملتی اور تیرے ساتھ اس طرح گفتگو نہ کرتا۔ بلکہ درباریوں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے تیرے آگے کھڑا رہتا تاکہ میرے اوپر بھی تیرا کچھ انعام واکرام ہو، یا سزا کے خوف سے تیرے آگے عاجز ولاچار کی طرح پرامید نگاہیں لے کر کھڑا ہوتا۔

حجاج: امیر المومنین کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

لڑکا: اللہ تعالیٰ ابو الحسن حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

حجاج: میری مراد وہ نہیں جو تو سمجھا، میں تو عبدالملک بن مروان کی بات کر رہا ہوں۔

لڑکا: ارے وہ! وہ تو فاسق وفاجر ہے۔

حجاج: تیرے لیے بربادی ہو! تو نے امیر المومنین کو فاسق وفاجر کیوں کہا؟

لڑکا: وہ ایک ایسی غلطی کا مرتکب ہوا ہے کہ اس سے بڑی غلطی کوئی ہو نہیں سکتی۔

حجاج: وہ کون سی غلطی ہے؟

لڑکا: اس نے تجھ جیسے ظالم کو اپنی رعیت پر حاکم مقرر کر رکھا ہے، اور تو لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ کرتا ہے اور ان کا ناحق خون بہاتا ہے۔

یہ سنتے ہی حجاج آگ بگولا ہو گیا اور اپنے درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا: بتاؤ اس گستاخ لڑکے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ درباریوں نے کہا: اس لڑکے کو قتل کروا دیجیے۔ اس کا قتل مباح ہے، کیونکہ اس نے اطاعت اور فرمانبرداری کا طوق اتار دیا ہے۔ یہ سراسر بغاوت کا مرتکب ہوا ہے۔

لڑکا: اے حجاج سن! تیرے درباری اور حاشیہ نشین، تیرے بھائی فرعون کے درباری اور امراء سے بھی برے ہیں۔ ارے! ان سے تو وہ اچھے تھے کہ جب ان سے فرعون نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو انھوں نے کہا: أَرْجِهْ وَأَخَاهُ ''اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے دو۔'' اور یہ تجھے میرے قتل کا مشورہ دے رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! جب تو اللہ رب العزت کے دربار میں کھڑا ہو گا تو تیرے پاس کوئی دلیل اور کوئی وجہ نہیں ہو گی۔ اور تجھے خوب معلوم ہے کہ اس دن ظالم اور متکبر خوب ذلیل ورسوا ہوں گے۔

حجاج: لڑکے سن! اپنی زبان سنبھال کر بات کر اور بڑوں سے بات کرنا سیکھ۔ میں نے تیرے بارے میں حکم دیا ہے کہ تجھے چار ہزار درہم عطا کیے جائیں۔

لڑکا: مجھے تیرے مال و دولت کی کوئی ضرورت نہیں......

«بَيَّضَ اللّٰهُ وَجْهَكَ وَأَعْلَى كَعْبَكَ».

''اللہ تیرا چہرہ سفید کرے اور تجھے بلند کرے۔''

یہ دعائیہ کلمہ ہے لیکن لڑکے نے بددعا مراد لی۔

حجاج نے اپنے درباریوں کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: تمہیں معلوم ہے کہ اس کا «بَيَّضَ اللهُ وَجْهَكَ وَأَعْلَى كَعْبَكَ» کہنے سے کیا مراد ہے؟

درباریوں نے کہا: آپ ہی بتائیں۔

حجاج: سفید چہرے (بَيَّضَ اللهُ وَجْهَكَ) سے مراد برص (کوڑھ) کی بیماری اور اندھے ہونے کی بددعا ہے اور (أَعْلَى كَعْبَكَ) سے میرے سولی پر لٹکائے جانے کو مراد لیا ہے۔ پھر لڑکے کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: بتا جو میں نے کہا ہے ٹھیک ہے یا غلط؟

لڑکا: اللہ تجھے غارت کرے...... تو کس قدر سمجھ دار ہے! یقیناً جو تو نے میرے الفاظ کی تفسیر اور شرح بیان کی ہے، وہ درست ہے اور یہی میری مراد تھی۔

حجاج: شدید غصے کے عالم میں اس کی طرف متوجہ ہوا، غصے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ گستاخ لڑکے! تیری یہ جرأت تو ہمارے سامنے اس قسم کی بدزبانی اور بکواس کرتا ہے۔ لے جاؤ اور اس کو قتل کر دو!

دربار میں سناٹا چھا گیا، ایک بارہ تیرہ سال کا معصوم بچہ' جو ذہانت' عقل مندی' حاضر جوابی اور بہادری میں بے مثال ہے، قتل ہو جائے گا۔ لوگوں کو اس پر رحم آنے لگا۔ رقاشی نام کا ایک درباری جو حجاج کا چہیتا تھا' عرض کرنے لگا: اللہ امیر کو اور زیادہ عزت و شرف دے، یہ لڑکا مجھے عنایت کر دیں۔

حجاج: اچھا، تم مانگتے ہو تو یہ میں تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ مگر سنو! یہ درست ہے کہ اب یہ تمہارا ہو گیا مگر میری دعا ہے کہ تمہیں اس میں برکت نہ ہو۔

لڑکا: مجھے نہیں معلوم، تم دونوں میں سے کون زیادہ احمق ہے، ہبہ کرنے والا یا مجھ کو طلب کرنے والا؟

رقاشی کہنے لگا: لڑکے! تم عجیب و غریب ہو، میں نے تمہیں قتل ہونے سے بچایا ہے اور تم میرا ہی مذاق اڑا رہے ہو اور مجھ پر ہی پھبتیاں کس رہے ہو!

لڑکا: مجھے شہادت مبارک ہو۔ اللہ کی قسم! اللہ کی راہ میں شہید ہو جانا اپنے گھر والوں کے پاس جانے سے کہیں بہتر اور افضل ہے۔

حجاج: لڑکے! ہم نے تمہارے لیے ایک لاکھ درہم انعام کا حکم دیا ہے۔ تم نے جو کڑوی، کسیلی گفتگو کی ہے، اس کو ہم نے اس لیے معاف کر دیا ہے کہ تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ تمہارا ذہن صاف ہے اور تم اللہ پر بھرپور بھروسا کرنے والے ہو اور دیکھو میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ تم کبھی ارباب حکومت کے ساتھ اس قسم کی گفتگو مت کرنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ برداشت نہ کر سکیں اور جس طرح ہم نے تمہیں معاف کیا ہے وہ معاف نہ کر سکیں۔

لڑکا: دراصل معافی تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے ہاتھ میں نہیں اور شکر بھی تمہارا نہیں بلکہ اکیلے اللہ رب العزت کے لیے ہے۔ اور میں دعا کرتا ہوں کہ کبھی میں اور تم کسی مجلس میں دوبارہ آمنے سامنے نہ ہوں۔

لڑکا یہ گفتگو کر کے جب دربار سے باہر نکل رہا تھا تو سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا۔ مگر حجاج نے انھیں کہا کہ اس کا راستہ چھوڑ دو۔ میں نے ساری زندگی اس سے زیادہ فصیح اللسان، قادر الکلام اور بہادر لڑکا نہیں دیکھا اور شاید مستقبل میں بھی نہ دیکھوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر یہ لڑکا زندہ رہا تو یقیناً یہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ اور یہ عجوبۂ وقت ہو گا۔ تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ لڑکا زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔ غالباً اس کو حجاج ہی کے اشارے پر زہر دے کر ختم کر دیا گیا۔ (واللہ اعلم)

غلام کی سخاوت

عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما سخاوت میں بڑے مشہور تھے۔ ایک مرتبہ کسی باغ کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ایک غلام کو دیکھا، وہ باغ میں کھجوریں اکٹھی کر رہا تھا، اور دیگر چھوٹے موٹے کام کر رہا تھا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ بڑا پسند آیا اور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگے۔ اتنے میں باغ کے مالک کا بیٹا آیا۔ اس کے ہاتھ میں دو روٹیاں تھیں۔ اس نے غلام کو روٹیاں تھمائیں، چنانچہ وہ ذرا ہٹ کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

اسی دوران ایک کتا اس غلام کی طرف آگے بڑھا اور اس نے دم ہلانا شروع کر دیا۔ غلام نے ایک روٹی کتے کے سامنے پھینک دی۔ کتے نے جلدی سے روٹی کھالی اور دوبارہ غلام کی طرف دیکھ کر دم ہلانے لگا۔ غلام نے دوسری روٹی بھی اس کی طرف پھینک دی اور خود کام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما کو اس کے اس کام پر بڑا تعجب ہوا، اس کے قریب آئے اور پوچھا: اے لڑکے: تمہاری ہر روز کی خوراک کیا ہے؟

غلام بولا: وہی جو آپ نے دیکھی ہے۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پھر تم نے اس کتے کو اپنی دونوں روٹیاں کیوں کھلا دیں؟

غلام کہنے لگا: حضرت! ہمارے اس علاقے میں کتے نہیں ہوتے، میرا خیال ہے کہ اس کتے کو سخت بھوک ہی اس علاقے میں لے کر آئی ہے، اس لیے میں نے ایثار سے کام لیا اور اپنی روٹی اس کو کھلا دی۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم آج رات کیا کھا کر گزارو گے؟

وہ کہنے لگا: آج کی رات بھوکا سو جاؤں گا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے دل میں کہنے لگے:

«يُلُومُنِي النَّاسُ عَلَى السَّخَاءِ! وَهَذَا الْغُلَامُ أَسْخَى مِنِّي»

"لوگ میری سخاوت کو دیکھ کر میری سرزنش کرتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ یہ ضرورت سے زیادہ سخاوت کرتا ہے)، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نوجوان غلام مجھ سے کہیں زیادہ سخی ہے۔"

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما اس غلام کے مالک کے پاس جا پہنچے اور عرض کیا: بھئی! یہ غلام مجھے بیچ دو۔

غلام کے مالک نے پوچھا: حضرت! آپ اس کو کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟

عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے اس کو سارا قصہ سنایا اور کہا: میری خواہش ہے کہ اس غلام کو خرید کر آزاد کر دوں، نیز یہ باغ بھی خرید کر اسے ہبہ کر دوں، تاکہ یہ آرام سے زندگی گزارے۔

اس غلام کا مالک کہنے لگا: جناب! آپ نے تو اس کی ایک ہی خوبی دیکھی ہے اور آپ اس پر اتنے مہربان اور متاثر ہو گئے ہیں، ہم تو ہر روز اس کی بے شمار خوبیاں دیکھتے ہیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس غلام کو اللہ کی خوشنودی کی خاطر آزاد کر دیا اور رہا یہ باغ! تو یہ بھی میری طرف سے اس کو ہدیہ ہے۔

بے بس بت

یثرب میں اسلام کی روشنی ابھی نئی نئی تھی۔ ابھی بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ عمرو ابن جموح بنوسلمہ کے ایک سردار تھے اور ان کے بت کا نام ''منات'' تھا، یہ بت نہایت قیمتی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ماہر کاریگر نے اس کی تراش خراش میں کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔ عمرو اس کو ہر روز خوشبو میں بساتا، اس کو بناتا سنوارتا' اس کی صفائی کرتا' صبح وشام اس کی زیارت کرتا اور حتی الامکان اس پر اپنا مال و دولت نچھاور کرتا، وہ اس کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔

ایک دن عمرو بن جموح منات کے سامنے نہایت عاجزی و انکساری سے کھڑا ہوا' پہلے تو اس کی خوب تعریف کی' اس کے مناقب بیان کیے اور پھر کہنے لگا: منات! تمہیں تو علم ہی ہے ہمارے شہر میں جو ایک نئے دین کا سفیر آیا ہے' اس نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ وہ ہمیں تم سے ہٹا دے! وہ ہمارے دلوں میں سے تمہاری محبت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ میں اس سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس سے صاف صاف بات کروں۔ مگر میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے تم سے مشورہ کروں اور پھر اس سے بات کروں۔ برائے مہربانی تم مجھے مشورہ دو کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

منات نے اس کی گفتگو کا کوئی جواب نہ دیا۔

عمرو نے پھر نہایت عاجزی سے کہنا شروع کیا: لگتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو گئے ہو۔ ارے! میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہہ دی جو تمہیں بری لگی ہو۔ خیر، اگر تم

ناراض ہو گئے ہو تو کوئی بات نہیں، میں تمہارے پاس چند دنوں کے بعد آؤں گا تاکہ تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔

ادھر عمرو کے بیٹے معاذ بن عمرو مسلمان ہو چکے تھے۔ انھیں اپنے باپ کی منات سے محبت کا علم تھا۔ انھوں نے اپنے گہرے دوست معاذ بن جبل ؓ سے اس بارے میں مشورہ کیا، یہ دونوں ہی بنوسلمہ کے نوجوان تھے، اور دونوں نے مل کر ایک منصوبہ بنایا۔ رات کو جب والد سو گئے تو دونوں منات کے پاس آئے، اس کو کندھوں پر اٹھایا اور بنوسلمہ کے کنویں میں پھینک دیا۔ یہ ایک بے آباد کنواں تھا، قبیلہ بنوسلمہ کے لوگ اس کنویں میں گندگی پھینکا کرتے تھے۔

صبح سویرے عمرو حسبِ سابق اور حسبِ عادت تبرک حاصل کرنے کے لیے منات کی طرف چل دیا، جب اسے منات نظر نہ آیا تو بڑا حیران ہوا۔ اس نے زور سے کہا: ارے کون ہے وہ بدبخت! جس نے میرے معبود کے ساتھ آج رات ظلم و زیادتی کی ہے؟ اس کے بیٹے اپنے باپ کی آواز سن رہے تھے۔ وہ سوتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

عمرو اپنے پیارے بت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ غصے سے کانپتا، بھڑکتا، بڑبڑاتا ہوا اور اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا منات کو تلاش کر رہا تھا، دائیں بائیں دیکھا۔ منات نظر نہیں آیا۔ دیوانہ وار آگے بڑھا اور سامنے دیکھا تو منات گندگی کے کنویں میں الٹا پڑا ہوا نظر آیا۔ جلدی سے اسے نکالا، اسے دھویا، خوشبو لگائی اور دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

اگلی رات بھی حضرت معاذ بن عمرو اور حضرت معاذ بن جبل ؓ نے اپنے دیگر نوجوانوں کے ساتھ مل کر منات کے ساتھ کل والا سلوک کیا۔ صبح سویرے اپنی عادت

کے مطابق عمرو پھر منات کی پوجا کرنے اور سلام کرنے اس کے کمرے میں گیا مگر منات وہاں موجود نہ تھا۔ بھاگتا ہوا کنویں کی طرف گیا تو اس نے دیکھا اس کا پیارا منات گندگی کے ڈھیر میں ڈھانپا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر اس کو قدرے دکھ بھی ہوا اور کراہت بھی محسوس ہوئی مگر پھر بھی وہ اس کا معبود تھا۔ اس کے دل میں اس کا بڑا احترام اور محبت تھی۔ اس نے گندگی کے ڈھیر سے اسے نکالا' دھویا' خوشبو لگائی اور دوبارہ مقررہ مقام پر رکھ دیا۔ اب کے اس نے منات کے گلے میں تلوار لٹکائی اور کہا: منات اے میرے معبود! اگر اب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارے ساتھ برا سلوک کرنا چاہے تو اس تلوار سے اپنی حفاظت کرنا۔

اگلے دن ان نوجوانوں نے نیا کام کیا۔ انھوں نے منات کو اٹھایا' ایک مرے ہوئے کتے کے ساتھ اس کو رسی سے باندھا' تلوار کو پرے رکھا اور پھر گندے کنویں میں پھینک دیا۔

اگلی صبح بوڑھا عمرو اٹھا۔ سیدھا منات کے کمرے میں گیا' کمرہ حسب سابق خالی تھا۔ اب وہ کنویں کی طرف گیا' اس کا منات کتے کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور گندگی سے لت پت تھا۔ تلوار بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اب عمرو کی عقل ٹھکانے آ چکی تھی۔ جب اس نے اپنے پیارے منات کو کتے کے ساتھ بندھا ہوا گندگی میں لت پت دیکھا تو پکار اٹھا:

«وَاللهِ! لَوْ كُنْتَ إِلٰهًا لَمْ تَكُنْ أَنْتَ وَكَلْبٌ وَسَطَ بِئْرٍ فِي قَرَنٍ».

''اللہ کی قسم! اگر تم معبود ہوتے تو تم اور کتا اس گندے کنویں میں کبھی اکٹھے نہ ہوتے۔''

اب عمرو غفلت کی نیند سے بیدار ہو چکا تھا' ایمان کی دولت سے سینہ منور

ہو چکا تھا، حقیقت سامنے آ چکی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کو ہمراہ لیا اور اپنے اسلام لانے کا اعلان کر دیا۔ پھر منات کے پاس گیا، اس کو اپنے قدموں سے روندا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ وہ سوچ رہا تھا: میں کتنا گمراہ تھا کہ ایک لکڑی کی پوجا کرتا رہا' میری زندگی کتنے اندھیرے میں تھی۔ اب وہ صراطِ مستقیم کا راہی تھا' اسلام کا مددگار اور معاون۔ اس کے سامنے ماضی کی کوتاہیوں کو دور کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اسلام پر ثابت قدمی سے چلے۔ عمرو نے اپنی اولاد' اپنا مال اور اپنی جان اسلام کے لیے وقف کر دی۔ (1)

---

(1) أسد الغابة (195/4)، سیر أعلام النبلاء (253/1) وغیرہ۔

تھپڑ مارنے کا انجام

امام بخاری ؒ اس واقعہ کو اپنی تاریخ میں محمد بن سیرین ؒ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ ایک آدمی کو دیکھا، وہ دعا مانگ رہا ہے اور کہہ رہا ہے: اے اللہ! تو مجھے معاف کر دے‘ مگر مجھے امید ہے کہ تو مجھے معاف نہیں کرے گا۔

میں نے اس سے کہا: اے اللہ کے بندے! غور تو کر! تو بیت اللہ میں کیا بات کر رہا ہے۔ تجھ سے کون سا ایسا گناہ سرزد ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی مایوسی کی بات کر رہا ہے اور تو اس سے ناامید ہے۔

کہنے لگا: سنو! جب حضرت عثمان ؓ کے خلاف فتنہ بپا ہوا تو میں باغیوں کے کہنے میں آ گیا، چنانچہ میں نے نیت کی کہ اگر مجھے موقع میسر آیا تو میں حضرت عثمان ؓ کے منہ پر (معاذ اللہ) تھپڑ ماروں گا۔ میں ان کی زندگی میں تو ایسی حرکت نہ کر سکا، تاہم جب ان کو شہید کر دیا گیا اور ان کو کفنا کر اندر کمرے میں رکھا گیا تو لوگ آ کر کمرے ہی میں ان کے چہرے کا دیدار کر رہے تھے۔ میں بھی چہرہ دیکھنے کے بہانے کمرے میں گیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہ تھا۔ مجھے موقع میسر آ گیا اور میں نے ان کے چہرہ مبارک سے کپڑا ہٹایا اور ان کو تھپڑ مارا۔ میرا دایاں ہاتھ اسی وقت سوکھ گیا۔

ابن سیرین کہتے ہیں: میں نے اس بدبخت کے ہاتھ کو دیکھا وہ لکڑی کی طرح سوکھا ہوا تھا۔

طلبِ حدیث میں کوشش

آج احادیث کا مجموعہ جو سیکڑوں کتابوں میں موجود ہے، محدثینِ کرام کی انتھک محنتوں کا ثمرہ ہے۔ محدثینِ کرام نے کافی دور دراز علاقوں کا سفر طے کر کے جس طرح احادیثِ رسول کو اکٹھا کیا ہے، اس کی مثال دنیا کی کسی بھی قوم میں نہیں ملتی۔

مشہور تابعی سعید بن میسّب ؒ فرمایا کرتے تھے: ''اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں! میں ایک حدیث سیکھنے کے لیے کئی کئی دنوں تک طویل سفر کیا کرتا تھا۔''

ابو عالیہ رفیع بن مہران جو 93 ہجری میں فوت ہوئے، فرماتے ہیں:

ہم بصرہ کے رہنے والے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث لوگوں سے سنا کرتے تھے۔ ہماری شدید خواہش تھی کہ حدیث براہ راست صحابی سے سماعت کریں اور وہ وقت آیا جب ہم نے بصرہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور براہ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حدیث کی سماعت کی۔

ابو یمن علیمی حنبلی اپنی کتاب ''منهج أحمد'' میں امام احمد بن حنبل ؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے سولہ سال کی عمر میں حدیث کا علم حاصل کرنا شروع کیا۔ 183 ہجری میں کوفہ تشریف لے گئے۔ پھر اسی سال انھوں نے امام سفیان بن عیینہ سے علم حدیث سیکھنے کے لیے مکہ مکرمہ کا سفر کیا اور پہلا حج بھی کیا۔ پھر 187 ہجری میں امام عبدالرزاق سے علم کے حصول کے لیے صنعاء (یمن) کا رخ کیا۔ اس سفر میں یحییٰ بن معین بھی ان کے ہمراہ تھے۔ رحمہم اللہ۔

ایک مشورہ

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ مَا دَامَ وَإِنْ قَلَّ».

”اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ اعمال وہ ہیں جو ہمیشہ کیے جائیں اگرچہ وہ تھوڑے ہوں۔“(1)

ذیل میں ایک چھوٹی سی تجویز ہے، کوشش کریں اس پر عمل ہو جائے:

قرآن پاک کے تیس پارے ہیں اور مہینہ بھی تیس دنوں کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم روزانہ ایک پارہ تلاوت کریں تو ہر ماہ قرآن کریم مکمل ہوسکتا ہے۔

ایک پارے میں عموماً 20 صفحات ہوتے ہیں۔ اگر آپ ہر نماز سے پہلے محض چار صفحات کی تلاوت کرلیں تو ایک تو آپ کو تکبیر اولیٰ مل جائے گی۔ آپ مسجد میں جلدی جانے کے عادی ہو جائیں گے اور ایک پارہ ختم کرنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہ آئے گی۔

میں نے ایک بزرگ کو دیکھا ان کی ٹیبل پر قرآن پاک رکھا ہوا تھا۔ جب وہ دفتر میں تشریف لائے تو تمام تر مصروفیت کے باوجود انھوں نے سیٹ پر بیٹھتے ہی پہلے ایک دو صفحات کی تلاوت کی، پھر قرآن پاک کو احترام کے ساتھ ایک طرف رکھا اور پھر کام شروع کر کے مہمانوں کی طرف توجہ دی۔

اسی طرح اگر ہم بھی یہ معمول بنالیں کہ روزانہ چند آیات قرآن پاک کی ضرور

---

(1) بخاری (5861)، مسلم (782)۔

تلاوت کریں گے تو ان شاء اللہ ہم اپنے نامۂ اعمال میں بے شمار نیکیاں جمع کر لیں گے اور ہمیں مشقت کا احساس بھی نہ ہوگا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوگا جب میزان عدل قائم ہوگی اور ہماری نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا اور پھر ہمیں اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ملے گا۔

یہ واضح رہے کہ:

«إِنَّ قَلِيلًا دَائِمًا خَيْرٌ مِنْ كَثِيرٍ مُنْقَطِعٍ».

''تھوڑا کام جو ہمیشہ کیا جائے، ایسے زیادہ کام سے بہتر ہے جو وقفے وقفے سے ہو۔''

تیس ہزار دینار کا بیٹا

وہ مدینۃ الرسول کے رہنے والے تھے‘ جہاد کے بے حد شائق اور دلدادہ تھے‘ ان کا نام فرّوخ تھا۔ یہ بنو امیہ کے دور کا ذکر ہے۔ خراسان کی سرحدوں پر جہاد ہو رہا تھا‘ فروخ نے جہاد پر جانے کی نیت کی‘ بیوی سے مشورہ کیا۔ نیک سیرت بیوی نے کہا: ٹھیک ہے آپ جا تو رہے ہیں مگر آپ کو معلوم ہے کہ آپ چند ماہ بعد ایک بچے کے باپ بننے والے ہیں؟ فروخ پر جہاد کی دھن سوار تھی‘ وہ متعدد بار لڑائیوں میں شریک ہو چکے تھے۔ انھوں نے بیوی کو جہاد کی اہمیت اور فضیلت سے آگاہ کیا اور کہا: گزر بسر کے لیے تیس ہزار دینار تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ میرے آنے تک یہ رقم تمہارے لیے کافی ہوگی۔

فروخ جہاد پر گئے تو وہاں مشغول ہو گئے‘ ہر چند کہ بیوی کا خیال آتا مگر جہاد کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ یہ دور اسلامی فتوحات کا دور تھا‘ مسلمان سمرقند اور بخارا کو فتح کر کے آگے نکل رہے تھے۔ وقت کا پتا ہی نہ چلا، مدینہ منورہ سے نکلے ہوئے انھیں کم و بیش ستائیس سال گزر چکے تھے۔

پھر ایک دن آیا فروخ اس شان سے مدینہ منورہ واپس آئے کہ گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ پکڑے اپنے گھر آئے، نیزے سے دروازے کو دھکا دیا اور گھوڑے سمیت گھر کی دہلیز پار کی۔ اندر سے ایک نوجوان نکلا‘ ایک اجنبی شخص کو یوں گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو نوجوان کہنے لگا: اے اللہ کے دشمن! بغیر اجازت میرے گھر میں کیسے داخل ہو رہے ہو؟ فروخ بولے: اللہ کا دشمن

میں نہیں‘ تم ہو‘ تم میری بیوی، اور میرے گھر میں داخل ہوئے ہو۔ گھوڑے سے کودے اور نوجوان کا گریبان پکڑ لیا۔ بڑے میاں لگے شور مچانے اور نوجوان کو برا بھلا کہنے۔ اتنی دیر میں ان کے ہمسائے بھی شور سن کر اکٹھا ہو گئے۔ معاملہ کیا ہے؟ وہ دونوں سے پوچھ رہے تھے۔ کسی نے جا کر حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء کو بھی اطلاع دی کہ اس طرح جھگڑا ہو رہا ہے، چنانچہ وہ لوگ نوجوان کی مدد کرنے کے لیے دوڑے چلے آئے۔

یہ نوجوان جس کی حمایت میں علماء اور مشائخ بھاگے چلے آئے، ان کا نام ربیعہ الرائی تھا اور یہ بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ مسجد نبوی میں ان کا حلقہ درس تھا جس میں بڑے بڑے علماء شامل ہوتے تھے۔ ربیعہ کہہ رہے تھے: میں تمھیں لازماً سلطان کے پاس لے کر جاؤں گا۔ ادھر فروخ بھی کہہ رہے تھے: اللہ کی قسم! میرا تمہارا فیصلہ اب سلطان کے پاس ہی ہو گا۔ تم میری بیوی کے پاس ٹھہرے ہوئے ہو۔ شور شرابہ بڑھتا چلا گیا۔ فروخ کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

اتنے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی پہنچ گئے‘ لوگ ان کے احترام میں ادھر ادھر ہو گئے۔ وہ آگے بڑھے اور بڑے میاں سے کہا: یہ گھر یقیناً تمہارا نہیں‘ تمہارا کوئی اور گھر ہو گا۔ فروخ کہنے لگے: نہیں‘ یہ میرا گھر ہے اور میرا نام فروخ ہے۔ اتنی دیر میں ان کی بیوی نے اپنے خاوند کی آواز پہچان لی اور اندر سے نکل آئیں اور کہا: ارے! یہ تو میرے خاوند محترم ہیں اور یہ ربیعہ ان کا بیٹا ہے۔ جب یہ جہاد پر گئے تھے تو چند ماہ کے بعد پیدا ہوا تھا‘ انھوں نے تو اپنا بیٹا دیکھا بھی نہیں ہے۔ اب جب دونوں کو معلوم ہوا کہ وہ باپ بیٹا ہیں۔ تو ایک دوسرے کو گلے لگایا اور ملاقات کی خوشی میں بے اختیار رونے لگے۔

اب وہ گھر کے اندر گئے، بیٹھے، بار بار بیوی سے پوچھ رہے ہیں: یہ میرا بیٹا ہے؟ ارے! یہ تو جوان ہو گیا ہے۔ بیوی کہہ رہی ہے: ہاں، یہ آپ ہی کا بیٹا اور لختِ جگر ہے۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد فروخ نے اپنی بیوی سے کہا: تمھیں یاد ہے کہ میں تمھیں سفر پر جانے سے پہلے کچھ مال دے گیا تھا وہ کدھر ہے اور کہاں خرچ کیا ہے؟ ان کی بیوی کہنے لگی: میں نے اس کو دفن کر رکھا ہے کچھ دنوں کے بعد نکالوں گی۔ ادھر ربیعہ مسجد کی طرف چل دیے اور اپنے حلقہ درس میں مشغول ہو گئے۔ اس درس میں امام مالک، حسن بن زید، اور مدینہ منورہ کے اشراف کے علاوہ بہت سارے علماء اور عوام شامل تھے۔ درس جاری تھا۔

کچھ دیر کے بعد ربیعہ کی والدہ نے اپنے خاوند سے کہا: جایئے، مسجد رسول ﷺ میں نماز ادا کر آیئے۔ چنانچہ فروخ مسجد میں آئے، نماز ادا کی، ایک طرف دیکھا کہ حلقہ درس میں بڑے بڑے علماء بیٹھے ہیں اور ایک نوجوان انھیں درس دے رہا ہے۔ فروخ اس حلقہ کے پاس آ کر کھڑے ہوئے اور نوجوان کو دیکھنا شروع کیا۔ اس روز ربیعہ نے خلافِ معمول سر کو زیادہ ڈھانپا ہوا تھا، ٹوپی اس طرح اوڑھے ہوئے تھے کہ چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ ان کے والد فروخ کو شک سا گزرا کہ کہیں یہ میرا بیٹا ربیعہ تو نہیں۔ انھوں نے تصدیق کے لیے حلقہ درس میں بیٹھے ایک شخص سے پوچھا: یہ نوجوان جو درس دے رہا ہے، کون ہے؟ اس نے کہا: یہ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن ہیں۔

اب فروخ کہنے لگے: الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے کو یہ مرتبہ اور مقام دیا ہے۔ خوشی خوشی گھر واپس آئے۔ آ کر بیوی سے کہنے لگے: میں نے تمھارے

بیٹے کو اس مرتبے اور مقام پر دیکھا ہے جہاں بہت کم اہلِ علم پہنچ پاتے ہیں۔ ربیعہ کی والدہ بولی: سچ بتائیں، آپ کو تیس ہزار دینار محبوب ہیں یا اپنے بیٹے کا علمی مقام اور مرتبہ؟ فروخ بولے: ہرگز نہیں! اصل مقام اور مرتبہ تو علم ہے۔ بیوی کہنے لگی: پھر میں نے سارا مال آپ کے بیٹے کی تربیت اور تحصیل علم پر خرچ کر دیا ہے۔ فروخ کہنے لگے:

«فَوَاللهِ! مَا ضَيَّعْتِهِ».

"اللہ کی قسم! تم نے اس مال کو ضائع نہیں کیا۔"(1)

علامہ ذہبی نے ابنِ سعد کے حوالے سے لکھا ہے کہ ربیعہ الرائی کا انتقال مدینہ منورہ میں ۱۳۶ھ میں ہوا۔

---

(1) سیر أعلام النبلاء (93/6)۔

پہلا مولود

مدینہ منورہ کی گلیوں میں غیر معمولی رش تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ تیزی کے ساتھ اللہ اکبر کے نعرے لگاتا' ایک دوسرے کو مبارک باد دیتا ہوا مسجد نبوی کی طرف گامزن تھا۔ ان میں پیش پیش سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کو تباہ و برباد کرے! ان کی تمام خواہشات ناکام ہوگئیں، وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آج غیر معمولی طور پر خوش تھے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے کہ آج وہ پہلی مرتبہ نانا بنے تھے۔ مسجدِ نبوی میں پہنچے تو اللہ کے رسول ﷺ کا چہرۂ مبارک بھی خوشی سے تمتما رہا تھا۔ ادھر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنے نومولود کو اللہ کے رسول ﷺ کی جھولی مبارک میں ڈال دیا۔

آپ نے کھجور منگوائی، اپنے دہن مبارک میں اس کو چبایا اور پھر بچے کے منہ میں اپنا لعابِ مبارک ڈال دیا، اور اس بچے کا نام عبداللہ رکھا۔ اس طرح اس بچے کے پیٹ میں سب سے پہلے جو چیز داخل ہوئی وہ آپ ﷺ کا لعابِ مبارک تھا۔ یوں تو بے شمار بچے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مگر اس بچے کو اس لحاظ سے انفرادیت حاصل تھی کہ ہجرت کے بعد یہ پہلا صحیح سلامت مسلمان بچہ پیدا ہوا تھا۔

جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو یہودیوں نے یہ افواہ اُڑا دی کہ ان کے کاہنوں نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور اب ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوگا۔ اور اتفاق سے ہوا بھی یہی کہ یا تو بچہ پیدا ہی نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو پیدا

ہوتے ہی وفات پا گیا۔ اس طرح یہودیوں کو چہ میگوئیاں کرنے کا خوب موقع مل گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ہجرت کی مشقت برداشت کرتے ہوئے مکہ سے قبا پہنچیں، ان کے ہاں ولادت متوقع تھی' چنانچہ قبا میں انھوں نے ایک خوبصورت سے بچے کو جنم دیا۔ اس بچے کی پیدائش پر غیر معمولی خوشی منائی گئی' اللہ اکبر کے نعرے لگے اور یہ نعرہ اس قدر زور سے لگایا گیا کہ مدینہ گونج اٹھا، کیونکہ یہودیوں کا پروپیگنڈا ناکام ہو چکا تھا۔ (1)

آیئے! ہم ہجرت کے بعد پیدا ہونے والے اس بچے کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں۔ ان کا نامِ نامی اسمِ گرامی عبداللہ ہے۔ نسب نامہ یہ ہے:

عبداللہ بن زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی۔ ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی سگی پھوپھی تھیں اور رسولِ اکرم ﷺ کی پھوپھی صفیہ بنت عبد المطلب حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی والدہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی دادی تھیں، جو مسلمین اولین میں شامل تھیں اور بہت ہی بہادر خاتون تھیں، یہ شاعری بھی کیا کرتی تھیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی والدہ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما تھیں، وہ قدیم الاسلام اور مبشرات بالجنة میں سے تھیں۔ سفرِ ہجرت میں ان کا کردار کسی سے مخفی نہیں۔ ان کی خالہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نانا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، جو انبیاء کے بعد امت میں سب سے افضل ترین شخصیت ہیں۔ اتنا اچھا حسب ونسب بہت کم لوگوں کو میسر ہے' تو گویا حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما والد اور والدہ دونوں ہی کی جانب سے نجیب اور شریف النسب تھے۔

---

(1) سیر أعلام النبلاء (365/3)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان سے اتنی زیادہ محبت کیا کرتی تھیں کہ جب وہ ذرا بڑے ہوئے تو انھیں اپنی بہن سے مانگ لیا اور پھر ان کی پرورش اور تربیت خود کی اور اللہ کے رسول ﷺ کے کہنے پر اپنے آپ کو ام عبداللہ کہلواتی تھیں اور یہ عبداللہ یہی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تھے۔ ذہانت، دانائی، خطابت، حاضر جوابی، نیکی تقویٰ، تیراندازی، تلوارزنی اور شجاعت میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا تین چیزوں میں کوئی مقابل نہ تھا۔ شجاعت میں، عبادت میں اور بلاغت میں۔ غضب کے خطیب تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ان کی پہلی غذا اللہ کے رسول ﷺ کا لعابِ دہن تھا۔

حاضر دماغی اس قدر کہ ایک مرتبہ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، وہاں سے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ دوسرے بچوں نے دیکھا تو فوراً بھاگ کھڑے ہوئے مگر یہ اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تم دوسرے بچوں کی طرح کیوں نہیں بھاگے؟ تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا کہ آپ سے ڈر جاؤں اور راستہ بھی تنگ نہیں ہے کہ آپ کے لیے راستہ چھوڑ کر ہٹ جاؤں۔

ابھی بچے ہی تھے کہ (ایک روایت کے مطابق اپنے والد محترم کے کہنے پر) مدینے کے بچوں کو اکٹھا کیا اور کہنے لگے کہ جس طرح بڑے لوگ اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کرتے ہیں، ہم بچے کیوں نہ کریں؟ چنانچہ دیگر بچوں کی قیادت کرتے ہوئے مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! ہم آپ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ دوسرے بچے تو کھسک گئے اور یہ کھڑے رہے، آپ نے

فرمایا: اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ چنانچہ ننھے سے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے آپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے بڑی محبت اور پیار سے ان کو تمغے سے نوازا۔ ارشاد ہوا: "أَنْتَ ابْنُ أَبِيكَ"

اس کا سادہ اور لفظی ترجمہ یہ بنتا ہے کہ "تو اپنے باپ کا بیٹا ہے۔"

مراد یہ ہے کہ تمہارے اندر اپنے باپ کی صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اور باپ بھی کون، جو اللہ کے رسول ﷺ کی پھوپھی کے بیٹے' حوارِیِ رسول اور عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے۔ حضرت عبداللہ کا لقب رضی اللہ عنہ حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) رکھا گیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی زندگی کے بے شمار واقعات ہیں۔ مگر ان کی قیادت کی صلاحیت اس وقت ظاہر ہوئی جب ان کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے لشکر کے ایک دستے کا کمانڈر بنا کر افریقہ بھیجا تھا۔ لشکر کی قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دودھ شریک بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔

ہر روز صبح سویرے لڑائی ہوتی، دونوں فوجیں آمنے سامنے آتیں' مبارزت طلب کی جاتی اور دوپہر تک لڑائی ہوتی رہتی۔ دونوں طرف سے فوجی تھک ہار جاتے تو لڑائی اگلے دن کے لیے ملتوی کر دی جاتی اور اگلے دن پھر از سرِ نو تازہ دم ہو کر فوجی آمنے سامنے کھڑے ہوتے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی عمر اس وقت 27 سال تھی۔ سپہ سالار کے خیمے میں فوجی قیادت کا اجتماع ہو رہا ہے' ہر کوئی اپنی اپنی رائے دے رہا ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی باری آئی تو کہا:

میں آپ کی حکمتِ عملی سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ آپ آدھا دن لڑائی کیوں کرتے ہیں؟ پورا دن لڑائی ہونی چاہیے۔

ان کو جواب ملا: سپاہی تھک جاتے ہیں' ان کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: نہیں ہرگز نہیں! دشمن کو تھکنے دیں، ان پر پورا دن حملے کرتے رہیں تاکہ ان کو شکست فاش سے دوچار کیا جا سکے۔

سپہ سالار نے پوچھا: آپ کی کیا تدبیر ہے؟

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: فوج کے دو حصے کیے جائیں؛ ایک حصہ صبح سویرے لڑائی شروع کرے اور دوپہر تک لڑتا رہے' دوسرا حصہ اس دوران آرام کرتا رہے۔ دوپہر کے وقت غیر محسوس طریقے سے تازہ دم سپاہی آگے بڑھیں اور تھکے ہوئے سپاہی واپس آ جائیں۔ اس طرح ایک ہی دن میں لڑائی کا فیصلہ ہو جائے گا۔

سالارِ اعلیٰ نے کمان حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو سونپ دی۔ اگلے دن ان کی حکمت عملی کے مطابق جنگ شروع ہوئی۔ دشمن دوپہر کے وقت واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک تازہ دم دستہ آگے بڑھا اور دشمن کو تہ تیغ کر کے رکھ دیا۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نہایت جری بہادر اور نڈر تھے۔ بے حد قوی جسم کے مالک تھے اور اس کا سبب سیرت نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے سینگی لگوائی' خون ایک پیالے میں جمع تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما پاس کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عبداللہ! اس خون کو باہر ایسی جگہ گرا دو جہاں کوئی اس کو دیکھ نہ پائے۔

انھوں نے پیالہ لیا' گھر سے باہر آئے، ہاتھ میں پیالہ ہے اور سوچ رہے ہیں کہ اللہ کے رسول کا مقدس خون ہے' اس کو زمین پر گرا دوں؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! اور پھر اچانک ہی انھوں نے ایک عجیب فیصلہ کیا، پیالے کو منہ سے لگایا اور پی گئے۔

واپس آئے تو اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا: عبداللہ! خون کو کہاں گرایا؟

عرض کیا: اللہ کے رسول! ایک ایسی جگہ جہاں اس کو اللہ کے علاوہ کوئی

دیکھ نہیں سکتا۔ فرمایا: گویا تم نے اس کو پی لیا ہے۔ (1)

انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا: جس کا خون میرے خون سے مل گیا، اس پر جہنم کی آگ حرام ہوگئی۔

اب جس کے خون میں اللہ کے رسول ﷺ کا خون مل گیا ہو، اس کی بہادری‘ دلیری اور شجاعت کے کیا کہنے۔ اور اس کا مظاہرہ انھوں نے افریقہ میں اس طرح کیا کہ جنگ سُبَیْطَلہ میں عیسائیوں کا ٹڈی دَل لشکر ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد میں تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمان محض بیس ہزار تھے۔ دشمن کی قیادت بادشاہ جرجیر کر رہا تھا۔ مقابلہ شروع ہوا، عددی لحاظ سے دشمن نہایت طاقتور...... دونوں طرف سے بہادر میدان میں ہیں...... نیزہ‘ تلوار‘ تیر‘ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز...... دشمن کی فوجوں کو ان کا بادشاہ بھڑکا رہا تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے سوچا کہ اگر اس کا خاتمہ ہو جائے تو فوج کی ہمت ٹوٹ جائے گی۔ سپہ سالار عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ اپنا منصوبہ بتایا اور کہا: مجھے چند باہمت اور موت پر بیعت کیے ہوئے نوجوان درکار ہیں جو میرے ساتھ ہوں، تاکہ میں بادشاہ کو قتل کر سکوں۔

بظاہر منصوبہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آگے بڑھے، دشمن کے فوجیوں نے سمجھا کہ یہ صلح کے لیے ان کے بادشاہ کے پاس جا رہے ہیں اور وہ راستہ چھوڑتے گئے۔

ادھر بادشاہ جرجیر گھوڑے پر سوار لونڈیوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ دو لونڈیاں مور چھل سے پنکھا کر رہی تھیں کہ اچانک عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سامنے آئے۔ بادشاہ کو اپنی

---

(1) المستدرك للحاكم (554/3) وعزاه الهيثمي فى المجمع (270/8) إلى الطبرانى والبزار وقال: رجال البزار رجال الصحيح غير هنيد بن القاسم وهو ثقة.

جان خطرے میں محسوس ہوئی، گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ مگر ادھر مقابلے میں ابن زبیر ؓ تھے۔ انھوں نے نیزا مارا جو پیچھے لگا۔ وہ نیچے گرا اور انھوں نے لپک کر چشم زدن میں اس کی گردن کاٹ کر نیزے پر چڑھا دی۔ اونچی آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ادھر ہمراہیوں نے دشمن پر ہلّا بول دیا۔ اپنے بادشاہ کے سر کو نیزے پر دیکھ کر دشمن کے حوصلے پست ہو گئے اور میدان اللہ کے شیروں کے ہاتھ رہا۔

سیرت نگاروں نے جرجیر بادشاہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے لڑائی سے پہلے اعلان کیا تھا:

’’جو شخص مسلمانوں کے سپہ سالار یعنی عبداللہ بن سعد ؓ کو قتل کر کے اس کا سر لائے گا، میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دوں گا اور ایک لاکھ دینار انعام میں دوں گا۔‘‘

اس اعلان کے بعد عبداللہ بن سعد ؓ کی حفاظت کا خصوصی انتظام تھا۔ مگر ابن زبیر ؓ کے زرخیز ذہن نے یہ مشورہ دیا کہ فوج میں اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص جرجیر کا سر لائے گا، اس کا نکاح جرجیر کی بیٹی سے کر دیا جائے گا اور انعام میں ایک لاکھ دینار دیے جائیں گے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ جرجیر کے قتل کے بعد سپہ سالار نے اپنے وعدے کو پورا کرنا چاہا۔ مگر عبداللہ بن زبیر ؓ نے کہا: میں نے جہاد اللہ کی رضا کے لیے کیا تھا، دنیاوی لالچ اور مال و متاع مجھے درکار نہیں۔

وہ فتح افریقہ کے علاوہ اندلس اور قسطنطنیہ کی فتوحات میں بھی شامل رہے اور کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

پھر تاریخ نے ایک دن ایسا بھی دیکھا کہ یزید بن معاویہ ؒ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معاویہ ثانی خلیفہ بنا۔ وہ 18 سال کی عمر کا کمزور اور نوعمر لڑکا تھا اور جلد ہی بغیر کسی کو خلیفہ مقرر کیے فوت ہو گیا۔ اب حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کے لیے میدان خالی تھا۔ مکہ کے لوگوں نے بیعت کی تو اہل حجاز نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔ ادھر خبر مدینہ منورہ پہنچی تو وہاں کے باشندگان نے بھی اطاعت میں سر جھکا دیے۔ انھوں نے اموی دور کے والیوں کو ہٹایا اور ان کی جگہ اپنے وفادار ساتھی مقرر کرتے گئے۔

عبداللہ بن زبیر ؓ کی حکومت زیادہ دیر نہ چل سکی۔ شام پر بنو امیہ کی حکومت تھی۔ انھوں نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کی کوششیں شروع کیں۔ پھر اہلِ مصر کو ساتھ ملایا اور عراق پر چڑھ دوڑے۔ ادھر عبداللہ بن زبیر ؓ نے اپنے بھائی مصعب کی جگہ اپنے بیٹے حمزہ کو والیٔ عراق بنا دیا۔ فریقین میں جنگ ہوئی۔ اموی غالب رہے اور حضرت مصعب شہید ہو گئے۔ آہستہ آہستہ حجاز کو چھوڑ کر باقی علاقوں پر امویوں نے اپنا اقتدار مضبوط کر لیا اور پھر مکہ مکرمہ پر قبضہ کرنے کے لیے 72 ہجری میں حجاج بن یوسف دو ہزار فوجیوں کے ساتھ آیا۔ اُس نے حرص اور لالچ کے علاوہ ڈرانے دھمکانے سے بھی کام چلایا اور عبداللہ بن زبیر ؓ کے ساتھی آہستہ آہستہ حجاج کے ساتھ ملتے چلے گئے۔ پھر کعبۃ اللہ کو منجنیق سے نشانہ بنایا گیا۔ حضرت عبداللہ ؓ کو اطاعت کے لیے مجبور کیا گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ حضرت اسماء ؓ 92 سال کی تھیں، بینائی ختم ہو چکی تھی۔ آپ ان سے مشورے کے لیے گئے تو انھوں نے جو جواب دیا وہ تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا گیا۔ ابن زبیر نے عرض کیا: اماں جان! میرے رشتہ داروں اور عزیزوں نے

میرے ساتھ بے وفائی کی، مجھے چھوڑ کر چلے گئے، اب چند ساتھی بچے ہیں، شکست واضح ہے، کیا کروں؟

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے جواباً فرمایا: میرے عزیز بچے! اگر تم اللہ کو راضی کرنے کے لیے لڑ رہے تھے اور سمجھتے ہو کہ تم حق پر ہو تو پھر اپنے شہید ساتھیوں سے جا ملو اور دشمن کے سامنے سر نہ جھکانا اور اگر تم دنیا کے لیے یہ لڑائی لڑ رہے تھے تو تم جیسا غلط شخص کوئی نہیں کہ اپنے رفقاء کو اپنے سمیت ناحق مروا دیا اور اگر تم کہو کہ میں حق پر تھا مگر ساتھیوں کے شہید ہونے اور چھوڑنے کی وجہ سے کمزور ہو گیا، لہٰذا اپنے موقف سے ہٹ رہا ہوں تو یہ اہلِ دین اور آزاد لوگوں کا شیوہ نہیں ہے۔ ایسی زندگی سے موت کو گلے لگانا بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنی ماں کے گلے لگ گئے، ان کا ماتھا چوما اور عرض کیا:

اماں جان! میری موت پر صبر کرنا’ میں نے جان بوجھ کر کبھی منکر اور فحش کام نہیں کیے۔

میں نے کسی مسلمان پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ ہی کسی ذمی کو قتل کیا ہے۔

ہمیشہ اللہ کے حقوق اور واجبات ادا کیے ہیں۔

دعائیں لے کر ماں سے رخصت ہوئے اور تمام تر ترغیب و ترہیب کو ٹھکراتے ہوئے 14 جمادی الاولیٰ 73 ہجری کو خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ حجاج بن یوسف کے حکم سے نعش مبارک کو سولی پر چڑھایا گیا۔ بوقتِ شہادت عمر مبارک 73 سال تھی۔ رضی اللہ عنہ۔ (1)

---

(1) الإصابة (4700)، الاستيعاب (1553)، حلية الأولياء (337-329) البداية والنهاية (186/12)، أسد الغابة (241/3)۔

خوشۂ انگور کے بدلے وزارت

اگر کسی کو انگور کے خوشے کے بدلے میں وزارت مل جائے تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ اوہ! یہ کتنی سستی وزارت ہے! مگر حق اور سچ یہ ہے کہ ایک شخص کو انگور کے خوشے کے بدلے میں وزارت مل گئی۔ مگر اس داستان کے پیچھے سچائی، جود و کرم اور تقویٰ کی صفات کا وجود ہے۔ اس وزیر کا نام عون الدین ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ شیبانی تھا جو بغداد کے قریب الدور نامی بستی میں 499ھ میں پیدا ہوا اور ترقی کرتے کرتے عباسی خلیفہ مقتفی لأمر اللّٰہ اور اس کے بیٹے مستنجد باللّٰہ کے دور میں وزیر رہا۔ وزارت ملنے سے پہلے اس نے اپنی زندگی نہایت فقر و فاقہ اور گمنامی میں گزاری۔ نہایت صبر و تحمل سے اپنا وقت کاٹا۔ اس دوران بہت سے لوگوں نے اس پر ظلم و ستم روا رکھے مگر وزیر بننے کے بعد اس نے اپنے ساتھ گستاخی کرنے والوں اور دشمنوں سے انتقام لینے کی بجائے عفو و درگزر سے کام لیا۔ بدلہ لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس نے جود و کرم کا مظاہرہ کیا۔

وزارت ملنے کے بعد ایک دن اس کے پاس پولیس والے ایک آدمی کو ہتھکڑیوں میں جکڑ کر لائے۔ اس پر قتل کا الزام تھا، مدعی بھی ساتھ تھا، قتل ثابت ہو چکا تھا۔ اس نے ملزم کی طرف دیکھا تو فوراً پہچان گیا کہ یہ شخص اس کے گاؤں الدور کا رہنے والا ہے۔ یوں بھی وہ اس شخص کو کیسے بھول سکتا تھا، لاکھوں لوگوں میں بھی اس کو پہچان لیتا۔ اس نے مدعی کو اپنی طرف سے چھ سو دینار دیت دے کر راضی کر لیا اور یوں بھری عدالت میں ملزم کی ہتھکڑیاں اتار کر اس کو آزاد کر دیا۔ پھر اس نے ملزم کو پچاس دینار دینے کا حکم دیا۔ وہ شخص وزیر کو دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔ پھر

ابوالمظفر نے اپنے اردگرد لوگوں سے پوچھا:

«هَلْ تَعْلَمُونَ أَنَّ عَيْنِيَ الْيُمْنَى لَا أُبْصِرُ بِهَا؟» .

’’کیا تمہیں معلوم ہے کہ مجھے داہنی آنکھ سے کچھ نظر نہیں آتا؟‘‘

لوگوں نے کہا کہ ہمیں یہ تو معلوم نہیں۔ اس نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ میری داہنی آنکھ ضائع ہو چکی ہے اور اس کا سبب یہ شخص ہے جس کی طرف سے میں نے دیت دے کر اسے آزاد کیا ہے اور مزید اکرام بھی کیا ہے۔

میں ایک دن اپنے گاؤں الدور کی ایک سڑک پر بیٹھا ہوا تھا‘ میرے ہاتھ میں فقہ کی ایک کتاب تھی جس کے مطالعے میں محو تھا۔ یہ شخص اپنے ہمراہ پھلوں کے ٹوکرے کے ساتھ آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اسے اٹھاؤ اور میرے ہمراہ چلو۔ میں نے اس سے کہا کہ میں مزدور نہیں ہوں اور نہ ہی بار برداری کا کام کرتا ہوں‘ تو اس نے زور سے میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا جس سے میری یہ آنکھ ضائع ہو گئی۔ میں نے اس کو اس بری حالت میں دیکھا تو اس سے انتقام اور بدلہ لینے کی بجائے اس کے ساتھ نیکی اور احسان کیا۔

ایک دن ایک ترک سپاہی اس کے دفتر میں داخل ہوا تو اس نے اپنے باڈی گارڈ سے کہا کہ اس کو بیس دینار دے دو اور باہر سے رخصت کرا دو، دیکھو، یہ دوبارہ میرے دفتر میں داخل نہ ہونے پائے۔ پھر اس نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ایک مرتبہ ہمارے گاؤں الدور میں ایک آدمی قتل ہو گیا‘ ترکی کے سپاہی آئے اور مجھ سمیت تمام گاؤں والوں کو ہانکتے ہوئے لے گئے۔ یہ جو سپاہی ابھی گیا ہے ہم لوگ اس کے حصے میں آئے تھے۔ اس نے ہمارے ہاتھ پیچھے باندھ دیے، خود گھوڑے پر سوار ہوا اور ہمیں اپنے آگے بھاگنے کا حکم دیا۔ راستے میں میرے

ہمراہیوں نے اس کو درہم و دینار دینا شروع کر دیے۔ جو بھی اس کو نذرانہ پیش کرتا، یہ اسے چھوڑتا جاتا۔ مگر میرے پاس اپنی جان چھڑانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس نے مجھے بڑی بے دردی سے پیٹا۔ اسی دوران نماز عصر کا وقت ہو گیا' میں نے نماز کی اجازت چاہی جو نہ ملی بلکہ الٹا گالیوں سے نوازا گیا اور آج حالات کس طرح بدل گئے ہیں۔ اللہ نے مجھے اس پر غلبہ عطا کیا ہے' میں چاہوں تو اس سے بدلہ لے سکتا ہوں مگر میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔

وزیر بننے کا قصہ کچھ اس طرح ہے کہ وہ ایک نہایت مفلس اور قلاش خاندان میں پیدا ہوا۔ جو الدور نامی گاؤں میں مقیم تھا۔ خاندان کے لوگ معمولی زراعت پیشہ تھے۔ زراعت سے جو ملتا، ہنسی خوشی وقت گزارتے' کسی کے پاس پڑھنے پڑھانے یا علم حاصل کرنے کا وقت اور شوق کہاں تھا! مگر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ کا معاملہ اور تھا' یہ بچپن سے ذہین اور تیز فہم تھا' علم دوست تھا' علماء کی مجالس میں جاتا' وہاں اپنا بیشتر وقت گزار دیتا' جو سنتا اس کو یاد کر لیتا اور لکھ لیتا' حافظہ کمال درجے کا تھا' ادب سے خوب لگاؤ اور شعر و شاعری سے خوب شغف تھا، خود بھی شاعر تھا' دوسرے شعراء کے سیکڑوں اشعار اسے ازبر تھے۔ علماء کی مجالس اور حلقوں نے اس کے علم میں مزید اضافہ کیا اور یہ فقہ حنبلی کا مانا ہوا استاد بن گیا۔ علم کی تحصیل کے لیے اس نے بچپن ہی سے اپنا گاؤں چھوڑا اور بغداد آ گیا۔ یہاں کے علمی حلقوں میں خاصا معروف ہو گیا۔ چونکہ گھریلو حالات خاصے پتلے تھے اور کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ تھا' لہٰذا اس نے حکومت کے مختلف اداروں میں نوکری تلاش کرنا شروع کی۔ مگر جہاں بھی نوکری کے لیے جاتا وہاں سے جواب مل جاتا۔ بالآخر اس نے خلیفہ عباسی مقتفی لأمر اللہ کے دیوان خانے میں نوکری کے لیے درخواست دے دی۔ جب بھی وہ اپنے معاملے کا پتا

کرنے جاتا وہاں سے جواب ملتا کہ ابھی کوئی اسامی خالی نہیں ہے' پھر آنا۔ مسلسل کوشش کے باوجود اس کو نوکری نہ مل سکی، اس کے پاس جو درہم تھے، وہ بھی ختم ہو چکے تھے۔ نوکری کی امید بھی ختم ہوگئی تو اس نے اپنے گاؤں الدور واپس جانے کی ٹھانی۔

بغداد میں اس نے اپنا آخری درہم خرچ کیا اور اپنے گاؤں کی راہ لی۔ چونکہ زادِراہ ختم تھا لہٰذا پیدل ہی چل پڑا۔ تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ نماز عصر کا وقت آ گیا۔ ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی مسجد نظر آئے تو نماز عصر ادا کرلے۔ ذرا فاصلے پر راستے سے ہٹ کر ایک پرانی سی بے آباد مسجد نظر آئی تو اس کا رخ کیا۔ مسجد کے کنویں سے وضو کرنے کے بعد اس نے نماز شروع کی تو اس کو مسجد کی ایک جانب سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ نماز ختم کرنے کے بعد اس نے آواز کی جانب توجہ دی، مسجد کے ایک کونے میں ایک مریض لیٹا ہوا تھا' جب اس کو چھوا تو وہ بخار سے تپ رہا تھا' اس کا حال پوچھا تو کہنے لگا: میرے پورے جسم میں شدید درد ہے' اس کا دنیا میں کوئی رشتے دار یا دوست نہیں ہے' بے یارو مددگار ہے' اس لیے آبادی سے دور اس مسجد میں اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے۔ ابن ہبیرہ نے اس کو تسلی دی اور اس سے پوچھا کہ اسے کسی چیز کی خواہش ہے؟ مریض نے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ ہاں انگوروں کا خوشہ مل جائے کیونکہ میری دیر سے تمنا اور خواہش ہے کہ میں مرنے سے پہلے جی بھر کر انگور کھاؤں۔

ابنِ ہبیرہ نے اس کی خواہش سنی، خیالات میں گم ہوگیا انگوروں کے خوشے کی خواہش' مگر انگور کہاں سے ملیں' ہم تو آبادی سے دور ہیں' بازار بھی دور ہے' اور پھر میرے پاس کوئی دینار بھی نہیں ہے' مگر یہ مریض اور اس کی خواہش۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ آخر انگوروں کے حصول کی کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے' دم توڑتے

ہوئے ایک شخص کی خواہش ہے ہوسکتا ہے کہ اس کی دعا کی بدولت میری مشکلات اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ ایک فقیر اور غیر معروف شخص کے ساتھ نیکی اور بھلائی یقیناً اللہ کو راضی کرنے والی چیز ہے۔ یقیناً اس شخص سے کوئی بدلہ یا صلہ نہیں مل سکتا مگر یہ رب کو ضرور پسند ہے۔ میں اس کے لیے ضرور کوشش کروں گا۔ اس نے مریض سے کہا: میرا انتظار کرنا، میں ابھی جاتا ہوں اور تمہارے لیے انگوروں کا خوشہ لے کر آتا ہوں۔

ابنِ ہبیرہ تیز تیز قدموں سے آبادی کی طرف چل دیا تاکہ شام ہونے سے قبل انگور لا سکے‘ جب وہ پھلوں کی دکان میں داخل ہوا تو انگوروں کے کئی خوشے لٹک رہے تھے‘ اس نے ایک بڑے خوشے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس کی قیمت کیا ہے؟ دکاندار نے کہا کہ اس کی قیمت آدھا درہم ہے۔ ابن ہبیرہ نے کہا کہ اس وقت میرے پاس اس کی قیمت نہیں ہے کہ میں اپنا چوغہ تمہارے پاس گروی رکھ دیتا ہوں‘ جب میں تمہیں آدھا درہم دے دوں گا تو اپنا چوغہ لے لوں گا۔ دکاندار اس بات سے راضی ہو گیا۔ چنانچہ ابن ہبیرہ نے اپنا چوغہ رہن رکھ کر انگوروں کا خوشہ لیا اور بھاگتا ہوا مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ مسجد میں پہنچا تو آفتاب غروب ہو چکا تھا، اندھیرا چھا رہا تھا‘ اس نے وضو کیا اور نمازِ مغرب ادا کی۔ انگوروں کے خوشے کو پانی سے دھویا اور مریض کو پیش کر دیا۔ مریض نے خوشے کو دیکھا تو بہت زیادہ خوش ہوا اور تمام کا تمام کھا گیا‘ کہنے لگا: اللہ کا شکر ہے کہ موت سے قبل اس نے میری انگور کھانے کی خواہش کو پورا کر دیا! ایک مدت سے میری خواہش تھی کہ میں جی بھر کر انگور کھاؤں مگر مال نہ ہونے کی وجہ سے اپنی اس خواہش کو پورا نہ کر سکا۔

پھر اس نے ابنِ ہبیرہ کی طرف اپنا منہ پھیرا اور کہا: سن میرے بیٹے! لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرے لیے باعثِ رحمت بنا کر بھیجا ہے‘ میرے پاس بیٹھ تاکہ

میں مرنے سے پہلے تمہیں اپنی داستانِ زندگی سنا سکوں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آج رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔

ابنِ ہبیرہ اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس نے اپنی داستان شروع کی: میں خراسان کا رہنے والا ہوں' میرا نام احمد ہے اور میں ''مَرْو'' شہر کے معروف تاجروں میں سے تھا' میرا چھوٹا بھائی محمود بھی میری طرح تاجر تھا۔ کم و بیش ایک سال قبل میں نے اور میرے بھائی نے بغداد جانے کا ارادہ کیا تاکہ وہاں سے سامان تجارت خرید کر لائیں اور اسے مرو میں فروخت کریں۔ ایک قافلہ بغداد کے لیے روانہ ہو رہا تھا' میں نے کافی سامان تجارت خریدا تاکہ بغداد میں فروخت کر سکوں اور وہاں سے دیگر اجناس کو خرید کر مرو لے آؤں۔

میرے بھائی محمود نے وہاں سے کوئی سامان نہ خریدا، اس کے پاس نقد ایک ہزار دینار تھے' اس نے ان کو ایک چمڑے کی پیٹی میں محفوظ کیا۔ چونکہ میں اس سے عمر میں بڑا تھا اور یوں بھی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے سمجھدار اور ہوشیار تھا' لہٰذا یہ پیٹی اس نے میرے حوالے کر دی کہ میں اس کو اپنی کمر میں باندھ لوں اور اس کی حفاظت کروں۔

قافلہ بغداد کے لئے روانہ ہوا۔ اس میں کافی لوگ تھے' سامان تجارت زیادہ تھا قافلے کی حفاظت کے لئے نوجوان دستہ الگ تھا جو مسلسل اس کے آگے پیچھے چلتا رہا۔ خراسان سے بغداد تک کا فاصلہ بہت زیادہ تھا مگر ہم بخیر و عافیت سفر کرتے کرتے بغداد کے قریب پہنچ گئے' بس دو منزلیں باقی رہ گئی تھیں' پہرے داروں کی طرف سے اب ہوشیاری نہ رہی۔ اچانک ایک دن عصر کے بعد مسلح لٹیروں کے ایک دستے نے ہمارے قافلے پر حملہ کر دیا' یہ حملہ اتنا اچانک اور زوردار تھا کہ کسی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بہت سے مارے گئے' کتنے ہی زخمی ہو گئے اور کچھ

بھاگ نکلے۔ لٹیروں نے سامان لوٹا اور بھاگ گئے، خود میں بھی بری طرح سے زخمی ہوا۔ جب ہوش آیا تو رات ہو چکی تھی، اردگرد کتنے ہی مردہ اور زخمی لوگ تھے، میں نے اپنے آپ کو سنبھالا، رات جیسے تیسے کاٹی، اگلے دن کچھ لوگ ہماری مدد کے لئے پہنچ گئے۔ میں نے اپنے بھائی محمود کو تلاش کیا، مگر وہ نہ تو مجھے مقتولین میں نظر آیا اور نہ ہی زخمیوں میں۔ میں نے سوچا کہ وہ بغداد چلا گیا ہوگا، میرے زخم کافی گہرے تھے، ایک اور قافلے کے ساتھ میں بغداد پہنچ گیا اور وہاں اپنا علاج کراتا رہا۔ میرے پاس جو سرمایہ تھا وہ تو لٹ چکا تھا، لے دے کر ایک ہزار دینار میرے بھائی کا میرے پاس تھا، جو امانت تھا۔ باقی کچھ رقم جیب میں تھی، اس میں کچھ تو علاج کی نذر ہوگئی اور بقایا میں نے اپنے اوپر خرچ کر دی۔ کبھی کوئی مزدوری مل گئی تو کر لی، جو ملا اس سے گزر اوقات کر لی۔ اس دوران میں نے اپنے بھائی محمود کو تلاش کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی، مگر وہ نہ مل سکا۔

وہ رقم آج بھی میرے پاس تھیلی میں محفوظ ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج رات میری موت واقع ہو جائے گی۔ دیکھو! اگر میں مر جاؤں تو مجھے غسل دے کر اسی جگہ دفن کر دینا اور رقم والی تھیلی تم لے لینا۔ کوشش کرنا کہ میرا بھائی تمہیں مل جائے، اگر مل جائے تو یہ امانت اس کو پہنچا دینا اور اگر نہ ملے تو یہ تھیلی اور اس میں جو رقم ہے، جہاں تمہارا جی چاہے اس کو خرچ کرنا۔

ابنِ ہبیرہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں رات کو اس کے پاس ہی سو گیا، رات کو اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، میں نے کلمہ شہادت اور دیگر اوراد کی آواز سنی، آہستہ آہستہ آواز کم ہوتی گئی اور میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو غسل دیا، اس کی

نمازِ جنازہ پڑھی اور دفن کر کے تھیلی ہمراہ لے کر سفر پر روانہ ہوگیا۔ اب میرا رخ اپنے گاؤں الدور کی طرف نہیں بلکہ بغداد کی طرف تھا' میری جیب میں اب ایک ہزار دینار تھے۔ سب سے پہلے تو میں انگور کی دکان پر گیا' ایک دینار اس کے حوالے کیا' اس نے اس میں سے آدھا درہم لے کر میرا چوغہ واپس کر دیا۔

اب میں دریائے دجلہ کے کنارے پہنچا' وہاں کچھ کشتیاں کھڑی تھیں' وہ کرائے پر مسافروں کو دوسرے کنارے پہنچا رہی تھیں' میں ایک کشتی پر سوار ہوگیا، مسافت آدھے گھنٹے کی تھی، آدھے گھنٹے کے اس سفر کے دوران میں نے وقت گزاری کے لیے کشتی کے ملاح سے گفتگو شروع کر دی۔ دورانِ گفتگو میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ بغداد کا نہیں۔ میں نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ کہنے لگا: میں خراسان کے شہر مرو کا رہنے والا ہوں۔ میں نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ جواب ملا: محمود۔ میں نے پوچھا کہ تم اس ملک میں کیسے آئے ہو؟ کہنے لگا: یہ ایک لمبی داستان ہے اور تمہیں اس سے کیا تعلق! میں نے اس کو قسم دی کہ تم لازماً اپنی داستان سناؤ' چاہو تو مختصر کر کے سنا دو' مگر سناؤ ضرور! کہنے لگا: میں مرو شہر کا تاجر تھا' میرا بڑا بھائی احمد بھی تاجر تھا' ہم نے بغداد جانے کا ارادہ کیا تاکہ وہاں سے سامانِ تجارت خرید کر مرو لائیں' میرے پاس ایک ہزار دینار تھے' میں نے ان کو ایک تھیلی میں بند کر کے اپنے بڑے بھائی کے حوالے کر دیا کہ وہ حفاظت کر سکے گا۔ ایک قافلہ بغداد کی طرف روانہ ہو رہا تھا' ہم بھی اس قافلے میں شامل ہوگئے۔ جب ہم بغداد کے قریب پہنچے تو اچانک ڈاکوؤں نے قافلے پر حملہ کر دیا' قافلے کے بہت سارے لوگ مارے گئے اور ایک بڑی تعداد زخمی ہوگئی' میں موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

اگلے دن میں دوبارہ اس مقتل میں واپس آیا' لاشیں پڑی تھیں' زخمی کراہ رہے

تھے، میں نے اپنے بھائی کو مقتولین اور زخمیوں میں تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک ہزار دینار نے اس کے دل کو بے ایمان کر دیا تھا۔ میرے بڑے بھائی کا یہ سلوک میرے لیے ناقابل فہم تھا۔ ظاہر ہے مجھے بے حد پریشانی ہوئی، میری تمام جائداد چھن گئی، فقر نے آن گھیرا۔ میں نے بغداد میں اس کو بہت تلاش کیا، مگر وہ نہ ملا۔ ایک دن میں دریا کے کنارے پریشان حال بیٹھا تھا کہ اس کشتی کے مالک کو میری حالت پر ترس آیا۔ میرے پاس آ بیٹھا اور میری دلجوئی کی۔ میرے حالات دریافت کیے۔ چنانچہ میں نے اس سے اپنی درد بھری داستان بیان کر دی۔ اس نے کہا: تم میرے پاس کام کیوں نہیں کرتے؟ میرے پاس یہ کشتی ہے، میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، میرے قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں، کوئی بیٹا نہیں ہے اور یہ کام یوں بھی صحت اور طاقت والا ہے۔

چنانچہ میں نے اس کے پاس کام کرنا شروع کر دیا۔ میری محنت اور دیانت سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی سے میری شادی کر دی اور میں اس کے گھر میں رہنے لگا، چند مہینے گزرے، وہ فوت ہو گیا ہے۔

ابنِ ہبیرہ کا بیان ہے: میں نے اس سے اس تھیلی کی نشانیاں پوچھیں تو وہ بالکل وہی تھی جو میرے پاس تھی۔ جب مجھ کو یقین ہو گیا کہ اس تھیلی کا مالک یہ ملاح ہی ہے تو میں نے تھیلی کو اس کے سامنے رکھ دیا۔ جب محمود نے دیناروں کی تھیلی دیکھی تو اس پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی، قریب تھا کہ اس پر غشی طاری ہو جائے، میں نے اس کے سر پر پانی ڈالنا شروع کیا، جب وہ ذرا سنبھلا تو پوچھا: تمہیں یہ تھیلی کہاں سے ملی ہے؟ میں نے اس کو سارا قصہ سنایا اور کہا: تمہارا بھائی تمہیں بغداد میں جگہ جگہ تلاش کرتا رہا اور یہ محض تمہارا وہم تھا کہ اس کا دل بے ایمان

ہو گیا تھا اور وہ دینار لے کر بھاگ گیا۔

محمود تھیلی پانے کے بعد بے حد خوش تھا اور بار بار تھیلی کو دیکھتا‘ پھر اس نے دینار گنے تو وہ 999 نکلے‘ ایک دینار جو کم تھا اس کے متعلق میں نے بتایا کہ اس سے میں نے تمہارے بھائی کے لئے انگور خریدے تھے۔ اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں‘ بلکہ مزید 10 طلائی دینار میرے ہاتھ پر رکھے اور میرا بے حد شکریہ ادا کیا۔ اب جبکہ میں دوبارہ بغداد میں تھا اور میرے پاس خرچ کے لیے رقم بھی تھی‘ دوبارہ وہاں رکنے اور کام تلاش کرنے کا ارادہ کرلیا۔

اگلے دن میں نے سوچا کہ اب مجھے ایک مرتبہ پھر دیوان الوظائف میں جانا چاہیے‘ ہوسکتا ہے کہ دیوان کو میری ضرورت پڑ گئی ہو‘ جب میں وہاں گیا تو انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا: تم کہاں تھے؟ ہم تم کو تلاش کر رہے تھے‘ تمہارے لئے اب نوکری موجود ہے‘ اور یوں انگوروں کا خوشہ میرے لیے بغداد واپس آنے کا سبب بن گیا۔ جلد ہی میں مسلسل محنت‘ کوشش اور لگن کے سبب خلیفہ **المقتفی لأمر اللہ** کے خزانے کا افسر مقرر ہوگیا‘ پھر میں سکرٹیریٹ میں پہنچ گیا اور خلیفہ کے ساتھ کام کرنے لگا‘ خلیفہ نے جب میری لیاقت اور امانت دیکھی تو مجھے 544ھ میں اپنا وزیر بنالیا۔ اب خلیفہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا **مستنجد باللہ** خلیفہ بنا تو اس نے بھی مجھے وزارت پر برقرار رکھا۔

ابنِ ہبیرہ اپنی وفات 560ھ تک وزیر رہے۔ (1)

---

(1) مراجع کیلئے دیکھیں: شذرات الذهب في أخبار من ذهب، (سنة 560)، ابن الحماد حنبلی، المنتظم (سنة 560) ابن الجوزی، وفیات الأعیان لابن خلکان (230/6)، کتاب الذیل علی طبقات الحنابلة، ابن رجب (291-251/3) دارالمعرفة۔

تواضع اور صدقہ کے ثمرات

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو تواضع وانکساری کا درس دیتے ہوئے فرمایا:

«التَّواضُعُ لَا يَزِيدُ الْعَبْدَ إِلَّا رِفْعَةً» .

”تواضع سے آدمی کو رفعت اور بلندی ہی ملتی ہے۔“

«فتَوَاضَعُوا يَرْفَعْكُمُ اللهُ» .

”اس لیے تواضع اختیار کرو، اس سے اللہ تمھیں رفعت وبلندی عطا فرمائیں گے۔“

«الْعَفْوُ لَا يَزِيدُ الْعَبْدَ إِلَّا عِزًّا» .

”عفو ودرگزر سے آدمی کو عزت ہی ملتی ہے۔“

«فَاعْفُوا يُعِزَّكُمُ اللهُ» .

”اس لیے تم لوگوں کو معاف کر دیا کرو، اللہ تمھیں عزت عطا فرمائیں گے۔“(1)

«وَإِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَزِيدُ الْمَالَ إِلَّا نَمَاءً» .

”اور صدقہ خیرات کرنے سے مال بڑھتا ہی جاتا ہے۔“

«فَتَصَدَّقُوا يَزِدْكُمُ اللهُ» .

”اس لیے تم صدقہ اور خیرات کرو اللہ تعالیٰ تمھیں اور زیادہ دیں گے۔“

حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَازَادَ اللهُ عَبْدًا مِنْ

---

(1) الترغيب والترهيب للأصفهاني، ومسند الفردوس للديلمي۔ دیکھئے إحياء علوم الدين للغزالي، تحقيق قاضي شيخ محمد بلطة (236/3)۔

عَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لله إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ».

”صدقہ سے مال میں کچھ بھی کمی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ عفو ودرگزر کے ذریعے بندے کو عزت ومقام عطا کرتا ہے اور جب بھی کوئی بندہ اللہ کے لیے تواضع وانکساری اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا کرتا ہے۔“ (1)

---

(1) مسلم (2588)۔

جان دینا منظور ہے

خلیفہ معتصم باللہ جب خلق قرآن کے سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا موقف بدلنے سے عاجز آ گیا تو اس نے ان پر مزید سختی شروع کر دی۔ آلۂ تعذیب نصب کروایا‘ ظالم اور جابر جلاد مقرر کیے اور بے پناہ تشدد کرایا۔ جلاد کے سخت زدوکوب کی وجہ سے امام صاحب کا کندھا مبارک اکھڑ گیا‘ پیٹھ مبارک سے خون کے فوارے جاری ہو گئے۔

خلیفہ معتصم آگے بڑھا اور گویا ہوا:

«يَا أَحْمَدُ، قُلْ هَذِهِ الْكَلِمَةَ وَأَنَا أَفُكُّ عَنْكَ بِيَدِي، وَأُعْطِيكَ وَأُعْطِيكَ».

”احمد! صرف یہ ایک کلمہ کہہ دو (کہ قرآن مخلوق ہے) میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری بیڑیاں کھول کر تمہیں آزاد کر دوں گا اور تمہیں دنیا جہان کی نعمتوں سے مالا مال کر دوں گا۔“

جواب میں امام احمد صرف یہ فرماتے:

«هَاتُوا آيَةً أَوْ حَدِيثًا»

”قرآن کی کوئی آیت یا حدیث کی کوئی نص اس کی دلیل کے طور پر پیش کر دو، میں فوراً اپنی رائے تبدیل کر دوں گا۔“

خلیفہ معتصم نے دانت پیستے ہوئے جلاد سے کہا: یہ میری بات نہیں مان رہا۔ تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں تم نے اس پر زیادہ سختی نہیں کی۔ اور زیادہ قوت سے مارو! جلاد نے پوری قوت سے تازیانہ مارنا شروع کیا۔ امام صاحب کا گوشت پھٹ گیا

خون کا فوارہ نکلا۔ خلیفہ کا ایک درباری عالم آگے بڑھا اور گویا ہوا: احمد بن حنبل! کیا اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ﴾

"اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔" (1)

پھر کیوں خواہ مخواہ اپنی جان کے درپے ہو اور خلیفہ کی بات نہ مان کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو؟

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: «اخْرُجْ، وَانْظُرْ أَيُّ شَيْءٍ وَرَاءَ الْبَابِ؟».

"باہر نکلو اور دروازے کے باہر دیکھو تمہیں کیا نظر آتا ہے؟"

اس نے محل کے صحن سے نکل کر جھانکا، دیکھا بے شمار لوگ کاغذ اور قلم پکڑے انتظار کر رہے ہیں۔ درباری عالم نے اس مجمع والوں سے پوچھا: کس چیز کے منتظر ہو؟

لوگوں نے کہا:

«نَنْظُرُ مَا يُجِيبُ بِهِ أَحْمَدُ فَنَكْتُبُهُ»

"ہم خلق قرآن کے مسئلے میں امام احمد کے جواب کے منتظر ہیں تاکہ اس کو لکھ سکیں۔"

وہ درباری عالم واپس آیا اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو جب خبر دی تو امام صاحب نے فرمایا:

«أَنَا أُضِلُّ هٰؤُلَاءِ كُلَّهُمْ؟ أَقْتُلُ نَفْسِي وَلَا أُضِلُّهُمْ».

"کیا میں ان تمام کو گمراہ کر دوں؟! اپنے آپ کو قتل کروا لینا منظور ہے مگر ان کو گمراہ کرنا منظور نہیں۔"

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں۔ (2)

---

(1) سورۃ النساء: 29۔ (2) سیر اعلام النبلاء 358-177/11 وغیرہ کتب تاریخ و رجال۔

وہ تو میرا ہو چکا

بنی اسرائیل کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا‘ مدتوں سے بارش نہیں ہو رہی تھی۔ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے اور عرض کیا: یا کلیم اللہ! رب تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ بارش نازل فرمائے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہمراہ لیا اور بستی سے باہر دعا کے لئے آ گئے‘ یہ لوگ ستر ہزار یا اس سے کچھ زائد تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بڑی عاجزی سے دعا کرنا شروع کی:

«إِلٰهِي، أَسْقِنَا غَيْثَكَ وَانْشُرْ عَلَينَا رَحْمَتَكَ... وَارْحَمْنَا بِالْأَطْفَالِ الرُّضَّعِ وَالْبَهَائِمِ الرُّتَّعِ وَالشُّيُوخِ الرُّكَّعِ».

”میرے پروردگار! ہمیں بارش سے نواز، ہمارے اوپر اپنی رحمتوں کی نوازش کر......! چھوٹے چھوٹے معصوم بچے‘ بے زبان جانور‘ بوڑھے اور بیمار سبھی تیری رحمت کے امیدوار ہیں، تو ان پر ترس کھاتے ہوئے ہمیں اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔“

دعائیں ہوتی رہیں، مگر بادلوں کا دور دور تک پتا نہ تھا، سورج کی تپش اور تیز ہوگئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بڑا تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کے قبول نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو وحی نازل ہوئی:

«إِنَّ فِيكُمْ عَبْدًا يُبَارِزُنِي بِالْمَعَاصِي مُنْذُ أَرْبَعِينَ سَنَةً، فَنَادِ فِي النَّاسِ حَتَّى يَخْرُجَ مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِكُمْ، فَبِهِ مَنَعْتُكُمْ..».

”تمہارے درمیان ایک ایسا شخص ہے جو گزشتہ چالیس سالوں سے مسلسل

میری نافرمانی کر رہا ہے اور گناہوں پر مصر ہے‘ اے موسیٰ! آپ لوگوں میں اعلان کر دیں کہ وہ نکل جائے، کیونکہ اس آدمی کی وجہ سے بارش رکی ہوئی ہے اور جب تک وہ باہر نہیں نکلتا بارش نہیں ہوگی۔‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: باری تعالیٰ! میں کمزور سا تیرا بندہ‘ میری آواز بھی ضعیف ہے‘ یہ لوگ ستر ہزار یا اس سے بھی زیادہ ہیں‘ میں ان تک کیسے آواز پہنچاؤں گا؟

جواب ملا: «مِنْكَ النِّدَاءُ وَمِنَّا الْبَلَاغُ».

’’تیرا کام آواز دینا ہے، پہنچانا ہمارا کام ہے۔‘‘

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو آواز دی‘ اور کہا:

«أَيُّهَا الْعَبْدُ الْعَاصِي الَّذِي يُبَارِزُ اللهَ بِالْمَعَاصِي مُنْذُ أَرْبَعِينَ سَنَةً... اخْرُجْ مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا، فَبِكَ مُنِعْنَا الْمَطَرَ».

’’اے رب کے گناہ گار اور نافرمان بندے‘ جو گزشتہ چالیس سال سے اپنے رب کو ناراض کر رہا ہے اور اس کو دعوتِ مبارزت دے رہا ہے...... لوگوں میں سے باہر آ جا، تیرے ہی کالے کرتوتوں کی پاداش میں ہم بارانِ رحمت سے محروم ہیں۔‘‘

اس گناہ گار بندے نے اپنے دائیں بائیں دیکھا، کوئی بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہی مطلوب ہے۔ سوچا کہ اگر میں تمام لوگوں کے سامنے باہر نکلا تو بے حد شرمندگی ہوگی اور میری جگ ہنسائی ہوگی اور اگر میں باہر نہ نکلا تو محض میری وجہ سے تمام لوگ بارش سے محروم رہیں گے۔

اب اس نے اپنا چہرہ اپنی چادر میں چھپا لیا‘ اپنے گزشتہ افعال و اعمال پر شرمندہ ہوا اور یہ دعا کی: اے میرے رب! تو کتنا کریم اور بردبار ہے کہ میں چالیس سال تک تیری نافرمانی کرتا رہا اور تو مجھے مہلت دیتا رہا۔ اور اب تو میں

یہاں تیرا فرمانبردار بن کر آیا ہوں، میری توبہ کو قبول فرما اور مجھے معاف فرما کر آج کی ذلت ورسوائی سے بچالے!

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ آسمان بادلوں سے بھر گیا اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ عرض کیا: یا الٰہی! آپ نے بارش کیسے برسانا شروع کردی وہ نافرمان بندہ تو مجمع سے باہر نہیں آیا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! جس کی بدولت میں نے بارش روک رکھی تھی اسی کی بدولت اب بارش برسا رہا ہوں، اس لیے کہ اس نے توبہ کرلی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! اس آدمی سے مجھے بھی ملا دے تاکہ اس کو دیکھ لوں؟ فرمایا:

«يَا مُوسَى، إِنِّي لَمْ أَفْضَحْهُ وَهُوَ يَعصِينِي، أَأَفْضَحُهُ وَهُوَ يُطِيعُنِي».

''موسیٰ! میں نے اس کو اس وقت رسوا اور خوار نہیں کیا جب وہ میری نافرمانی کرتا رہا، اور اب جب کہ وہ میرا مطیع اور فرمانبردار بن چکا ہے تو اسے کیسے شرمندہ اور رسوا کرسکتا ہوں؟''

وہ ایک گناہ گار اور نافرمان شخص تھا اور اس کی بدولت بارش کا نزول نہیں ہو رہا تھا اور چند کو چھوڑ کر تمام امت ہی گناہ گار اور غفلت میں ہو تو پھر کیا حشر ہوگا؟

سورۂ جن آیت 16 میں رب تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿وَأَلَّوِ ٱسْتَقَـٰمُوا۟ عَلَى ٱلطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَـٰهُم مَّآءً غَدَقًا ﴿١٦﴾﴾

''لوگ اگر راہ راست پر سیدھے رہتے تو یقیناً ہم انھیں بہت وافر پانی دیتے۔''(1)

---

(1) الجن:16

اپنی اپنی تمنا

امیر معاویہ ؓ کے دور خلافت میں ایک دن عبداللہ بن زبیر ؓ اور ان کے دو بھائی عروہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر، عبدالملک بن مروان کے ساتھ حرم مکی میں اکٹھے ہوئے۔ گفتگو شروع ہوئی، ہر ایک نے دوسرے سے کہا: حرم میں بیٹھے ہیں، اپنی اپنی تمنا اور خواہش پیش کریں۔ مصعب بن زبیر کہنے لگے: میری تمنا ہے کہ میں عراق اور شام پر حکومت کروں۔ اور حضرت حسین ؓ کی بیٹی سکینہ اور حضرت طلحہ ؓ کی بیٹی عائشہ سے شادی کروں۔ ان دونوں کا تعلق قریشی گھرانے سے تھا۔ عزت و شرف کے ساتھ ساتھ خوبصورتی کی دولت سے بھی مالا مال تھیں۔

عبداللہ بن زبیر ؓ کہنے لگے: میری خواہش ہے کہ مجھے خلافت ملے اور حرمین شریفین پر میری حکومت ہو۔ عبدالملک بن مروان کہنے لگے: میری تمنا اور خواہش ہے کہ میں امیر معاویہ ؓ کی گدی سنبھالوں اور دنیا پر میری حکومت ہو۔

اب عروہ بن زبیر ؒ کی باری آئی۔ عرض کرنے لگے: جن چیزوں کی تم نے تمنا اور خواہش کی ہے، ان میں سے کسی کی بھی مجھے خواہش نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ خواہش کرتا ہوں کہ مجھے دین کے علم سے بہرہ ور فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے مجھے جنت عطا فرمائے۔

اس بات کو زیادہ دیر نہیں گزری تھی، تینوں نے جو جو خواہش اور تمنا حرم مکی میں کی تھی، پوری ہوئی۔ مصعب بن زبیر شام اور عراق کے والی بنے اور ان کی شادی سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ سے ہوگئی۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بھی خلیفہ بنے۔ حجاز‘ عراق‘ مصر اور شام کے گرد و نواح تک ان کی حکومت قائم ہوئی۔ دمشق بھی فتح ہوا چاہتا تھا مگر قدرت کو منظور نہ تھا اور پھر بنو امیہ سے کشمکش ہوگئی، اور آپ جام شہادت نوش کر گئے۔

پھر تاریخ نے وہ دن بھی دیکھا جب عبدالملک بن مروان حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی گدی پر بیٹھے اور تمام اسلامی حکومت ان کے قبضے میں تھی۔ ایک دن انھوں نے حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا۔ حرم کا واقعہ یاد آیا اور لوگوں سے کہنے لگے کہ جسے کسی جنتی شخص کو دیکھنا ہو وہ عروہ کو دیکھ لے اور یقیناً ان کی خواہش اور تمنا ہم سے زیادہ بہتر اور افضل تھی۔

عفو ودرگزر کی اعلیٰ ترین مثالیں

اسلام کی روشن کرنیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ مختلف علاقوں کے لوگ اور قبائل اسلام قبول کر چکے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ اس وقت کے شدت سے منتظر تھے جب مکہ فتح ہو۔ ہجرت کا آٹھواں سال شروع ہو چکا تھا۔ قریش مکہ ابھی تک بت پرستی میں مبتلا تھے۔ ہدایت واضح تھی۔ کھلے دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ بت نفع اور نقصان کے مالک نہیں، یہ محض پتھر ہیں‘ خود انسانوں کے تراشے ہوئے‘ خود ان ہی کے بنائے ہوئے۔

اور پھر وہ مبارک دن بھی آ گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ رمضان المبارک کا مقدس مہینہ تھا‘ اس کے بیس دن گزر چکے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا قریش کے متکبر ومغرور اور تنومند جوانوں کو دیکھیے‘ ان کے مددگاروں کی طرف نظر دوڑائیں‘ آج کس طرح ذلیل وخوار ہو کر جان کے خوف سے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کون سے ظلم اور جرائم ہیں جو انھوں نے نہیں کیے، وہ تمام صفا پہاڑی کے دامن میں کھڑے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ اسی بیت اللہ میں، جہاں سے نکالے گئے تھے‘ بیت اللہ کا طواف شروع ہوا۔ اس گھر میں تین سو ساٹھ بت ہیں۔ کعبہ بتوں سے گھرا ہوا ہے اور آپ ﷺ فرما رہے ہیں:

﴿جَآءَ ٱلْحَقُّ وَزَهَقَ ٱلْبَٰطِلُ ۚ إِنَّ ٱلْبَٰطِلَ كَانَ زَهُوقًا ﴿٨١﴾﴾ (بنی اسرائیل: ۸۱)

”حق آ گیا اور باطل مٹ گیا کہ باطل تو مٹنے ہی کے لیے ہے۔“

بتوں کو توڑا جا رہا ہے۔ وہ پاش پاش ہو رہے ہیں، ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں،

اور اس کے ساتھ ہی قریش کا غرور و تکبر بھی پاش پاش ہو گیا۔ آج سے رب تعالیٰ کی عظمت اور جلالت کے ماننے والوں کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اکیلے رب کا، جو لاشریک ہے۔ بادشاہی اسی کی، حکومت اسی کی، تعریف اسی کی ہے۔ آج پھر کعبہ کے در و دیوار اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدا سے گونج رہے ہیں۔ سیدنا بلال ؓ کی آواز پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچ رہی ہے۔ آج مکہ کا ذرہ ذرہ «لا إله إلا الله» کی گواہی دے رہا ہے۔ آج محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا پھریرا لہرا رہا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ فتح مکہ کی خوشی میں آٹھ رکعت نماز ادا کر رہے ہیں۔ اپنے اکیلے اور طاقتور رب کے سامنے، عاجزی کے ساتھ اس کا شکر ادا ہو رہا ہے۔

مکہ والوں کی نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی ہیں اور دلوں میں اندیشے ہیں: ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟

اعلان ہوتا ہے: جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا اس کو امان ملے گی، جو بیت اللہ میں آ گیا اس کے لیے بھی امن ہے اور جو اپنے گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا اس کو بھی امان مل گئی۔

پھر ایک آواز آتی ہے: مکہ والو! اسلام لے آؤ، سلامتی پا جاؤ گے۔

خالد بن ولید ؓ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ اللیط کے راستے سے مکہ میں داخل ہوں۔ ان کے ساتھ قبیلہ اسلم، قبیلہ غفار، قبیلہ مزینہ اور جہینہ کے جنگجو اور بہادر ہیں۔ مختلف قبائل کے لوگ ہیں، آپ کے جلو میں مکہ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور پھر کائنات نے بڑا عجیب منظر دیکھا۔ ایک فاتح نے اپنی سواری پر اپنے آپ کو رب کی بارگاہ میں جھکا دیا۔ عمامہ مبارک سے اپنے چہرے کو ڈھانک لیا۔ آج مکہ فتح

ہو رہا ہے۔ شکر گزاری کے طور پر رب کی حمد و ثنا ہو رہی ہے اور فاتح مکہ اس شہر میں پھر داخل رہے ہیں، جہاں سے آٹھ سال قبل نکالے گئے تھے۔ پھر آپ باب کعبہ کے سامنے آئے، زبان اقدس سے نکلا:

«لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ، لَاشَرِيكَ لَهُ، صَدَقَ وَعْدَهُ وَ نَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ».

’’اکیلے رب کی بادشاہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں، جس نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام گروہوں کو اکیلے شکست فاش دی۔‘‘

بھرپور انکساری کے ساتھ اعلان ہوا: آج تمام مال و دولت، عزت، غرور و تکبر اور خون، سب کے سب میرے قدموں کے نیچے ہے، ہاں! اس گھر کی کنجیاں اور پانی پلانے کا انتظام جن کے پاس تھا وہی ان کو سنبھالیں گے۔

پھر نظریں جھکائے قریش سے آپ ﷺ مخاطب ہوئے:

«يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! مَا تَرَوْنَ أَنِّي فَاعِلٌ بِكُمْ؟».

’’اے قریش والو! جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟‘‘

آواز آئی:

«خَيْرًا، أَخٌ كَرِيمٌ، وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ».

’’آپ سے خیر اور بھلائی کی امید ہے۔ آپ رحم و کرم والے بھائی اور رحم و کرم کرنے والے بھائی کے بیٹے ہیں۔‘‘

آواز گونجتی ہے:

«فَإِنِّي أَقُولُ لَكُمْ كَمَا قَالَ يُوسُفُ لِإِخْوَتِهِ: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ».

”میں بھی وہی کچھ کہوں گا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: آج تم پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ! تم سب آزاد ہو۔“

اہلِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ کی زبان اقدس سے طلقاء کا خطاب ملتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے کعبہ کے سات چکر لگائے، پھر بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ اس روز مسلمانوں کے دو آدمی شہید ہوئے، ایک قوم خزاعہ کے حبیش بن اشعر بن منقذ بن ربیعہ اور دوسرے کرز بن جابر بن حُسَیل فہری قرشی رضی اللہ عنہما۔ کافروں کے 13 آدمی مارے گئے۔

حماس بن قیس، مکہ کا ایک مشرک، فتح مکہ کے دن صبح سویرے اپنی بیوی سے کہنے لگا: آج میں محمد کے ساتھیوں میں سے ایک کو تمہارے لیے خادم بنا کر لاؤں گا۔ تھوڑی دیر گزری، سہما سہما گھر آیا، کہا: بی بی! جلدی سے دروازہ بند کر دو!

بیوی نے طنزاً کہا: ارے! وہ تمہارا خادم کہاں گیا؟

اس نے کہا:

إِنَّكِ لَوْ شَهِدْتِّ يَوْمَ الْخَنْدَمَه   إِذْ فَرَّ صَفْوَانُ وَفَرَّ عِكْرِمَه
وَاسْتَقْبَلْنَا بِالسُّيُوفِ الْمُسَلَّمَه   يَقْطَعْنَ كُلَّ سَاعِدٍ وَجَمْجَمَه
ضَرْبًا فَلَا يُسْمَعُ إِلَّا غَمْغَمَه   لَهُمْ نَهِيتٌ خَلْفَنَا وَهَمْهَمَه
لَمْ تَنْطِقِي فِي اللَّوْمِ أَدْنَى كَلِمَه

”اگر تم نے جنگِ خندمہ کا حال دیکھا ہوتا جب کہ صفوان اور عکرمہ بھاگ کھڑے ہوئے اور سونتی ہوئی تلواروں سے ہمارا استقبال کیا گیا، جو کلائیاں اور کھوپڑیاں اس طرح کاٹتی جا رہی تھیں کہ پیچھے سوائے ان کے شور وغوغا اور ہمہمہ کے کچھ سنائی نہیں پڑتا تھا، تو تم مجھے ملامت کی ادنیٰ بات بھی نہ کہتیں۔“

اس روز اللہ کے رسول ﷺ نے حکم دیا کہ نو آدمیوں کو ہر حال میں قتل کر دیا جائے، خواہ وہ کعبے کے غلاف سے چمٹے ہوئے پناہ کیوں نہ طلب کر رہے ہوں۔ ان میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ اور صفوان بن امیہ بن خلف بھی شامل تھے، جن کو بعد ازاں معافی مل گئی۔

حویرث بن نقیذ بن وہب وہ بدبخت تھا جو اللہ کے رسول ﷺ کو مکہ میں ایذائیں پہنچایا کرتا تھا، اور جب حضرت فاطمہ اور ام کلثوم ؓ ہجرت کے وقت حضرت عباس ؓ کے اونٹ پر سوار ہو کر مدینے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس جانے کے لیے نکلیں تو یہ ظالم آڑے آ گیا، اس نے اونٹ کو زور سے بھڑکایا جس پر وہ دونوں سوار تھیں چنانچہ وہ دونوں اونٹ سے گر پڑیں۔ رسولِ اکرم ﷺ نے جب اس کا خون حلال قرار دیا تو وہ حضرت علی ؓ کے ہتھے چڑھ گیا اور انھوں نے اس کو واصل جہنم کر دیا۔

اور پھر لوگوں نے یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھا' ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں حضرت امیر حمزہ ؓ کا قاتل وحشی بن حرب پیش ہوا۔ یہ فتح مکہ کے دن طائف کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اپنے خاندان کے گروہ کے ساتھ اس حال میں پیش ہوا کہ کلمہ طیبہ کا ورد زبان پر جاری تھا۔ یہ پناہ اور امان کا طالب تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وحشی آیا ہے؟

عرض کیا: ہاں، یا رسول اللہ ﷺ!

ارشاد ہوا: ذرا بتاؤ تم نے میرے پیارے چچا کو کیسے شہید کیا تھا؟

جب اس نے قصہ بیان کیا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

ارشاد ہوا: وحشی! اپنے چہرے کو مجھ سے دور کر لو!

چچا کے ساتھ شدید محبت کے باوجود نبی رحمت ﷺ نے اپنے چچا کے قاتل کے

اسلام کو قبول کیا اور اس کو معاف کر دیا۔ کیا تاریخ نے عفو و درگزر کی ایسی بھی مثال دیکھی ہے؟

اس روز عورتیں بھی اسلام قبول کرنے کے لیے آئیں۔ انھی میں چھپتے چھپاتے ہند بنت عتبہ بھی آئی، اس کے قتل کا حکم بھی صادر ہو چکا تھا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش مبارک کے ساتھ اس کا سلوک اور خود رسول اللہ ﷺ کو ہر وقت تکلیف دینا، ایذا پہنچانا اس کا مقصدِ حیات تھا۔ جرم بڑا بھیانک اور خوفناک تھا مگر اس کا اسلام بھی قبول ہوا۔ انسانی تاریخ میں عفو و درگزر کی ایک اور مثال قائم ہوئی جس کا جواب رہتی دنیا تک نہیں مل سکتا۔

ہند بنت عتبہ عفو و درگزر کے اس واقعے سے اتنی متاثر ہوئی کہ کفر و شرک اور بتوں سے اس کی محبت کا طلسم پاش پاش ہو گیا۔ بتوں کے بارے میں فریب ختم ہوا۔ اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر گھر واپس گئی۔ بتوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کو توڑنا شروع کیا۔ بتوں کو توڑتی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ کہتی جاتی تھی: ہائے! ہم تمہارے بارے میں کتنے دھوکے اور فریب میں مبتلا تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں بکری کے دو بچے بطور ہدیہ ارسال کیے، عرض کیا: ہماری بکریاں بہت کم بچے جن رہی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی تو بہت زیادہ بکریاں ہو گئیں۔ محتاجوں کو بکریاں دیتی اور کہتی: یہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت سے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اسلام کی دولت بخشی ہے۔

فتح مکہ اسلام کی تاریخ کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ اس روز اللہ نے اسلام کو عزت و وقار بخشا، کفر و شرک کو کاری ضرب لگی۔ بیت اللہ میں اللہ کا کلمہ گونجا اور مشرکین سے اللہ کے گھر کو آزاد کیا گیا۔ اور پھر اس دن عفو و درگزر کی وہ مثالیں قائم ہوئیں کہ تاریخ ان کو دہرانے سے قاصر ہے۔

قوی اور امین

مدینہ سے ذرا باہر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اپنے گھر کے بالائی حصہ میں مقیم تھے۔ اس روز گرمی بڑی سخت تھی۔ باہر لو چل رہی تھی۔

ایک شخص کو دور سے دیکھا وہ اس سخت گرمی میں دو اونٹوں کو ہانکتا ہوا آ رہا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بڑے تعجب سے اس شخص کو دیکھا اور پھر کہنے لگے: اس شخص کو ایسی کونسی مجبوری یا ضرورت آ پڑی ہے جو اس شدید گرمی میں اونٹوں کو ہانکتا آ رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا موسم کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر لیتا۔

پھر جب یہ شخص ذرا قریب آیا تو اپنے غلام سے کہنے لگے کہ ذرا دیکھو یہ شخص کون ہے؟ غلام کہنے لگا: ایک شخص عمامہ باندھے ہوئے ہے، پہچاننے سے قاصر ہوں کہ ابھی دور ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص بالکل قریب آیا تو غلام کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ وہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: یہ تو امیر المومنین ہیں۔ اب انہوں نے اپنا سر دروازے سے باہر نکال کر دیکھا، شدید گرم ہوا چہرہ جھلسائے دے رہی تھی۔ چہرہ اندر کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اب انہوں نے آواز دی کہ امیر المومنین! ایسے شدید موسم میں آپ کہاں جا رہے ہیں؟

امیر المومنین کہنے لگے: صدقہ کے یہ اونٹ پیچھے رہ گئے تھے جبکہ دوسرے اونٹ چراگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان کو بھی دوسرے اونٹوں کے ساتھ چراگاہ میں پہنچا دوں، کہیں یہ بچھڑ نہ جائیں اور کل قیامت کو اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں مجھ

سے پوچھ نہ لیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: امیر المومنین! تھوڑی دیر کے لیے اندر سایہ میں آ جائیں۔ پانی وغیرہ پی لیں۔ ہم آپ کی خدمت خاطر کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم اپنے سایہ میں واپس چلے جاؤ۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہمارے پاس ایک ایسا آدمی ہے جو آپ کی خدمت بجالاسکتا ہے۔ آپ سایہ میں تشریف لائیں۔

اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز بلند ہو چکی تھی۔ انہوں نے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے فرمایا:

«عُدْ إِلَى ظِلِّكَ».

”(میں نے تمہیں کہا ہے نا) سایہ میں واپس چلے جاؤ“۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ (1) نے فرمایا:

«مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى الْقَوِيِّ الْأَمِينِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى هٰذَا».

”جو کسی قوی اور امین شخص کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اس شخص کو دیکھ لے۔“

---

(1) حضرت عثمان بن عفان بن ابی العاص مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ تھے۔ عام الفیل کے چھ سال بعد مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا اور خوب ستائے گئے۔ دو ہجرتیں کرنے کا شرف پایا، حبشہ اور مدینہ کی طرف۔ ان کی پہلی شادی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی جو بدر کے روز انتقال کر گئیں۔ پھر آپ کی دوسری بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے ہوئی جو 9 ہجری میں فوت ہوئیں۔ آپ کا لقب ”ذوالنورین“ تھا۔ ایک نبی کی دو بیٹیوں سے شادی ہونے کا یہ اعزاز پوری دنیا میں حضرت عثمان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ 35 ہجری میں ایام تشریق کے دنوں میں بلوایوں کے ہاتھوں انتہائی مظلومیت کے عالم میں شہید ہوئے۔ شہادت کے وقت عمر مبارک 82 سال تھی۔

کسریٰ کے کنگن

تاریخ کا مسافر ایک ایسی بستی کو دیکھ رہا ہے جس کے چہار سمت پہاڑیاں ہیں۔ ایک تنگ سی وادی' اس میں نہ تو زراعت ہے نہ ہی گلستان' یہ چشموں سے خالی ہے اور شدید گرمی سے بھرپور۔ یہاں کے لوگ عجیب و غریب خصلتوں کے مالک ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آپس میں جھگڑے فساد اور لڑائی پر آمادہ رہتے ہیں' اور پھر قتل در قتل کا سلسلہ جاری ہے، یہاں جہالت عام ہے، کوئی حکومت نہیں ہے' کوئی کسی کی قیادت اور سیادت ماننے کو تیار نہیں ہے۔ ان کا کوئی دین یا مذہب بھی نہیں ہے۔ بس باپ دادا کی روایات ہیں اور علم کی اس حد تک کمی ہے کہ خود تراشیدہ مورتیوں کے سامنے اپنے سر جھکاتے ہیں۔ ان کو اگر فخر ہے تو بس اپنی زبان دانی پر اور اپنی عربی شاعری پر۔ ان کے لیے کسی کاہن یا جادوگر کی بات نہایت ہی معتبر ہے' اس کو اہمیت دیتے ہیں اور انہی کی بات مانتے ہیں۔ یہ بستی مکہ کی ہے اور یہاں کے رہنے والے عرب ہیں۔ اسی بستی میں 19 سال کی عمر کا ایک نوجوان گلیوں سے گزرتا ہوا کعبہ کے پاس آتا ہے' ہبل نام کے بت کے سامنے مناجات کہتا ہے اور اپنی آرزوئیں پیش کرتا ہے۔ نوجوان کا قد قدرے چھوٹا ہے مگر جسم بڑا ابھرا ہوا ہے اور قدرے فربہی کی طرف مائل۔ جسم پر کافی بال ہیں۔ اپنی ہیئت اور چال ڈھال سے ایک چھوٹا شیر نظر آتا ہے' اس کا نام سعد بن ابی وقاص ہے۔

مکہ مکرمہ میں ایک ایسی شخصیت ہے جس کی جوانی اب بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ یہ نوجوان اس سے بہت محبت کرتا ہے' عزت و احترام کرتا ہے' اس کی ہر بات مانتا ہے۔ ایک دن اس شخص (صدیق اکبر) نے اس نوجوان کو راستے میں روکا اور اپنی

طرف اشارہ کر کے بلایا۔ اس کے کان میں کچھ بات کہی اور پھر دونوں نے صفا پہاڑی کے دامن میں واقع ایک گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اس گھر میں جا کر اس نوجوان نے ایک نئے دین کو قبول کر لیا اور اب اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد سات ہو چکی تھی۔ صرف سات شخصیات، جن میں ایک بچہ بھی ہے اور یہ وہ خوش قسمت بچہ ہے جس نے آج تک اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کا ارتکاب نہیں کیا، اس کا نام علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کا چچا زاد بھائی بھی ہے۔

ان ساتوں شخصیات کے اوپر اب اسلام کی امانت کو دنیا کے ہر گوشے میں پہنچانے کی ذمے داری ہے اور وہ اس کے لیے مسلسل کوشش کر رہے ہیں اور پھر یہ کوششیں رنگ لاتی ہیں۔ اب ان کی تعداد چالیس ہو چکی ہے کہ اچانک ان میں ایک ایسی شخصیت کا اضافہ ہوتا ہے جو بہت طاقتور، جری اور بہادر ہے۔ جس کی قوت کا ایک زمانہ معترف ہے جو زبردست قوتِ ارادی کا مالک ہے، گفتار کا ہی نہیں بلکہ کردار کا بھی غازی ہے۔

اور پھر اس شخصیت کے اضافے کے بعد ان چالیس افراد نے اپنی طاقت کے مظاہرے کا ارادہ کیا۔ تاریخ اسلامی کا سب سے پہلا اور بڑا طاقت کا مظاہرہ...... کیونکہ یہ سلسلہ صرف صفا سے کعبہ تک ہی نہیں چلا بلکہ یہ شہروں میں، وادیوں میں، صحراؤں میں اور جنگلوں میں بحرِ ظلمات تک چلتا رہا...... حتیٰ کہ پوری دنیا میں اس کا شور، اس کا غلغلہ، اس کا ذکر اور اس کا چرچا ہوا۔

پھر ایک دن تاریخ کے مسافر نے اسی نوجوان کو کفر اور اسلام کے مابین ہونے والے ایک بڑے معرکے میں تاریخ ساز کردار کے لیے منتخب ہوتے دیکھا۔

محمد ﷺ نے اپنے ماننے والوں کو بشارت دی کہ ایک دن آنے والا ہے کہ

قیصر و کسریٰ ان کے سامنے سرنگوں ہوں گے۔ ان کی دولت اور قوت پاش پاش ہو جائے گی۔ قریش نے سنا' ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اُڑا دیا۔ کسی نے مذاق کیا' کسی نے ٹھٹھا اڑایا اور کسی نے کہا کہ دیکھا! ہیں نا دیوانوں جیسی باتیں!

مگر محمد ﷺ کو اس بات کا کل کے سورج کے طلوع ہونے کی طرح یقین تھا۔

ان کو یقین تھا اللہ کی طاقت پر' اس کے وعدے پر' اس دعوت کی قوت پر جس کا وہ اعلان کر رہے تھے۔

لوگوں کے لیے قیصر و کسریٰ کو مغلوب کرنا ناممکنات میں تھا' ان کو چیلنج کرنا، ان پر غالب آنے کی بات کرنا ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ نہ تھی۔

پھر محمد ﷺ اپنے دوست ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک دن چھپتے چھپاتے رات کے اندھیرے میں ایک غار میں جا پہنچے۔ یہاں پناہ لی ہے۔ یہاں سے نکلے تو کھجوروں کی سرزمین کا رخ کیا ہے کہ وفا شعاروں کی ایک جماعت پہلے سے وہاں موجود ہے۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔

سو اونٹوں کا لالچ بہت بڑا لالچ ہے۔ سراقہ بن مالک پیچھا کرتا ہے۔ وہ گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ معاذ اللہ! وہ ان کے خون کا پیاسا ہے اور پھر اس کے کانوں میں ایک پُرعزم آواز گونجتی ہے:

«كَيْفَ بِكَ يَا سُرَاقَةُ، إِذَا لَبِسْتَ سِوَارَ كِسْرَى؟».

''سراقہ، اس دن تمہاری کیسی شان ہوگی جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے؟''

سراقہ یہ سن کر مرعوب تو ضرور ہوا' مگر دل کو یقین نہ آیا۔ ایک خیال اس کے ذہن سے گزرا' قریش اس کو اسی لیے مجنون کہتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔

کفر اور اسلام کی کشمکش اب مکمل لڑائی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نوجوان کو جس

کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے' ایک ایسی سعادت اور شرف حاصل ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کسی کو یہ سعادت اور تمغہ جرأت حاصل نہیں ہوا۔

اسلام کے دفاع میں چلایا جانے والا پہلا تیر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی کمان سے نکلتا ہے۔ اور پھر ان کو اللہ کے رسول ﷺ کے دفاع کا اعزاز ملتا ہے۔

بار بار تیر چلا رہے ہیں اور کانوں میں یہ خوشخبری سنائی دیتی ہے:

«ارْمِ فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي».

''سعد، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں' تیر چلاؤ۔''

یہ اعزاز تاریخ میں صرف سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے لیے ہے کہ ان کے علاوہ آپ نے کسی شخص کے لیے یہ الفاظ استعمال نہیں فرمائے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اللہ رب العزت نے ایک ایسے عظیم معرکے کی سپہ سالاری بخشی کہ جس نے عراق کے دروازے اسلام کے لئے کھول دیے اور اسلام کا نور ایران کی سرحدوں سے آگے نکل گیا۔

تاریخ کا مسافر ذرا آگے بڑھتا ہے۔ دنیا کے نقشے پر اسلامی ریاست کا وجود پھیلتا جاتا ہے۔ جزیرۂ عرب میں اسلام کی روشنی پھیل چکی ہے۔ قبائل میں ازلی دشمنیاں محبت اور پیار میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ تمام عرب اسلامی جھنڈے کے نیچے اپنی قوتوں کو جمع کر چکے ہیں۔ غار حرا سے نکلنے والا چشمۂ فیض پورے عرب کو آبیار کر چکا ہے۔ اس کے فیوض و برکات سے لوگ خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس عدل و انصاف اور نورِ ہدایت کو محمد ﷺ کے ساتھی عراق کی حدود میں لے کر داخل ہوتے ہیں تاکہ یہاں کی خلق بھی اس رحمت کے سایہ تلے آ جائے۔ مگر ان کا ایک قدیم اور ازلی دشمن فارس جو کسریٰ کے نام سے معروف تھا' ان کی راہ میں آڑے

آ جاتا ہے۔ ان کا راستہ پوری قوت اور جاہ وجلال سے روکتا ہے۔ ان دو گروہوں کا اختلاف بڑا عجیب اور نرالا ہے۔ نہ تو کرسی کا جھگڑا ہے، نہ ہی اقتدار کی خواہش، نہ زمین پر قبضہ اور نہ اپنی حدود بڑھانے کا جنون۔ اختلاف دراصل دو نظریات کے درمیان ہے۔ ایک گروہ اکیلے رب ذوالجلال کے سامنے اپنی پیشانی کو جھکانے والا اور دوسرا جھوٹے معبودوں کو پوجنے والا۔ ایک کا نقطۂ نظر یہ کہ اکیلا رب ہے جو حی وقیوم ہے، وہی نفع ونقصان کا مالک ہے۔ تمام طاقتوں کا مرکز اور محور وحدہ لاشریک۔ ہر قسم کی ثنا اور تعریف کے لائق، اکیلا بھلائیوں کا مالک۔ اس طرف صرف اسی کے سامنے التجا کے لیے ہاتھ اٹھانے والے اور دوسری طرف اپنے آباؤاجداد کے ورثے پر نازاں، آگ کے پجاری۔ اور پھر یہ دونوں گروہ قادسیہ کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک طرف محمد عربی ﷺ کے غلام صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ شہادت کے متوالے، جذبہ جہاد سے سرشار، یہ اپنی مرضی اور خواہش سے یہاں آئے ہیں بغیر کسی جبر اور اکراہ کے۔ زادِ راہ کی کمی ہے مگر ایمانی جذبہ فراواں ہے۔ ان مجاہدین کے کیا کہنے، ان کے دن گھوڑوں کی پیٹھوں پر اور راتیں رب کی بارگاہ میں سجدے کرتے گزرتی ہیں۔

ان مردوں کے ساتھ کچھ خواتین بھی آئی ہیں۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ یا اپنے خاوندوں کے ہمراہ۔ زخمیوں کو پانی پلانے کے لئے، ان کی مرہم پٹی کرنے کے لیے، بہادروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے۔ عفت مآب خواتین شریک ہیں۔ اس گروہ کی شان بڑی نرالی اور انوکھی ہے۔ یہ ہر دور میں اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے، اسلام کو غالب کرنے کے لیے، کفر کو مغلوب دیکھنے کے لیے بھوک اور پیاس کی حالت میں بھی لڑتا ہے۔ تھکا ہوا ہے تو بھی اپنے فریضے کو سرانجام دے رہا ہے۔ مریض ہے تو بھی لڑائی

کے لئے تیار ہے' صحرا ہو تو بھی پیچھے نہیں۔ میدان ہو یا جنگل' سخت گرمی ہو یا برف سے اَٹی ہوئی وادیاں' سخت سردی کے موسم میں ایشیا ہو یورپ ہو یا افریقہ ہو، جنگلات ہوں یا سمندر کی موجیں' یہ ہر حالت میں اللہ کی خاطر اس کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ نوجوان ہے یا بوڑھا' ایک ہی تمنا' ایک ہی آرزو رکھتا ہے۔ شہادت...... شہادت......!

ان کے مقابل ایک دوسرا گروہ ہے جس کی تعداد چار گنا زیادہ ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکرِ جرار' یہ منظم و مرتب ہے' ہر سپاہی کے لیے کھانے پینے کی چیزیں' لباس اور اسلحہ ہے۔ وہ دنیاوی مال و متاع سے لیس ہے' دنیاوی مال کے خزانے ہمراہ ہیں۔ لوگوں کو گرویدہ بنانے کے لیے مال کو لٹایا جا رہا ہے۔ اس کے پاس ہر چیز موجود ہے' ہر سہولت میسر ہے' ہر نعمت کی بہتات ہے۔ ہاں، ایک چیز کا فقدان ہے:

ان کا رشتہ اپنے رب کے ساتھ نہیں اور رب کا بھی ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہے۔

اہلِ فارس کی طرف سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنا ایلچی بھیجو! تاکہ ہم سے گفتگو کرے' ہمیں بتائے کہ یہاں کیا لینے آئے ہو' کیا مقاصد ہیں؟ پھر ایک شخصیت کا انتخاب ہوتا ہے اور وہ ہیں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔ تاریخی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے دو بار سفارت بھیجی گئی۔ ایک بار ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ گئے اور دوسری بار مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ۔ (واللہ اعلم)

سادگی اور خودداری کے پیکر مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے لیے خیموں کو سجایا جا رہا ہے۔ ریشم و کمخواب کی چادریں، بیش قیمت پردے، قالین، خادم زرق برق لباس میں ملبوس۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اپنے پیوند لگے لباس میں آ رہے ہیں۔ معمولی سا پرانا لباس، تلوار کے لیے میان تک نہیں۔ اس پر چیتھڑے لپٹے ہوئے ہیں۔

دروازے پر دربان نے نیا لباس پیش کیا۔ تلوار اپنے پاس رکھنے کے لیے اصرار کیا۔ گویا ہوئے: جس حالت میں آیا ہوں اسی حالت میں تمہارے بادشاہ سے ملوں گا، نہ لباس تبدیل کروں گا نہ اپنی تلوار تمہارے حوالے کروں گا۔ اگر ملنا ہے تو اسی حالت میں ملوں گا۔ یہ تھے سرفروش، دنیا سے مکمل بے رغبتی رکھنے والے مجاہد۔

رستم نے کہا کہ جس طرح آتا ہے آنے دو۔ یہ اپنی تلوار کی نوک ان قالینوں میں چبھوتے ہوئے نہایت بے پروا انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔ رستم کے تخت پر جا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ درباریوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں: کتنا غیر مہذب ہے۔ اس کو تہذیب کا علم نہیں۔ یہ جاہل عرب ہوتے ہی ایسے ہیں۔ آداب کا پاس ولحاظ نہیں۔ آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے رستم کی طرف دیکھا، درباریوں سے مخاطب ہوئے: اے عجم کے لوگو! ہم تمہارے بارے میں بڑے وہم کا شکار تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ تم نہایت ذہین، ہوشیار اور گہری سوچ وفکر کے مالک ہو۔ مگر آج تمہارے پاس آ کر اندازہ ہوا کہ تمہارے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں۔ تمہیں اپنے امراء کی غلامی پسند ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں امیر اور رعیت میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ ہمارا امیر تو سب سے مصروف تر اور مسلسل کام کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں حکمرانی ایک اضافی بوجھ اور ذمے داری ہے۔ اس میں کوئی عیش وآرام اور سعادت والی بات نہیں ہے۔

رستم کے لیے یہ انداز، یہ بے خوفی بڑی عجیب تھی۔ اس نے آج تک ان عربوں سے ملاقات کی تھی جو اس کے عامل کے طور پر مختلف بستیوں پر حکومت

کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس کے پاس عربوں کا بادشاہ نعمان آیا تو اس نے اس سے غلے اور اناج کی طلب کی تھی۔ وہ رستم سے سونے اور چاندی کی بھیک مانگنے آیا تھا۔ اس کا تصور تو یہی تھا کہ یہ عرب بھوکے اور کمزور ہیں۔ ان کو تھوڑی سی دولت‘ معمولی سا لالچ دے کر خریدا جا سکتا ہے۔

رستم، مغیرہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوا: ہمیں تمہاری مالی حالت کا خوب اندازہ ہے‘ تمہارا ملک دنیا کے غریب ترین ملکوں میں سے ہے۔ تم مفلس اور قلاش ہو۔ تمہارا لباس اور تمہاری حیثیت اس کا واضح ثبوت ہے۔ مگر میں تمہارے اوپر رحم کرتے ہوئے تمہارے ہر نوجوان کو غلہ گندم اور کھجور وافر مقدار میں دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ جتنا ایک اونٹ بوجھ اٹھا سکتا ہے تمہارے ہر ساتھی کو ملے گا۔ اور دیکھو یہ تم نے جو ہمارے مقابلے میں آنے کی جرأت کی ہے‘ اس کے لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے جوابی تقریر کی: اے بادشاہ! تم نے ہمارے فقر‘ ہماری حالت کا جو ذکر کیا ہے وہ بالکل درست اور بجا تبصرہ ہے۔ بلا شبہ ہم فقیر ترین قوم تھے‘ بھوک کے مارے جو ملتا اس کو کھا لیتے۔ ہم جہالت اور گمراہی میں تھے‘ اپنے اعزّہ کو قتل کرتے کہ اس کا مال ہڑپ کر سکیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر اپنا احسان فرمایا اور ہمیں رسول اللہ ﷺ جیسی نعمت سے نوازا‘ انھوں نے سیدھی راہ اور خیر کے دروازوں کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی؛ چنانچہ ہمارے دلوں میں نفرتوں کی جگہ محبت کے چشمے ابلنے لگے۔

رستم نے حقارت بھری نظروں سے مغیرہ رضی اللہ عنہ کی تلوار کی طرف دیکھا: اس پر بھروسا کرتے ہو؟ اس پر میان تک موجود نہیں۔ درباری کو اشارہ کیا‘ خوبصورت مرصع تلوار پیش کی اور کہا کہ اپنی تلوار کے بدلے اس کو لے لو!

مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کو گھمایا‘ یہ بجلی کی طرح کوند گئی۔ ایرانی تلوار پر زور سے اپنی تلوار کو اس طرح مارا کہ مرصع تلوار دو ٹکڑے ہو گئی۔ پھر رستم سے مخاطب ہوئے: تمہارے پاس صرف تین راستے ہیں۔ اسلام قبول کر لو یا جزیہ دینے پر رضا مندی ظاہر کر دو یا پھر ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ جنگ کرے گی۔

رستم نے جزیے کا نام سنا‘ ناک بھوں چڑھائی۔ اپنے درباریوں کو دیکھا پھر نخوت بھری نظروں سے مغیرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر کہا: تم نے جس گستاخی کا ارتکاب کیا ہے اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کرا دیتا۔ مگر سنو! کل کا دن...... ہاں کل میں تم سب کو نیست و نابود کر کے رکھ دوں گا۔

اگلے دن لڑائی کا آغاز ہوا۔ ایرانی اپنے ہمراہ ہاتھی لے کر آئے تھے۔ جس طرح آج ٹینک سوار محفوظ سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح ہاتھی تھے۔ وہ آگے بڑھتے گئے‘ مسلمانوں کا خاصا نقصان ہو رہا تھا، وہ سوچ رہے تھے کہ ان کو کیسے روکا جائے۔ بالآخر مجاہدین اسلام آگے بڑھتے ہیں۔ ہاتھیوں کی سونڈوں کو تلواروں سے کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ ہاتھی چیختے چلاتے پیچھے کو مڑے۔ اب ایرانی روندے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف ایرانیوں کی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے:

﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ﴾ (محمد:7)

”اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔“

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس روز عرق النساء کے مرض میں مبتلا تھے۔ چلنے پھرنے سے معذور‘ ایک اونچے مکان کی چھت پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سامنے میدان جنگ تھا۔ احکامات لکھ لکھ کر کمانڈروں کے حوالے کر رہے ہیں۔ ترکیبیں بتا رہے ہیں۔ دشمن بھی خوب مقابلہ کر رہا ہے۔ ایک گھڑ سوار پر نظر پڑی‘ دیکھا وہ صفوں

کو الٹ رہا ہے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں کبھی سامنے جاتا ہے۔ دشمن کی صفیں درہم برہم ہو رہی ہیں۔ یہ کون ہے؟ اس کی شکل صورت تو ابو محجن جیسی ہے۔ مگر وہ تو قید میں ہیں۔ ابو محجن نے شراب نوشی کی تھی۔ حضرت سعد ؓ نے اس پاداش میں ان کو مکان کے اندر بند کر دیا تھا۔ معرکہ شروع ہوا' یہ بہادر تو تھے ہی۔ معرکے کو کھڑکی سے دیکھا تو بے چین ہو گئے' جذبہ جہاد عود کر آیا۔ سامنے کافر ہیں جن کے مقابلے میں اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے مسلمان سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ نہایت بے بسی سے کہا: میں پابندِ سلاسل ہوں' کاش! میں بھی ان میں شامل ہو سکتا۔

وہ سوچ رہے ہیں: کیسے نکلوں، کون نکالے گا، کون مجھ پر اعتبار کرے گا؟

حضرت سعد ؓ کی بیوی کو بلایا: دیکھو! رب کو گواہ بنا کر وعدہ کرتا ہوں' مجھے آزاد کر دو۔ جہاد میں حصہ لینا چاہتا ہوں' اگر زندہ رہا تو واپس آ کر اپنے ہاتھوں میں خود ہتھکڑیاں پہن لوں گا اور اگر شہید ہو گیا تو اللہ معاف کرے۔

سعد ؓ کی بیوی کو ترس آ گیا۔ ایک مجاہد اور پابندِ سلاسل؟ بیڑیاں اتاریں، سعد کا گھوڑا دیا اور پھر ایک مجاہد اپنے کمانڈر انچیف کے گھوڑے پر بیٹھا اس کا حق ادا کر رہا ہے۔

حضرت سعد اس نوجوان کی بہادری کے جوہر دیکھ رہے ہیں: ارے! یہ تو ابو محجن ہی ہے' اتنا بہادر، اتنا دلیر اور اتنا شجاع۔ اچھا! آج کے بعد اس کو قید نہیں کروں گا۔ اور ادھر ابو محجن کہہ رہے ہیں: آج کے بعد کبھی بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اور پھر میدانِ جنگ مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

یہ فتح کوئی معمولی نہ تھی۔ غنیمت کا مال جمع کیا گیا' مجاہدین میں تقسیم ہوا۔ بیت المال کا حصہ مدینہ منورہ بھیجا گیا۔ اتنا زیادہ مالِ غنیمت کہ جس کا تصور بھی نہیں

کیا جا سکتا تھا۔ ان میں ایک قالین تھا جس کی لمبائی 60 ہاتھ اور چوڑائی بھی اتنی ہی تھی۔ اس میں خوبصورت باغ کی تصویر تھی، نہر تھی، پھول تھے۔ یہ ساری تصویر دیباج سے بنی ہوئی تھی۔ اس میں خالص سونے اور موتی جیسے جواہرات سے درخت بنے ہوئے تھے۔ مال غنیمت میں انواع واقسام کی چیزیں تھیں۔ اور ان میں خاص اور اہم چیز کسریٰ کا تاج تھا اور اس کے ساتھ سونے کے کنگن، جو کسریٰ اپنے ہاتھوں میں پہنتا تھا۔ مسجدِ نبوی میں مال غنیمت کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ لوگ تعجب سے اس کو دیکھ رہے ہیں۔ فاروقِ اعظم مسلمانوں کی امانت اور دیانت پر تعجب کر رہے ہیں۔ اتنا زیادہ مال و دولت اور اس قدر امانت داری سے اس کو پہنچایا گیا۔ کسریٰ کے تاج اور کنگن اب حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہیں۔ الٹ پلٹ کر دیکھا، مسجد میں ان کی آواز گونجی: سراقہ کہاں ہے؟ ہاں وہی سراقہ رضی اللہ عنہ جس نے ہجرت کے وقت اللہ کے رسول ﷺ کا پیچھا کیا تھا، حاضر ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں کنگن اور سر پر تاج رکھا جا رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رقت بھری آواز میں فرمایا: اس رب کا شکر ہے کہ اس نے ان چیزوں کو کسریٰ بن ہرمز سے چھینا اور بنو مدلج کے ایک بدو کو ان کا مالک بنا دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ رستم کی دھمکیاں خاک میں مل گئیں، وہ مسلمانوں کو نیست و نابود کرتے کرتے خود ہی ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ وہ کسریٰ جس کے دربار میں ایک پتا بھی اس کی اجازت کے بغیر حرکت نہ کرتا تھا، ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا۔ وہ محل جہاں شان و شوکت تھی، لوگوں کے لئے جائے عبرت بن گیا۔

یہ قادسیہ کی جنگ تھی جس نے مسلمانوں کے لیے عراق کے دروازے وا کر دیے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس قافلے کے سالار تھے۔

مسلمان جن

امام مسلم اور امام مالک وغیرہ ہشام بن زہرہ کے غلام ابوسائب سے روایت کرتے ہیں، ان کا بیان ہے: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے گھر گیا۔ اس وقت وہ نماز میں مشغول تھے۔ میں ان کی فراغت کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں گھر کے ایک کونے میں چارپائی کے نیچے سے حرکت کی آواز سنائی دی۔ میں نے دیکھا تو ایک سانپ تھا۔ میں جلدی سے اسے قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا مگر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کو کہا؛ چنانچہ میں بیٹھ گیا۔

جب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہو گئے تو گھر کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا: یہ کمرہ دیکھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس گھر میں ہمارا ایک نوجوان رہا کرتا تھا، اس کی ابھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جب ہم رسولِ اکرم ﷺ کے ہمراہ خندق کی کھدائی کے لیے نکلے تو یہ نوجوان دوپہر کو رسولِ اکرم ﷺ سے گھر جانے کی اجازت طلب کرتا اور اجازت ملنے پر اپنے گھر آتا۔ ایک دن معمول کے مطابق اس نے جب رسولِ اکرم ﷺ سے گھر جانے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«خُذْ عَلَيْكَ سِلَاحَكَ فَإِنِّي أَخْشَى عَلَيْكَ بَنِي قُرَيْظَةَ».

''تم اپنا ہتھیار ساتھ لے لو، کیوں کہ مجھے تم پر بنو قریظہ کے حملے کا خدشہ ہے۔''

نوجوان نے رسولِ اکرم ﷺ کے حکم کی تعمیل کی اور اپنا ہتھیار لے کر اہلِ خانہ کی طرف چل پڑا۔ جب گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی دروازے کے درمیان کھڑی ہے۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی غیرت جاگ اٹھی اور اس نے بیوی کو مارنے کے لیے نیزہ نکال لیا۔ بیوی جلدی سے گویا ہوئی:

«اكْفُفْ عَلَيْكَ رُمْحَكَ وَادْخُلِ الْبَيْتَ حَتَّى تَنْظُرَ مَا الَّذِي أَخْرَجَنِي».

”نیزہ چلانے میں جلدی مت کرو! اور گھر کے اندر داخل ہو کر دیکھو کہ میں گھر سے کیوں نکلی ہوں۔“

نوجوان گھر کے اندر داخل ہوا، کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا سانپ کنڈلی مارے اس کے بستر پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے نیزہ سنبھالا اور اسی نیزہ میں سانپ کو کونچ لیا، پھر نیزہ لے کر نکلا اور اسے گھر میں گاڑ دیا۔ اتنے میں سانپ نے اس پر حملہ کیا اور جوان مردہ ہو کر گر گیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ پہلے کس کی موت آئی، سانپ کی یا جوان کی؟

حضرت ابوسعید ؓ آگے بیان کرتے ہیں: پھر ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپ ﷺ کو اس واقعے کی خبر دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعا فرما دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اسْتَغْفِرُوا لِصَاحِبِكُمْ».

”اپنے ساتھی کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرو!“

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ بِالْمَدِينَةِ جِنًّا قَدْ أَسْلَمُوا، فَإِذَا رَأَيْتُمْ مِنْهُمْ شَيْئًا

فَآذِنُوهُ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، فَإِنْ بَدَا لَكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ فَاقْتُلُوهُ، فَإِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ» .

”مدینے میں بعض جنات نے اسلام قبول کیا ہے، جب تم کوئی سانپ دیکھو تو تین دن تک اسے زبانی تنبیہ کرو، پھر بھی وہ نہ نکلے تو اسے قتل کر ڈالو، کیوں کہ وہ شیطان ہے۔“(1)

---

(1) مسلم (2236)، موطأ إمام مالك، كتاب الاستئذان، باب (12)۔

جنت کی کھجور

یثرب کی بستی، کھجوروں کی بستی، اب نبی کریم ﷺ کی آمد کے بعد مدینۃ النبی کہلاتی تھی، اس میں ہر طرف مختلف باغات تھے، ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ان کے مختلف مالکان تھے، انھی باغات میں ایک یتیم بچے کا باغ بھی تھا، اس کے ساتھ ایک دوسرے آدمی کا باغ تھا، کھجوروں کے درخت اس طرح آپس میں ملے ہوئے تھے کہ آندھی اور بارش میں کھجوریں نیچے گر پڑتیں تو پھر تمیز کرنا مشکل ہو جاتی کہ یہ کس درخت سے گری ہیں۔ یتیم نے سوچا کہ کیوں نہ میں دیوار سے اپنے باغ کو علیحدہ کرلوں، تاکہ ملکیت واضح ہو جائے، کسی قسم کا تنازع اور جھگڑا نہ کھڑا ہو۔ چنانچہ اس نے دیوار بنانا شروع کی، جب اس نے دیوار بنانا شروع کی تو اس کے ہمسائے کی کھجور کا درخت درمیان میں حائل ہو گیا، دیوار سیدھی اس صورت میں ہوتی تھی جب اس کو یہ درخت مل جاتا، وہ یتیم بچہ اپنے ہمسائے کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کے باغ میں بہت ساری کھجوریں ہیں، میں دیوار بنا رہا ہوں آپ کی ملکیت کی ایک کھجور راستے میں رکاوٹ بن رہی ہے، یہ کھجور مجھے دے دیں تو میری دیوار سیدھی ہو جائے گی، اس شخص نے انکار کر دیا۔ اس بچے نے کہا کہ اچھا آپ مجھ سے اس کی قیمت لے لیں، تاکہ میں اپنی دیوار سیدھی کرلوں۔ اس نے کہا کہ میں اسے بیچنے پر بھی تیار نہیں۔ یتیم نے خوب اصرار کیا، ہمسائگی کا واسطہ دیا، مگر اس پر دنیا سوار تھی، نہ یتیمی کا لحاظ نہ ہمسائگی کا پاس۔ یتیم نے کہا کہ دیکھیں کیا میں اپنی دیوار نہ بناؤں، اس کو سیدھا نہ کروں۔ ہمسائے نے کہا: یہ تمہارا معاملہ ہے، تم جانو تمہارا کام جانے! تمہاری دیوار سیدھی رہے یا ٹیڑھی، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، مگر میں کھجور کو

فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یتیم جب اس سے مکمل مایوس ہو گیا تو خیال آیا کہ ایک ایسی شخصیت ہیں اگر وہ سفارش کر دیں تو میرا کام بن سکتا ہے۔ دل میں خیال آتے ہی قدم مسجدِ نبوی کی جانب اٹھ گئے۔

یہ قصہ باعثِ تعجب ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ کو آپ ﷺ سے کس قدر محبت تھی اور آپ کے الفاظ کا کس قدر پاس تھا۔ وہ یتیم بچہ جب مسجد نبوی میں آیا تو سیدھا اللہ کے رسول ﷺ کے پاس پہنچا‘ عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا باغ فلاں آدمی کے باغ سے ملا ہوا ہے‘ میں ان کے درمیان دیوار بنا رہا ہوں‘ مگر دیوار اس وقت تک سیدھی نہیں بنتی جب تک راستے میں آنے والی ایک کھجور میری ملکیت نہ بن جائے‘ میں نے اس کے مالک سے عرض کیا کہ وہ مجھے فروخت کر دے‘ میں نے اس کی منت سماجت بھی کی‘ مگر اس نے انکار کر دیا ہے‘ اللہ کے رسول ﷺ! میری اس سے سفارش کر دیں کہ وہ مجھے کھجور دے دے! آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ! اس آدمی کو بلا کر لے آؤ۔

وہ یتیم اس شخص کے پاس گیا اور کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ تمہیں بلا رہے ہیں‘ وہ شخص مسجدِ نبوی میں آیا‘ آپ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا: تمہارا باغ اس یتیم کے باغ سے ملا ہوا ہے‘ یہ یتیم بچہ دیوار بنا کر اپنے باغ کو تمہارے باغ سے علیحدہ کرنا چاہتا ہے‘ تمہاری ایک کھجور اس کی راہ میں رکاوٹ ہے‘ تم ایسا کرو کہ اپنے بھائی کو یہ کھجور دے دو!

اس شخص نے کہا: میں تو نہیں دوں گا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ اپنے بھائی کو یہ کھجور دے دو! اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے پھر فرمایا: اپنے بھائی کو کھجور دے دو اور میں تمہیں جنت میں کھجور کی ضمانت دیتا ہوں۔ اس شخص نے اتنی بڑی پیشکش سننے کے باوجود کہا: نہیں‘ میں کھجور نہیں دے سکتا۔ آپ ﷺ اب خاموش ہو گئے‘ اس

سے زیادہ کچھ کہنا آپ ﷺ نے مناسب نہ جانا!

حضراتِ صحابہ خاموشی سے ساری گفتگو سن رہے تھے‘ حاضرین مجلس میں حضرت ابو دحداح رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے۔ مدینے میں ان کا بڑا خوبصورت باغ تھا‘ 600 کھجور کے درختوں پر مشتمل باغ اپنے پھل کے سبب بڑا مشہور تھا۔ اس باغ کی کھجوریں اعلیٰ قسم کی شمار ہوتی تھیں‘ منڈی میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ مدینے کے بڑے بڑے تاجر اس بات کی حسرت اور خواہش کرتے تھے کہ کاش! یہ باغ ان کی ملکیت ہوتا۔ ابو دحداح رضی اللہ عنہ نے اس باغ کے وسط میں اپنا خوبصورت سا گھر تعمیر کر رکھا تھا‘ بیوی اور بچوں کے ساتھ وہیں رہائش پذیر تھے‘ میٹھے پانی کے کنویں نے اس باغ کی اہمیت کو اور زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ابو دحداح رضی اللہ عنہ نے جب اللہ کے رسول ﷺ کی پیش کش کو سنا تو دل میں خیال آیا کہ اس دنیا کا کیا ہے؟ آج نہیں تو کل مرنا ہے‘ اور پھر ہمیشہ کی زندگی‘ عیش و آرام یا دکھ و آلام کی زندگی۔ اگر جنت میں ایک کھجور مجھے مل جائے تو کیا کہنے! آگے بڑھے اور کہا: اللہ کے رسول ﷺ! یہ جو پیش کش آپ نے کی ہے، صرف اسی شخص کے لیے ہے یا اگر میں اس آدمی سے اس کھجور کو خرید کر اس یتیم بچے کو دے دوں تو مجھے بھی جنت میں کھجور ملے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں تمہارے لیے بھی جنت میں کھجور کی ضمانت ہے۔ اب ابو دحداح رضی اللہ عنہ سوچنے لگے کہ ایسی کون سی چیز ہے جو میں اس شخص کو دے کر اس سے وہ کھجور خرید لوں‘ اور پھر اس یتیم کو دے دوں۔ پھر اچانک ہی ایک عجیب فیصلہ کیا‘ اس آدمی سے مخاطب ہوئے، کہا: سنو! تم میرے باغ سے واقف ہو جس میں میرے 600 کھجوروں کے درخت‘ گھر اور کنواں ہے۔ اس نے کہا: مدینے میں کون ہوگا جو اس باغ کو نہ جانتا ہو! کہا: تم ایسا کرو کہ میرا سارا باغ اس ایک کھجور

کے بدلے میں لے لو۔ اس آدمی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا، اس نے مڑ کر ابودحداح رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا، پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر گویا ہوا: سن رہے ہو، ابودحداح کیا کہہ رہا ہے؟ ابودحداح رضی اللہ عنہ نے پھر اپنی بات کو دہرایا، لوگوں کو اس پر گواہ بنایا، چنانچہ اس ایک کھجور کے بدلے میں اپنا سارا باغ، کنواں اور گھر اس آدمی کے حوالے کر دیا۔ جب اس کھجور کے مالک بن گئے تو اس یتیم بچے سے کہا: آج کے بعد وہ کھجور تمہاری، میں نے تم کو تحفے میں دے دی، اب اپنی دیوار سیدھی بناؤ، اب تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کی طرف رخ کیا، عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا اب میں جنت میں کھجور کا مستحق ہو گیا ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«كَمْ مِنْ عَذْقٍ رَدَاحٍ لِأَبِي الدَّحْدَاحِ فِي الْجَنَّةِ».

''ابودحداح کے لیے جنت میں کتنے ہی کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔''(1)

اس حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ الفاظ ایک دو یا تین مرتبہ نہیں بلکہ خوشی کے ساتھ متعدد بار دہرائے حتیٰ کہ ابودحداح رضی اللہ عنہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جنت میں باغات کی خوشخبری پانے کے بعد باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ دل میں خیال آیا کہ ذاتی کپڑے، کچھ ضروری اغراض کی اشیاء تو وہاں سے لیتا آؤں۔ باغ کے دروازے پر آئے، اندر سے بچوں کی آوازیں سنائی دیں، بیوی گھریلو کام کاج میں مصروف، بچے کھیل رہے ہیں۔ خیال آیا کہ اندر جا کر بیوی کو خبر سناؤں، مگر پھر دروازے ہی پر رک گئے۔ آواز دی: اے ام دحداح!

ام دحداح نے بڑا تعجب کیا کہ آج ابودحداح باغ سے باہر دروازے پر

---

(1) أحمد(146/3)، الحاكم(20/3)، مجمع الزوائد (324/9)، الإصابة(9867).

کیوں رک گئے ہیں، اندر کیوں نہیں آتے؟ دوبارہ آواز آئی: ام دحداح؟ جواب دیا: حاضر اے ابودحداح! فرمایا: اس باغ سے بچوں سمیت باہر نکل آؤ، میں نے اس کو فروخت کر دیا ہے۔ ام دحداح رضی اللہ عنہا نے کہا: آپ نے اس کو بیچ دیا ہے۔ کس کو فروخت کیا ہے، کون خریدار ہے، کتنے میں؟ فرمایا: میں نے اس کو جنت میں ایک کھجور کے بدلے میں فروخت کر دیا ہے۔ ام دحداح رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ اکبر! رَبِحَ الْبَیْعُ یَا اَبَا الدَّحْدَاحِ، آپ نے بڑا ہی منافع بخش سودا کیا ہے، اب باغ میں داخل نہ ہونا۔ بڑا ہی فائدہ مند سودا ہوا ہے، جنت میں ایک درخت، جس کے نیچے گھڑ سوار ستر برس چلتا رہے تو اس کا سایہ ختم نہ ہو۔ ام دحداح رضی اللہ عنہا نے بچوں کو پکڑا، ان کی جیبوں کو ٹٹولا، جو کچھ ان میں تھا اس کو نکالا، کہا کہ اب یہ رب کا ہو گیا ہے ہمارا نہیں، اور خالی ہاتھ باغ سے باہر نکل آئیں

ابودحداح اور ام دحداح رضی اللہ عنہما کا یہ قدم، یہ کارنامہ کوئی معمولی نہیں، اللہ کے رسول ﷺ کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی سب سے قیمتی چیز کو رب کی راہ میں لٹا دیا۔ اپنے آباد گھر، باغ، کنویں کو چھوڑا اور ہمارے لیے مثالیں قائم کر گئے کہ اس کو کہتے ہیں حقیقی محبّ، محبِّ صادق۔ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والے۔

ابودحداح اور ام دحداح رضی اللہ عنہما! تم پر اللہ کی رحمت کی بارش ہو، تم نے کتنی قربانی اور ایثار کا مظاہرہ کیا، بلاشبہ تمہارا یہ کارنامہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گیا۔

موت کی کیفیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی جاں کنی کے وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتنے میں ان کے صاحبزادے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ان کے پاس آئے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا: عبداللہ! وہ صندوق لے لو۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس صندوق کی ضرورت نہیں ہے۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ صندوق مال وزر سے بھرا ہوا ہے۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«لَيْتَهُ مَمْلُوءٌ بَعْرًا»

”کاش! یہ صندوق مینگنیوں سے بھرا ہوا ہوتا۔“

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اے ابوعبداللہ! آپ کہا کرتے تھے: میری خواہش ہے کہ میں کسی عقلمند شخص کو جاں کنی کے عالم میں دیکھوں اور اس سے پوچھوں کہ تم موت کو کیسے پا رہے ہو؟ پھر آپ ہمیں بتائیں کہ آپ موت کو کیسا پا رہے ہیں؟

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«كَأَنَّمَا أَتَنَفَّسُ مِنْ خَرْتِ إِبْرَةٍ»

”ایسا لگ رہا ہے جیسے میں سوئی کے ناکے سے سانس لے رہا ہوں۔“

پھر کہنے لگے:

«اللَّهُمَّ خُذْ مِنِّي حَتَّى تَرْضَى».

"اے اللہ! مجھ سے جو چاہے لے لے، یہاں تک کہ مجھ سے خوش ہو جا!"

اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا اور کہنے لگے:

«اللَّهُمَّ أَمَرْتَ فَعَصَيْنَا وَنَهَيتَ فَرَكِبْنَا، فَلَا بَرِيءَ فَأَعْتَذِرَ وَ لَا قَوِيَّ فَأَنْتَصِرَ وَلَكِنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ».

"اے اللہ! تو نے حکم دیا مگر ہم نے نافرمانی کی، تو نے معصیت سے روکا مگر ہم نے اس کا ارتکاب کیا، تیرے سوا کوئی براءت دینے والا نہیں کہ میں اس کے سامنے عذر پیش کروں، اور نہ ہی کوئی طاقت والا ہے جس سے مدد طلب کروں، ہاں اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں (اس لیے تیرے ہی سامنے ہم اپنا ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ تو ہمیں بخش دے)!"

یہ بات آپ نے تین دفعہ کہی۔ پھر آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

حضرت عمرو بن عاص ؓ کی جاں کنی کے وقت کی کیفیت علامہ ذہبی نے طبقات ابن سعد (260/4) کے حوالے سے نقل کی ہے کہ حضرت عمرو بن عاص ؓ کہا کرتے تھے:

«عَجَبًا لِّمَنْ نَزَلَ بِهِ الْمَوْتُ وَعَقْلُهُ مَعَهُ، كَيْفَ لَا يَصِفُهُ؟».

"تعجب ہے کہ جاں کنی کے عالم میں مبتلا شخص سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی کیوں کر موت کی کیفیت بیان نہیں کر پاتا ہے؟"

مگر جب عمرو بن عاص ؓ کی موت آن پہنچی اور جاں کنی کے عالم میں ان سے ان کے صاحبزادے نے موت کی کیفیت پوچھی تو انھوں نے فرمایا:

«يَا بُنَيَّ، الْمَوْتُ أَجَلُّ مِنْ أَنْ يُوصَفَ، وَلَكِنْ سَأَصِفُ

لَكَ أَجِدُنِي كَأَنَّ جِبَالَ رَضْوَى عَلَى عُنُقِي، وَكَأَنَّ فِي جَوْفِي الشَّوكَ، وَأَجِدُنِي كَأَنَّ نفسِي يَخْرُجُ مِنْ إِبْرَةِ».

”صاحبزادے! موت کی کیفیت بیان سے باہر ہے، پھر بھی میں تجھ سے بیان کروں گا: ایسا لگتا ہے کہ رَضوی کے پہاڑ (رَضوی مدینے سے سات مراحل پر اور ینبع سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے) میری گردن پر رکھے ہوئے ہیں، اور جیسے میرا پیٹ کانٹوں سے بھر گیا ہو، اور یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میری سانس سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہے۔“(1)

---

(1) دیکھیے: سیر أعلام النبلاء (75/3)۔

وعدہ کی پاسداری

اندلس کے دو حاکموں، حارس بن عباد اور عدی بن ابی ربیعہ میں لڑائی چھڑ گئی۔ حارس بن عباد کو عدی بن ابی ربیعہ کی تلاش تھی۔ ان دونوں کی آپس میں کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔ حارس بن عباد، عدی سے اپنی پرانی دشمنی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ حارس کے فوجیوں نے ایک آدمی کو گرفتار کر لیا۔ اسے حارس بن عباد کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے قیدی سے پوچھا: مجھے بتاؤ عدی بن ابی ربیعہ کہاں ہے (وہ اس کی شکل نہیں پہچانتا تھا)؟

قیدی کہنے لگا: اگر میں تمہیں عدی کے بارے میں بتا دوں تو کیا مجھے آزاد کر دو گے؟

حارس نے کہا: ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں رہا کر دوں گا۔

قیدی نے کہا: تو پھر سنو، میں ہی عدی بن ابی ربیعہ ہوں۔

حارس بن عباد نے اسے اپنے وعدے کی پاسداری کی خاطر رہا کر دیا۔

والدین کا مقام

عمرو بن مرّۃ جہنی ؓ راوی ہیں کہ (قبیلۂ قضاعہ کا) ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے کلمۂ شہادت کی گواہی دی، پانچ وقت کی نمازیں پڑھتا ہوں، اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، رمضان کے روزے رکھتا ہوں (میرے لیے اجر و ثواب کتنا ہے؟)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ مَاتَ عَلَى هَذَا كَانَ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ يَومَ الْقِيَامَةِ هَكَذَا - وَنَصَبَ أُصْبَعَيْهِ - مَا لَمْ يَعُقَّ وَالِدَيْهِ».

”جس کا انتقال ان (واجبات کی ادائیگی) کے ساتھ ہو، وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ اس طرح ہوگا — اور بات کو سمجھانے کیلئے آپ نے اپنی انگلیوں کو اٹھایا — جب تک وہ اپنے والدین کا نافرمان نہ ہو۔“

اس حدیث سے اندازہ کریں کہ والدین کا رتبہ کس قدر عظیم ہے۔(1)

---

(1) (صحیح) مسند أحمد (81/24009)۔

تقویٰ اور اس کا انعام

شام کے مشہور عالم دین شیخ طنطاوی نے اپنی یادداشتوں میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک لڑکا نیک و صالح تھا، اس میں تقویٰ اور پرہیزگاری تھی؛ البتہ حصولِ علم میں کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک دینی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ استاد جو کہتا، اسی پر عمل کرتا۔ جب اس نے اپنے استاد کی خدمت میں رہ کر ضرورت کے مطابق علم حاصل کر لیا تو استاد نے اسے اور اپنے دیگر شاگردوں کو نصیحت فرمائی:

«لَا تكُونُوا عَالَةً عَلَى النَّاس، فَإِنَّ العَالِمَ الَّذِي يَمُدُّ يَدَهُ إِلَى أَبْنَاءِ الدُّنْيَا لَا يَكُونُ فِيهِ خَيْرٌ، فَلْيَذْهَبْ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْكُمْ وَلَيَشْتَغِلْ بِالصُّنْعَةِ الَّتِي كَانَ أَبُوهُ يَشْتَغِلُ بِهَا وَلْيَتَّقِ اللهَ فِيهَا».

”لوگوں کے محتاج نہ بنو، کیوں کہ دنیاداروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والا عالم خیر و بھلائی سے محروم ہوتا ہے (اس لیے کہ جو کچھ دنیادار کہتے اور کرتے ہیں، عالم اس پر انکار کرنے کی جرأت نہیں کرے گا، کیونکہ وہ ان کے احسان تلے دبا ہوتا ہے)۔ لہٰذا تم میں سے ہر طالب علم جا کر اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لے (اور اس سے معاش پیدا کرے) اور اپنے پیشے میں اللہ کا خوف اور تقویٰ ملحوظِ خاطر رکھے۔“

لڑکے اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے، یہ لڑکا بھی استاد کی نصیحت سن کر اپنے گھر گیا اور اپنی ماں سے پوچھا: امی جان! ذرا مجھے بتائیں کہ میرے ابو جان کا پیشہ کیا تھا، وہ کیا کام کرتے تھے؟

بیٹے کے اس سوال سے ماں گھبرا سی گئی اور پوچھا: بیٹے، تیرے والد کا مدت ہوئی

انتقال ہو چکا ہے، تمہیں اپنے باپ کے پیشہ سے کیا لینا دینا، جو یہ سوال کر رہے ہو؟

بیٹے نے اب اصرار کے ساتھ اپنے باپ کا پیشہ جاننا چاہا اور ماں اس سے ٹال مٹول کرتی رہی۔ جب بیٹے نے ضد کی تو ماں نہ چاہتے ہوئے بھی گویا ہوئی: بیٹے، جب تم بار بار مجھ سے اپنے باپ کے پیشے کے بارے میں پوچھ رہے ہو تو مجبوراً زبان کھولنی پڑ رہی ہے۔ اگر کوئی اچھا پیشہ تمہارے باپ کا ہوتا تو مجھے بتانے میں اس قدر تذبذب سے کام نہ لینا پڑتا، لیکن جب تمہارا اصرار ہی ہے تو سنو! تمہارا باپ چور تھا چور! چوری ہی اس کا پیشہ تھا۔

بیٹے نے ماں کا جواب سن کر کہا: امی جان، استاد محترم نے تمام طلبہ سے کہا ہے کہ جاؤ اور اپنے اپنے باپ کا پیشہ اختیار کر لو، اور اس میں تقویٰ کا خیال رکھنا۔

ماں نے کہا: تیرا ناس ہو! بھلا چوری میں تقویٰ شعاری! یہ کیسی بات ہے؟

بیٹے نے ماں سے کہا: لیکن امی جان، استاد محترم نے یہی بات کہی ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔

پھر نوجوان لڑکے نے چوری سے متعلق معلومات حاصل کرنا شروع کیں، باقاعدہ ٹریننگ لی کہ چوری کیسے کرتے ہیں، اس کے لیے ضروری اوزار مہیا کیے اور وہ دن بھی آ گیا جب اس کی ٹریننگ مکمل تھی اور وہ چوری کر سکتا تھا۔

پھر اس نے خاصے غور وخوض کے بعد پروگرام بنایا کہ آج سے اپنے والد کے پیشے پر عمل کرنا ہے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر وہ لوگوں کے سونے کا انتظار کرتا رہا۔ جب لوگ سو گئے اور چاروں طرف سناٹا چھا گیا تو اس نے سب سے پہلے پڑوسی ہی کے گھر سے چوری کا آغاز کرنے کا ارادہ کیا۔ جب پڑوسی کے گھر میں داخل ہونا چاہا تو اسے اپنے استاد کی نصیحت یاد آ گئی کہ اپنے پیشے میں تقویٰ کا پاس ولحاظ رکھنا۔ اس

نے دل میں کہا: پڑوسی کے گھر میں چوری کرنا اور اسے تکلیف دینا تو سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوگا۔ چنانچہ وہ پڑوسی کا گھر چھوڑ کر اگلے گھر کی طرف بڑھا۔ وہ یتیم بچوں کا گھر تھا۔ اس نے کہا: یہ یتیم بچوں کا گھر ہے، اس میں چوری کرنا تقویٰ کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال کھانے سے منع فرمایا ہے۔ وہ یہ گھر بھی چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اسی طرح جب کوئی گھر آتا اور یہ چوری کرنے کا ارادہ کرتا تو کوئی نہ کوئی بات اس کے ذہن میں آجاتی جس کو تقویٰ کے خلاف کہہ کر وہ آگے بڑھتا چلا جاتا، یہاں تک کہ ایک تاجر کا گھر آگیا۔ یہ تاجر خاصا امیر آدمی تھا۔ اس کی صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ چور نے کہا: ہاں، یہ گھر ہے جس میں چوری کی جا سکتی ہے۔ پھر اس نے بہت سی چابیاں نکالیں جو پہلے سے بنوا رکھی تھیں، اور دروازہ کھول لیا۔ جب گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ گھر تو بہت بڑا ہے اور کمرے بھی بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ وہ گھر میں گھومنے لگا جیسے کوئی چور نہیں، مہمان ہو۔ بالآخر اس کی نگاہ اس جگہ پڑ گئی جہاں مال رکھا ہوا تھا۔ اس نے تجوری کھولی تو وہ سونے چاندی اور روپے پیسے سے بھری پڑی تھی۔ چور نے تجوری سے مال نکالنا چاہا لیکن اسے اپنے استاد کی نصیحت یاد آگئی اور کہنے لگا: استاد محترم نے تو تقویٰ اختیار کرنے کی بات کہی تھی، ہاں، پتا نہیں اس تاجر نے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی ہے یا نہیں، کیوں نہ پہلے اس کی زکوٰۃ کا حساب کتاب کر لیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے حساب کتاب کے رجسٹروں کو نکالا، اپنے ساتھ لائی ہوئی چھوٹی سی لالٹین روشن کی اور اس کی روشنی میں رجسٹروں کی چھان بین کرنے لگا۔

وہ حساب کتاب کا بہت ہی ماہر تھا؛ چنانچہ اس نے جلدی جلدی پورے مال کا

حساب کیا اور اس کی زکوٰۃ کا حصہ نکال کر الگ کر دیا، پھر وہ حساب کتاب میں اس قدر مستغرق ہوگیا کہ وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ فجر کا وقت ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا: تقویٰ کا تقاضا ہے کہ پہلے نماز فجر ادا کی جائے اور بعد میں اپنا کام کیا جائے۔ وہ گھر کے آنگن میں آیا اور اس سے پانی لے کر وضو کیا، پھر نماز کے لیے اقامت کہنے لگا۔ گھر کے مالک نے جب اقامت کی آواز سنی تو گھبرا کر نیند سے بیدار ہوا۔ نیچے جھانکا دیکھتا کیا ہے کہ ایک چھوٹی سی لالٹین روشن ہے، تجوری کھلی ہوئی ہے، اور سامنے ایک نوجوان نماز کے لیے اقامت کہہ رہا ہے۔ مکان مالک کی بیوی بھی جاگ گئی اور دیکھ کر شوہر سے پوچھا: یہ سب کیا ہے؟ مکان مالک نے بتایا: اللہ کی قسم! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ پھر وہ گھر کی دوسری منزل سے نیچے اتر کر اس نوجوان کے پاس گیا اور کہا: تمہارا ناس ہو! آخر تم ہو کون؟ اور یہ کیا کر رہے ہو؟

چور نے کہا: «الصَّلَاةُ أَوَّلًا ثُمَّ الْكَلَامُ».

"پہلے نماز پڑھ لیتے ہیں، بعد میں بات ہوگی۔"

مالک خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ نوجوان نے اسے حکم دیا، جلدی سے وضو کر کے آؤ۔ وہ وضو کر کے آیا تو نوجوان نے اس سے کہا: چلو تم جماعت کراؤ۔ اس نے نوجوان سے کہا: نہیں تم امامت کراؤ۔

نوجوان نے کہا: تم گھر کے مالک ہو اور زیادہ حق دار ہو کہ امامت کراؤ۔

مالک مکان کے لیے اس کی حکم عدولی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اسے اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے جماعت کرائی۔ اب نماز اس نے کیسی پڑھی؟ اللہ ہی کو اس کی کیفیت کا علم ہے! خوف اور رعب کے مارے اس کا برا حال تھا۔

بہر حال جب نماز ختم ہوئی تو مالک مکان نے پوچھا: مجھے بتاؤ کہ تم ہو کون اور یہاں کس نیت سے آئے ہو؟ نوجوان نے بتایا: میں چور ہوں اور چوری کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ زکوٰۃ کیوں نہیں ادا کرتے؟ میں نے تمہارے رجسٹروں کو چیک کیا ہے۔ تم نے چھ سالوں سے زکوٰۃ نہیں دی، یہ اللہ کا حق ہے اور فرض ہے۔ میں نے حساب کر دیا ہے اور زکوٰۃ کا مال علیحدہ کر دیا ہے تا کہ تم اسے اس کے مستحقین تک پہنچا دو۔

یہ سننا تھا کہ مکان مالک جیسے تعجب سے بوکھلا گیا اور گویا ہوا: تیرا ناس ہو! تو یہ کیا کر رہا ہے کیا تو پاگل ہے؟

اس نے کہا: میں پاگل نہیں، بالکل تندرست، صحت مند اور توانا ہوں۔

مکان مالک نے پوچھا: تو پھر تم چوری کیوں کر رہے ہو؟

اس کے جواب میں نوجوان چور نے اپنی ساری داستان اس تاجر سے کہہ سنائی۔

جب تاجر نے نوجوان کا بھولا پن اور اس کی بھولی بھالی، پیاری شکل صورت اور حساب کتاب میں اس کی مہارت دیکھی تو اپنی بیوی کے پاس گیا اور نوجوان چور کے متعلق سب کچھ بتایا اور کہا کہ تم اپنی بیٹی کے رشتے کے لیے پریشان تھیں۔ اللہ نے رشتہ تمہارے گھر بھیج دیا ہے۔ اس کی بیوی نے بھی موافقت کر لی۔

اب وہ اس نوجوان کے پاس آیا اور کہا: دیکھو! چوری کرنا نہایت بری بات ہے۔ تمہیں مال و دولت چاہیے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے مال میں حصہ دار بنا سکتا ہوں۔ نوجوان نے کہا: وہ کیسے؟

تاجر کہنے لگا: میری ایک ہی بیٹی ہے، میں اس کی شادی تم سے کر دیتا ہوں۔

میں تمہیں اپنا چیف اکاؤنٹنٹ بھی بنانے کے لیے تیار ہوں۔ رہنے کے لیے تمہیں گھر بھی دوں گا اور مال بھی۔ تم اپنی والدہ سے مشورہ کرلو۔

نوجوان نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کی والدہ نے بھی اس رشتے کو سراہا اور اگلے دن اس تاجر نے گواہوں کی موجودگی میں اپنی بیٹی کی شادی اس نوجوان سے کر دی۔

قارئین کرام! یہ ہے تقویٰ اور اس کا انعام ....!

فرشتے مصافحہ کریں!

حضرت حنظلہ اسیدی رضی اللہ عنہ جو کہ رسولِ اکرم ﷺ کے کاتبین میں سے تھے، کہتے ہیں: ایک مرتبہ میری ملاقات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ انھوں نے پوچھا: «كَيْفَ أَنْتَ يَا حَنْظَلَةُ؟». ’’حنظلہ کیسے ہو؟‘‘

میں نے عرض کیا: «نَافَقَ حَنْظَلَةُ» ’’حنظلہ منافق ہوگیا۔‘‘

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: «سُبْحَانَ اللهِ! مَا تَقُولُ؟» ’’سبحان اللہ! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘

میں نے کہا: جب ہم رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ہوتے ہیں، اور آپ ہمیں جنت و جہنم کے بارے میں بتا رہے ہوتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ جنت و جہنم ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہمیں اس کا عین الیقین حاصل ہے، مگر جب ہم رسولِ اکرم ﷺ کی مجلس سے اٹھ جاتے ہیں تو بال بچے اور دنیاوی مشاغل (تجارت وغیرہ) میں اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ اکثر باتیں بھول جاتے ہیں۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! یہی حال میرا بھی ہے۔

پھر میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں گویا ہوا: اے اللہ کے رسول ﷺ! حنظلہ منافق ہوگیا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: «وَمَا ذَاكَ؟» ’’بات کیا ہے؟‘‘

میں نے عرض کیا: ہم آپ کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت و جہنم کے بارے میں بتا رہے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ ہمارے سامنے ہیں۔ مگر جونہی آپ کی مجلس سے اٹھ کر جاتے ہیں، بیوی بچوں اور دیگر مشاغل میں پھنس

جاتے ہیں، نیز جو کچھ آپ بتاتے ہیں، ہم بہت کچھ بھول بھی جاتے ہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! إِنْ لَوْ تَدُومُونَ عَلَى مَا تَكُونُونَ عِنْدِي، وَفِي الذِّكْرِ، لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَائِكَةُ عَلَى فُرُشِكُمْ وَفِي طُرُقِكُمْ، وَلَكِنْ يَا حَنْظَلَةُ، سَاعَةً وَسَاعَةً».

”قسم ہے اس ذات کی! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم لوگ سدا ویسے ہی رہو جیسے میرے پاس رہتے ہو، اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو، تو فرشتے تمہارے بچھونوں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کریں۔ مگر اے حنظلہ! ایک وقت کاروبار کے لیے اور ایک وقت اپنے پروردگار کے لیے۔“

یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی۔(1)

---

(1) مسلم: کتاب التوبۃ، باب فضل دوام الذکر والفکر..... (2750)۔

چرواہے کا تقویٰ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام نافع کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ کے کسی کنارے کی طرف نکلے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے چند ساتھی بھی تھے۔ ساتھیوں نے آپ کے کھانے کے لیے دسترخوان بچھایا۔ اسی دوران وہاں سے ایک چرواہے کا گزر ہوا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے کہا:

«هَلُمَّ يَا رَاعِي – هَلُمَّ، فَأَصِبْ مِنْ هَذِهِ السُّفْرَةِ».

”چرواہے آؤ آؤ! اس دسترخوان سے تم بھی کچھ کھا پی لو۔“

چرواہا بولا:

« إِنِّي صَائِمٌ » ”میں روزے سے ہوں۔“

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا:

«أَتَصُومُ فِي مِثْلِ هَذَا الْيَوْمِ الْحَارِّ شَدِيدٌ سَمُومُهُ، وَأَنْتَ فِي هَذِهِ الْجِبَالِ تَرْعَى هَذَا الْغَنَمَ؟!».

”اس طرح کے سخت گرم دن میں تم روزے کی مشقت برداشت کر رہے ہو جبکہ لُو نہایت تیز ہے جبکہ ان پہاڑوں میں تم بکریاں بھی چرا رہے ہو۔“

چرواہے نے جواب دیا: جی ہاں، میں ان خالی ایام کی تیاری کر رہا ہوں جن میں عمل کرنے کا موقع نہیں ملے گا، اسی لیے دنیوی زندگی میں عمل بجا لا رہا ہوں۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے چرواہے کے تقوے اور خوفِ الٰہی کا امتحان لینے کے ارادے سے اس سے کہا: کیا تم اس ریوڑ میں سے ایک بکری بیچ سکتے ہو، ہم تمہیں اس کی نقد قیمت دیں گے، مزید تمہارے افطار کے لیے گوشت بھی دیں گے؟

چرواہے نے جواب دیا: یہ بکریاں کوئی میری نہیں ہیں جو بیچ دوں بلکہ میرے آقا کی ہیں، اس لیے میں تصرف نہیں کر سکتا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: تمہارا آقا اگر کوئی بکری کم پائے گا اور تم اس سے کہہ دو گے وہ بکری گم ہو گئی ہے تو وہ کچھ نہیں کہے گا، کیونکہ ریوڑ سے ایک دو بکریاں پہاڑوں میں گم ہوتی ہی رہتی ہیں۔

یہ سننا تھا کہ چرواہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس سے چل دیا، وہ اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر یہ جملہ کہے جا رہا تھا:

«أَيْنَ اللّٰهُ؟» ”پھر اللہ کہاں ہے۔ اللہ کہاں ہے؟“

جب چرواہا چلا گیا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس کا یہ جملہ بار بار دہرانے لگے:

«أَيْنَ اللّٰهُ؟» ”اللہ کہاں ہے، اللہ کہاں ہے؟“

جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مدینہ آئے تو چرواہے کے آقا کے پاس انہوں نے اپنے آدمی بھیجے اور اس سے بکریاں اور اس چرواہے کو خرید کر اسے آزاد کر دیا، اور وہ بکریاں اسے ہبہ کر دیں۔ (1)

---

(1) شعب الإيمان، للبيهقي (5291)، أسد الغابة (3082)، مجمع الزوائد (347/9)، المعجم الكبير للطبراني (13054) اس کی سند حسن ہے۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا خط

مسلم علماء کے دستور میں یہ بات شامل تھی کہ وہ کبھی بھی کسی حکمران کا دروازہ اپنی ذاتی غرض کے پیش نظر نہیں کھٹکھٹاتے تھے۔ البتہ حکمرانوں کو آخرت کی یاد دہانی کروانے کے لیے ضرور ان کے دروازوں پر دستک دیا کرتے تھے۔ بصورتِ دیگر ان مظلوم و مقہور اور کمزور لوگوں کی حاجات و ضروریات حکمرانوں کی خدمت میں بلا جھجک پیش کرتے تھے جن کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی تھی۔ بہت سے علماء ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے خود کو گھر اور مسجد کے درمیان محصور کر لیا اور وعظ و نصیحت کا دائرہ عوام الناس تک ہی محدود رہنے دیا، کیونکہ حکمرانوں کی بے راہ روی اور دین سے اُن کی بیزاری نے انھیں قبولِ حق سے کوسوں دور کر دیا تھا، اور اللہ و رسول کی معرفت سے ان کے اذہان و قلوب یکسر خالی تھے۔ جس کے سبب ان کے درباروں میں جہاں ناحق و ناجائز کاموں کا بول بالا ہوتا تھا، معصیت و نافرمانی کے بازار آئے روز گرم ہوا کرتے تھے، وہاں قبولیتِ حق کی بجائے انکارِ حق کا عنصر بدرجۂ اتم موجود تھا۔

انھی علماء میں محدث و فقیہ اور بڑے بزرگ عالم دین امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شمار ہوتا ہے جن کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے:

«لَمْ يَكُنْ أَحَدٌ أَعْلَمَ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مِنْ سُفْيَانَ».

”سفیان ثوری (کے عہد میں) حلال و حرام کے متعلق ان سے زیادہ کسی کو علم نہ تھا“۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ہارون رشید کے زمانۂ حکومت میں تھے۔ جب ہارون

رشید کو زمامِ خلافت ملی اور وہ حکمران بنا تو بہت سے علماء اپنے اہل وعیال کے ساتھ اس کو مبارکباد پیش کرنے کے لیے گئے۔ لیکن امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے خود کو اس سے محفوظ رکھا۔ حالانکہ ہارون اور ان کے درمیان پہلے سے جان پہچان اور ملاقات تھی۔ خلیفہ ہارون رشید نے اپنی مجلس میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو نہ دیکھا تو اس پر بڑا شاق گزرا اور اسے کچھ ناگواری سی محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس نے امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط قلمبند کیا جس کا مضمون کچھ یوں تھا:

"بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

امیر المومنین ہارون رشید کی جانب سے دینی بھائی سفیان ثوری کے نام!

أما بعد:

میرے بھائی! آپ کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو آپس میں بھائی بھائی بنایا ہے۔ اسلام نے اخوت و بھائی چارے کو بہت سراہا ہے، اس لیے میں آپ کو اللہ کے لیے بھائی بناتا ہوں۔ میں اس اخوت و بھائی چارے پر قدغن نہیں لگنے دوں گا اور نہ ہی کبھی آپ کی محبت و الفت کو منقطع کروں گا، میں اپنے دل میں آپ کے لیے افضل ترین گوشہ رکھتا ہوں، مگر مجھے اس بات کا قدرے افسوس ضرور ہے کہ جب مجھے خلعتِ خلافت سے نوازا گیا تو میرے اور آپ کے دینی بھائیوں (علماء) نے میری زیارت کی اور مجھے حکومت سنبھالنے پر مبارکباد دی، جب کہ اس دن میری نگاہ آپ کی دید سے محروم رہی۔ میں نے ان علماء و فضلاء کے لیے عطیات کا دروازہ کھول دیا، اس سے میرے دل کو سکون ملا اور میری آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ میں نے تاخیر سے آپ کی تشریف آوری کی گنجائش رکھی ہوئی ہے جو میرے لیے صدہا خوشیوں کا باعث ہے۔ میں نے اپنی طرف سے

آپ کی خدمت میں یہ خط لکھا ہے تا کہ آپ کو میری محبت اور جذبۂ شوق کا علم ہو جائے۔ ابو عبداللہ! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ایک مسلمان کی اللہ کے لیے زیارت اور اس سے صلہ رحمی کرنے کی کس قدر فضیلت آئی ہے، لہٰذا جب آپ کو میرا یہ خط ملے تو جلد از جلد میری زیارت کرنے کی زحمت گوارا کریں۔“

خط لکھ کر ہارون رشید نے عباد نامی ایک درباری ملازم کے حوالے کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچایا جائے۔

عباد کا بیان ہے کہ میں ہارون رشید کا خط لے کر کوفہ روانہ ہو گیا۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ جب انھوں نے مجھے دیکھا تو فوراً یہ پڑھتے ہوئے کھڑے ہو گئے:

«أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ».

میں گھوڑے سے مسجد کے دروازے پر اترا۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ مجھے دیکھ کر نماز پڑھنے لگے حالاں کہ وہ کسی نماز کا وقت نہیں تھا۔ میں مسجد میں داخل ہوا اور سلام کیا مگر ان کے شاگردوں میں سے کسی نے بھی میری طرف اپنا سر نہیں اٹھایا۔ میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا، کسی نے مجھے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ میرے اوپر ان لوگوں کی طرف سے دہشت سوار ہو گئی، چنانچہ میں نے ہارون رشید کا خط سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف پھینک دیا۔ جب سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے خط دیکھا تو کانپ اٹھے اور اس سے الگ ہٹ گئے، جیسے وہ خط نہیں بلکہ کوئی سانپ ہو جو محراب سے کود پڑا ہو۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے رکوع اور سجدہ مکمل کر کے سلام پھیرا اور آستین کے اندر اپنا ہاتھ داخل کر کے اس خط کو اٹھایا، جبکہ دوسرا ہاتھ ان کے جگر پر تھا، خط کو جلدی سے اپنے پیچھے والے شاگرد کے پاس پھینکا اور فرمایا: ”اس کو کھول کر پڑھو! میں اس بات سے اللہ

تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میرا ہاتھ کسی ایسی چیز کو چھوئے جسے کسی ظالم کا ہاتھ لگا ہو۔"

ایک شاگرد نے خط کھولا، اور اس کا بھی حال یہ تھا کہ وہ خط کھولتے وقت کانپ رہا تھا جیسے خط کے اندر کوئی خطرناک چیز ہو، پھر اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ خط کی تحریر سن کر تعجب خیز لہجہ میں مسکرا رہے تھے۔ جب شاگرد نے پورا خط پڑھ کر سنا دیا تو فرمایا: خط کی پشت پر اس کا جواب لکھو! اتنے میں کسی نے کہا: ابوعبداللہ! یہ خط خلیفہ کا ہے، اس لیے کسی صاف ستھرے کاغذ پر جواب تحریر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

سفیان ثوری نے کہا: نہیں، اس ظالم کے خط کا جواب اسی کے خط کی پشت پر لکھو۔ اگر یہ کاغذ حلال کمائی کا ہوگا تو اس کی جزا پائے گا اور اگر حرام کمائی کا ہوگا تو اسی کے ساتھ وہ جلے گا، نیز ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رہ سکتی جس کو کسی ظالم کے ہاتھ نے چھوا ہو، کیوں کہ اس سے ہمارے دین میں نقص آئے گا۔

پوچھا گیا: ہم اس کے جواب میں کیا لکھیں؟

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں یہ تحریر لکھوائی:

«بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ»

مردہ بندہ سفیان کی طرف سے امید وبیم میں مغرور ہارون رشید کے نام، جو ایمان کی حلاوت اور قرأت قرآن کی لذت سے محروم ہے!

أما بعد:

میں تمہارے خط کا جواب لکھ رہا ہوں کہ میں علی الاعلان تمہاری محبت والفت کی رسی اپنی گردن سے اتار پھینک رہا ہوں اور تمہاری اخوت وبھائی چارگی کا ڈھونگ تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ تم نے جو بلاحق مسلمانوں کے بیت المال میں تصرف کیا ہے

اور دکھلاوے کے لیے اپنی خدمت میں حاضر ہونے والوں کو انعام وعطیہ سے نوازا ہے، یہ سراسر ناجائز ہے جس کے بارے میں تم نے میرے پاس تحریر بھیج کر مجھے اپنے خلاف گواہ بنالیا ہے۔ میں خود کو اور تمہارے خط کے سامعین کو تمہارے خلاف گواہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں، اور کل آخرت میں بھی اللہ کے سامنے تمہارے خلاف گواہی قائم ہوگی۔ جہاں عدل وانصاف کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ اے ہارون! تم نے مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ان کے بیت المال میں ناحق تصرف کیا ہے۔ کیا تمہارے اس فعل سے وہ لوگ راضی ہیں جن کی تالیفِ قلب کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیت المال سے ان کا حصہ مقرر کیا ہے؟ کیا زکوٰۃ یا جزیے کی وصولی پر مقرر کارندے تمہارے اس کام سے خوش ہیں؟ کیا مجاہدینِ اسلام جو اس مال کے زیادہ مستحق ہیں، تمہارے اس تصرف سے راضی ہیں؟ مسافروں کا حق مار کر جو تم نے بیت المال میں بے جا تصرف کیا ہے، کیا یہ راہ کے مسافر تمہارے اس تصرف سے خوش ہیں؟ یا کوئی حامل قرآن یا عالم دین تمہارے اس فعل کو سراہ سکتا ہے؟ تمہارے اس فعل کو یتیموں نے سراہا یا تمہیں اس بات کی بیواؤں نے اجازت دی کہ ان کا حق جہاں چاہو بے دریغ استعمال کرو؟ یا تمہارے اس کام سے تمہاری رعیت خوش ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں!

ہارون! تم نے یہ جو بے جا تصرف کیا ہے تو اب اپنی کمر کس کر تیار ہو جاؤ اور اللہ کے دربار میں اس کا جواب دینے کے لیے تیاری کرلو، اور ہاں، جو بلا آنے والی ہے، اس کی رکاوٹ کا سامان کرلو! یقین جانو کہ ایک ایسی ہستی کے روبرو تمہیں پیش ہونا ہے جو عدل وانصاف کرنے والی ہے، اس کے پاس رتی بھر بھی حیلہ بہانہ نہیں چل سکتا۔ ہارون! جب تم نے علم وزہد، قرأتِ قرآن اور بزرگوں کی مجالس

سے خود کو سبکدوش کر لیا ہے اور اس کے برعکس خود کو ظالم شمار کر کے ظالموں کا سرغنہ بنا لیا ہے، تو پھر تم اللہ کے دربار میں اپنی باز پرس کے لیے اچھی طرح تیاری کر لو، اور اللہ کا خوف کھاؤ۔ ہارون! سریر پر بیٹھ کر حریر کے لباس میں مزے کر رہے ہو اور اپنے دروازے پر پردہ حائل کر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں تم نے اپنے ظالم فوجیوں کو اپنے دروازے کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی متعین کر دیا ہے جو لوگوں پر بے جا ظلم ڈھاتے ہیں، انصاف ان کے اردگرد بھی نہیں پھٹک پاتا۔

شراب نوشی تمہارے فوجیوں کا شیوہ ہے مگر عوام الناس میں سے اگر کوئی شراب پی لے تو اس پر کوڑوں کی بارش کرتے ہیں، خود زنا کاری میں ملوث ہیں مگر رعیت میں سے کوئی یہ کام کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس پر حد جاری کرتے ہیں، خود تو چوری کا بازار گرم کرتے ہیں، اس کی کوئی پوچھ پچھ نہیں، مگر جب رعایا میں سے کوئی چوری کا ارتکاب کر لیتا ہے تو فوراً اس کا ہاتھ کاٹ دیتے ہیں، خود تو قتل وغارت گری کرتے ہیں مگر جب عام آدمی قتل کے مقدمے میں ملوث ہوتا ہے تو اس پر قصاص نافذ کرتے ہیں۔ کیا یہ شرعی قوانین عوام الناس پر نافذ ہونے سے پہلے تم پر نافذ نہیں ہونے چاہئیں؟ کیا تمہارے لیے کوئی خصوصی قانون ہے اور عوام کے لیے کچھ اور؟ یا تم جرائم وفواحش کے ارتکاب سے مستثنیٰ ہو کہ جہاں چاہتے ہو بلا روک ٹوک دندناتے پھرتے ہو اور عوام الناس کو جب چاہتے ہو مجرم ٹھہرا کر سزا دے ڈالتے ہو؟

ہارون! ذرا غور کرو، سوجھ بوجھ سے کام لو، ہوش کے ناخن لو! کل قیامت کے روز جب اللہ عزوجل کی طرف سے اعلان ہوگا کہ ظالموں اور ان کے ساتھیوں کو اکٹھا کرو، تو پھر اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم اللہ کے دربار میں بحیثیت مجرم کھڑے کیے جاؤ گے۔

ہارون! میں سمجھتا ہوں کہ تم نے خود اپنی گردن میں مصیبت ڈال رکھی ہے۔ تم اپنی نیکیاں دوسروں کی میزان میں رکھ رہے ہو اور دوسروں کی بدیاں اپنی میزان میں ڈال رہے ہو۔ گویا کہ برائی پر برائی اور تاریکی پر تاریکی!!

ہارون! رعایا کے بارے میں اللہ کا خوف کھاؤ، اور محمد ﷺ کے فرامین کو آپ کی امت میں جاری رکھو! یقین جانو کہ جس حکومت وسطوت کے نشے میں تم چور ہو وہ کسی دوسرے کی طرف ضرور منتقل ہونے والی ہے، اسی طرح اس دنیا کا بھی حال ہے کہ کبھی کوئی اس کا مالک بن جاتا ہے اور کبھی یہ کسی اور کی لونڈی بن جاتی ہے۔ گویا بیوفاؤں کے جھرمٹ میں تم وفاداری کا راگ الاپ رہے ہو جو موقع ملتے ہی دوسروں کی آغوش کی زینت بنتے نہیں شرماتے! اس عہدے کو بہت سے لوگوں نے عدل وانصاف کے ساتھ سنبھالا اور وہ یقیناً ان کے حق میں نفع بخش ثابت ہوا، لیکن بہت سے لوگوں نے اس کا ناجائز استعمال کیا جس کے سبب ان کی دنیا وآخرت برباد ہوگئی۔ اور ہاں اے ہارون! تم اب مجھے ہرگز ہرگز کوئی خط نہ لکھنا، کیوں کہ میں اب اس کے بعد تمہارے خط کا جواب نہیں دوں گا۔ والسلام۔"

ہارون رشید کے پیغامبر عباد کا بیان ہے کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے خط بغیر تہہ کیے ہوئے اور بلا مہر کے میری طرف پھینک دیا۔ میں نے خط لیا اور کوفہ کے بازار میں آیا۔ اس وقت نصیحت وموعظت سے میرا دل لبریز تھا۔ چنانچہ میں نے بآواز بلند پکارا: کوفہ والو! تم میں سے کون اس آدمی کو خریدے گا جو معصیت وگناہ کے ڈر سے اللہ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا ہے؟

یہ آواز سنتے ہی بہت سارے لوگ درہم ودینار لے کر میری طرف آ گئے۔ میں نے ان سے کہا: مجھے مال وزر کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ مجھے کوئی معمولی سا کرتا

اور قسطوانی چادر دے دو! کیوں کہ میں اسی ضرورت کے لیے آیا ہوں۔ ایک آدمی نے میری خواہش پوری کر دی۔ پھر میں نے اپنے کپڑے اور جوتے وغیرہ اتار دیے اور ہارون رشید کے دروازے پر پیادہ پا حاضر ہوا۔ دروازے پر موجود دربان میرا مذاق اڑانے لگے، پھر مجھے اندر داخل ہونے کی اجازت دی گئی۔ ہارون رشید کی نگاہ جب میری حالتِ زار پر پڑی تو وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور پھر بیٹھ کر اپنا سر اور چہرہ پیٹنے لگا اور کہنے لگا: میرے بھیجے ہوئے پیغامبر نے نفع بخش سودا کر لیا اور میں خائب و خاسر ہوا۔ دنیا کی حکومت وسطوت مجھے کیا کچھ فائدہ دے سکتی ہے؟ یہ تو جلد ہی مجھ سے چھن جانے والی ہے!

پھر میں نے اس کی طرف سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا خط ڈال دیا جیسے انھوں نے دیا تھا۔ ہارون خط پڑھنے لگا، آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے، اور وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس کے ہم نشینوں میں سے کسی نے کہا امیر المومنین! سفیان کی یہ جرأت کہ وہ آپ کی شان میں زبان درازی کرے! آپ کسی کو بھیجیں کہ وہ سفیان کو لوہے کی زنجیر میں جکڑ کر گھسیٹ لائے، اور آپ اسے قید خانے میں ڈال کر بھیانک و عبرتناک سزا دیں جو دوسروں کے لیے قابلِ عبرت ہو۔

جی ہاں، خلفاء اور حکام کو اکثر ایسے ہی کاسہ لیس مشیر دستیاب ہوتے ہیں جو اپنا الو سیدھا کرنے اور اپنی چاپلوسی کی دال گلانے کے لیے انہیں غلط سلط مشورے دے کر خود بھی عذابِ الٰہی کا مستحق بنتے ہیں اور انہیں بھی جہنم کے عمیق گڑھوں میں گرا دیتے ہیں۔ ہر دور میں ایسے شر انگیز لوگوں کی تعداد بکثرت رہی ہے اور اب یہی بیماری چھوٹی بڑی کمپنیوں بلکہ دینی اداروں میں بھی داخل ہو چکی ہے، جس کے باعث وہاں سے عدل وانصاف کا جنازہ اٹھ چکا ہے اور حق کی آواز آخری سانس لے رہی ہے۔ بہت ہی کم

مالکان وذمہ داران ایسے ہیں جو حقیقت پسندانہ اقدام کرنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔

غرض جب ہارون رشید کو اس شر انگیز مشیر نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف مشورہ دیا اور ہارون رشید کے جذبات کو بھڑکانا چاہا تو ہارون رشید نے اس کی بات کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا اور اس کی چاپلوسی کے زہر آلود شربت کی طرف قطعی دھیان نہیں دیا۔ کیوں کہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی نصیحت وموعظت اس کے دل ودماغ کو مسحور کر چکی تھی، چنانچہ وہ گویا ہوا:

«اتْرُكُوا سُفْيَانَ وَشَأْنَهُ يَا عَبِيدَ الدُّنيَا، الْمَغْرُورُ مَنْ غَرَرْتُمُوهُ وَالشَّقِيُّ وَاللهِ! مَنْ جَالَسْتُمُوهُ، إِنَّ سُفْيَانَ أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ».

”دنیا کے غلامو! سفیان کو اس کی حالت پر ہی چھوڑ دو (ان کی شان میں گستاخی آمیز جملے نہ کہو)، دھوکے کا شکار تو درحقیقت وہ ہے جس (کی الٹی سیدھی تعریف کر کے اس) کو تم لوگوں نے تکبر وغرور کا لبادہ پہنا دیا ہے، اللہ کی قسم! درحقیقت شقی وبدبخت تو وہ ہے جس کو تم لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے، سفیان تو اکیلے ہی ایک امت ہیں امت!“

پھر اس کے بعد ہارون رشید کا حال یہ ہو گیا کہ وہ اکثر نماز کے بعد سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا خط پڑھتا اور سسکیاں لے لے کر روتا، یہ سلسلہ اس کی وفات تک جاری رہا۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے دو ٹوک الفاظ پر مشتمل جواب کا یہ فائدہ ہوا کہ خلیفہ ہارون رشید کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا۔ اب اس نے اپنی زندگی کا معمول بنا لیا کہ وہ ایک سال حج کے مبارک سفر پر جائے گا اور دوسرے سال مجاہدین کے ساتھ سرحد پر جہاد کرنے کے لیے نکلے گا۔ چنانچہ وہ اسی اصول پر عمل پیرا رہا، یہاں تک کہ

اس کے دور میں مملکتِ اسلامیہ کا رقبہ اس قدر وسیع ہوگیا کہ سورج اس کی سرحد سے آگے تجاوز نہیں کرتا تھا اور نہ ہی بجلی کی چمک آگے بڑھ پاتی تھی۔ جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے:

«وَأَصْبَحَتِ الدَّولَةُ الْإِسْلَامِيَّةُ فِي عَهْدِهِ لَا تَغِيبُ عَنْهَا الشَّمْسُ وَلَا يَتَخَطَّاهَا الْبَرْقُ».

”ہاں، یہی وہ خلیفہ ہے جس کے عہد میں اسلامی سلطنت کا رقبہ اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ اس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ بجلی کا کوندا اس کی حدوں کو پار نہیں کر سکتا تھا۔“

اس نے ایک مرتبہ بادل کی گڑگڑاہٹ سن کر بغداد میں مسکراتے ہوئے کہا تھا:

«أَيْنَمَا تَذْهَبِي يَأْتِينِي خَرَاجُكِ».

”جہاں بھی جا کر برسو، (تمہارے ذریعے پیدا ہونے والے غلے کا) ٹیکس آخر کار میرے پاس ہی آئے گا۔“

اے اللہ! ہمارے حکام کو بہترین مشیر عطا فرما اور ان کی سوچ وفکر کو اسلامی بنا دے۔ (آمین)

سرداری کے مستحق

اسماء بن خارجہ الفزاری کوفہ کے رہنے والے تھے، یہ بڑے سخی تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ ان کی دور اندیشی اور حکمت و دانائی بڑی معروف تھی۔ ایک مرتبہ وہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے پاس آئے تو خلیفہ نے پوچھا: آپ لوگوں پر کس طرح سرداری کرتے ہیں؟

اسماء بن خارجہ نے فرمایا: یہ سوال آپ نے کسی اور سے کیوں نہیں کیا؟

عبدالملک نے کہا: مجھے آپ کے متعلق چند شریفانہ عادات کا علم ہوا ہے لہٰذا میں آپ سے کچھ نصیحتیں لینا چاہتا ہوں۔

اسماء بن خارجہ نے کہا کہ جب تم نے یہ تہیہ کر ہی لیا ہے تو سنو! جب بھی کوئی مجھ سے کسی حاجت کا سوال کرتا ہے تو میں اپنے اوپر اس کا احسان مانتا ہوں، جب کسی کو کھانے پر مدعو کرتا ہوں تو گویا اس کا بھی میرے اوپر احسان ہوتا ہے، میری خدمت میں جو شخص بیٹھتا ہے اس کا بھی میں احسان مند ہوتا ہوں، جب بھی کوئی آدمی میرے پاس کسی ضرورت کے پیشِ نظر آتا ہے تو میں مقدور بھر اس کی ضرورت پوری کرتا ہوں، میں نے کسی کو کبھی گالی نہیں دی، اگر کسی نے مجھے گالی بھی دی تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا، کیوں کہ گالی دینے والا دو قسم کے آدمیوں میں ہو سکتا ہے: یا تو وہ کریم ہوگا، تو ایسی صورت میں یہ اس کی لغزش ہوگی، چنانچہ میں اس کے ساتھ عفو و درگزر کا زیادہ اہل ہوں اور اگر وہ ایسا نہیں تو کمینہ ہوگا، ایسی صورت میں جواب نہ دینے سے اس سے میری آبرو محفوظ رہے گی۔ جب عبدالملک نے یہ سنا تو بول اُٹھا:

«حَقٌّ لَكَ أَنْ تَكُونَ سَيِّدًا شَرِيفًا»

”یقیناً آپ سرداری و شرافت کے مستحق ہیں۔“

حجاج اور اعرابی کا مکالمہ

سعید بن عروہ کا بیان ہے:

حجاج بن یوسف (1) ایک مرتبہ مکہ مکرمہ جا رہا تھا، راستے میں پڑاؤ ڈالا۔ اس نے اپنے دربان سے کہا: دیکھو، اگر کوئی اعرابی (بدو) نظر آئے تو اسے لاؤ تاکہ وہ میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے۔ حجاج کی یہ عادت تھی کہ جب کھانے پر بیٹھتا تو لازماً کسی دوسرے شخص کو بھی دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھاتا۔

دربان کی نگاہ ایک اعرابی پر پڑی جو دو چادریں لپیٹے ہوئے تھا۔ اس نے اعرابی کو مخاطب کر کے کہا: گورنر کی دعوت قبول کرو۔

جب اعرابی حجاج کے پاس آیا تو حجاج نے کہا: قریب آؤ اور میرے ساتھ کھانا تناول کرو۔

اعرابی: «إِنَّهُ دَعَانِي مَنْ هُوَ أَكْرَمُ مِنْكَ»

”مجھے اس ہستی نے دعوت دے رکھی ہے جو تجھ سے بہتر ہے۔“

حجاج: کون ہے وہ ہستی؟

اعرابی: اللہ عزوجل نے مجھے روزہ رکھنے کی دعوت دی ہے، سو میں روزے سے ہوں۔

---

(1) یہ حجاج بن یوسف بن ابو عقیل بن مسعود بن عامر ثقفی ہے، اس کی پیدائش ۴۱ھ میں ہوئی۔ یہ ہٹا کٹا جوان تھا، فصاحت و بلاغت میں کامل عبور رکھتا تھا، وہ پائے کا شاعر اور قرآن کریم کا حافظ بھی تھا۔ بعض سلف کا کہنا ہے: حجاج ہر رات قرآن کریم کی تلاوت کرتا۔ لیکن بڑا سخت مزاج اور اہل علم کا سخت مخالف تھا۔ اس نے بہت سے علماء کو قتل کر دیا، وہ خون کا پیاسا تھا۔ عبدالملک بن مروان نے عراق پر اسے حاکم مقرر کیا تھا، وہ بہت سرکش انسان تھا۔ اس کی موت کے وقت ہزاروں افراد اس کے قید خانے میں بند تھے۔

حجاج: اس شدید گرمی میں روزہ؟

اعرابی: جی ہاں، میں نے اس دن کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے جو اس سے کئی گنا زیادہ گرم ہوگا۔

حجاج: چلو، آج کھالو، کل روزہ رکھ لینا۔

اعرابی: «عَجِبْتُ لَكَ يَا حَجَّاجُ! أَتَضْمَنُ لِيَ الْبَقَاءَ إِلَى غَدٍ؟»

”تجھ پر تعجب ہے اے حجاج! کیا کل تک میری زندگی کا تو ضامن ہوسکتا ہے؟“

حجاج: یہ تو میرے بس میں نہیں ہے۔

اعرابی: پھر تو کیوں آج کا عمل کل پر ڈالنے کی بات کر رہا ہے جس کا اختیار ہی تیرے پاس نہیں ہے؟

حجاج: بھئی، یہ بڑا ہی لذیذ اور اچھا کھانا ہے۔

اعرابی: نہ تو تُو نے کھانا اچھا بنایا ہے اور نہ ہی یہ باورچی کے ہاتھوں کا کمال ہے؛ بلکہ صحت و عافیت نے اس کی لذت کو دوبالا کیا ہے۔ اگر صحت و عافیت نہ ہو تو پھر کوئی لذیذ سے لذیذ کھانا بھی اچھا نہیں لگتا۔ اے حجاج! میں تجھے اور تیرے کھانے کو چھوڑتا ہوں، تو مجھے میرے رب کے ساتھ چھوڑ دے!

یہ کہہ کر اعرابی چل پڑا اور حجاج کے ساتھ کھانا تناول نہ کیا۔

موسیٰ علیہ السلام کی سرگوشی

موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا: اے پروردگار! تیرا چہرہ کدھر ہے؟ شمال یا جنوب کی جانب؟ تاکہ میں اس طرف منہ کر کے تیری عبادت کروں۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی: اے موسیٰ! آپ آگ جلائیں، پھر اس کے اردگرد چکر لگا کر دیکھیں کہ آگ کا رخ کس جانب ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے آگ روشن کی اور اس کے اردگرد چکر لگایا، دیکھا تو آگ کی روشنی ہر چہار سو یکساں ہے۔

چنانچہ دربارِ الٰہی میں عرض کیا: پروردگار! میں نے آگ کا رخ ہر جانب یکساں ہی دیکھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میری مثال بھی ویسی ہی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: اے پروردگار! تو سوتا ہے یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی نازل فرمائی: اے موسیٰ! پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھ لو، پھر میرے سامنے کھڑے رہو اور نیند کی آغوش میں مت جاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلکی سی اونگھ ڈالی، پیالہ ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور پانی بہہ گیا۔ موسی علیہ السلام کی زبان سے چیخ نکلی اور گھبرا گئے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسی! میں آنکھ کی ایک جھپک بھی سو جاؤں تو یہ آسمان زمین پر دھڑام سے گر پڑے گا جیسے تیرا پیالہ زمین پر گر پڑا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ يُمۡسِكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ أَن تَزُولَاۚ وَلَئِن زَالَتَآ إِنۡ أَمۡسَكَهُمَا مِنۡ أَحَدٖ مِّنۢ بَعۡدِهِۦٓۚ إِنَّهُۥ كَانَ حَلِيمًا غَفُورٗا ﴿٤١﴾﴾

”یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو پھر اللہ کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا، وہ حلیم وغفور ہے۔“ (1)

موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: میرے پروردگار! تو نے مخلوق کی تخلیق کیوں کی جبکہ ان سے تجھے کوئی ضرورت نہیں پڑتی؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے ان کی تخلیق اس لیے فرمائی ہے تاکہ یہ مجھے پہچانیں، مجھ سے اپنی مرادیں مانگیں اور میں ان کی مرادیں پوری کروں، اور میری نافرمانی کے بعد مغفرت و بخشش کی درخواست لے کر میری خدمت میں حاضر ہوں اور میں ان کے لیے مغفرت و بخشش کا پروانہ جاری کروں۔

موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: میرے رب! کیا تو نے کوئی ایسی چیز بھی پیدا کی ہے جو تیری ہی جستجو میں رہتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہاں، مومن بندے کا دل جو میرے لیے خالص ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: یہ کیسے اے پروردگار؟

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: جب مومن بندہ مجھے نہیں بھولتا تو اس کا دل میری یاد سے لبریز رہتا ہے اور میری عظمت اس پر محیط ہوتی ہے اور مجھے جو یاد کرتا ہے میں اس کا ساتھی بن جاتا ہوں۔

---

(1) فاطر:41

پانچ باتوں کا علم

ایک رات امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں ملک الموت کو دیکھا اور ان سے پوچھا: ''اے ملک الموت! میری کتنی عمر باقی رہ گئی ہے؟''

ملک الموت نے اپنی پانچوں انگلیوں سے اشارہ کیا۔

امام مالک نے پوچھا: ان پانچ انگلیوں کے اشارے سے کیا مراد ہے؟ پانچ دن، پانچ ہفتے، پانچ ماہ یا پانچ سال؟

لیکن ملک الموت کا جواب سننے سے قبل ہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھل گئی۔

چنانچہ آپ جلیل القدر عالمِ دین ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے جو خواب کی تعبیر بتانے میں معروف تھے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے بیان کیا: میں نے خواب میں ملک الموت کو دیکھا اور ان سے پوچھا کہ میری کتنی عمر باقی ہے؟ ملک الموت نے میری طرف اپنی پانچوں انگلیوں سے اشارہ کیا اور مجھے اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اس سے مراد پانچ دن ہیں، پانچ ہفتے، پانچ ماہ یا پانچ سال؟

امام ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: اے امام دار الهجرة! ان پانچ چیزوں سے مراد پانچ سال، پانچ ماہ، پانچ ہفتے یا پانچ دن نہیں؛ بلکہ ملک الموت کی مراد یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال ان پانچ غیبی امور سے متعلق ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ عِندَهُۥ عِلۡمُ ٱلسَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ ٱلۡغَيۡثَ وَيَعۡلَمُ مَا فِي ٱلۡأَرۡحَامِۖ وَمَا تَدۡرِي نَفۡسٞ مَّاذَا تَكۡسِبُ غَدٗاۖ وَمَا تَدۡرِي

نَفۡسٌۢ بِأَیِّ أَرۡضٍ تَمُوتُۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِیمٌ خَبِیرٌ (٣٤) ﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے، اسے جانتا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل کیا کچھ کرے گا؟ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا ہے۔“ (1)

---

(1) لقمان :34

خاتمہ بالخیر

ایک مسلمان عیسائیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ وہ پادریوں کی خدمت پر مامور ہوا۔ وہ ان کے لیے خدمات بھی انجام دیتا تھا اور قرآن کریم بھی یاد کرتا تھا۔ جب وہ دونوں پادری اس کی تلاوتِ کلام پاک سنتے تو ان کے دل نرم پڑ جاتے اور زاروقطار رونے لگتے۔ چنانچہ ان دونوں پادریوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن یہ مسلمان نصرانی بن گیا۔ پادریوں نے اس سے کہا: تم اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤ، کیوں کہ اسی میں خیر ہے! لیکن اس بدبخت نے اسلام قبول نہیں کیا اور نصرانیت ہی پر اس کی موت ہوئی۔

ہم سب اللہ تعالیٰ سے حسنِ خاتمہ کی دعا مانگتے ہیں۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: میں نے غلافِ کعبہ سے لٹکے ایک آدمی کو دیکھا جو کہہ رہا تھا: الٰہی! مجھے سلامتی عطا فرمانا، الٰہی! مجھے سلامتی دے!

میں نے پوچھا: بھئی! کیا معاملہ ہے؟

اس نے بتایا: ہم لوگ چار بھائی تھے۔ میرے تین بھائی وفات پا گئے اور تینوں وفات کے وقت آزمائش میں ڈالے گئے۔ صرف میں ہی باقی ہوں، نہ معلوم میرا خاتمہ کس حالت میں ہوتا ہے!

نیت کا پھل

وہ دو بھائی تھے۔ ایک نہایت عبادت گزار اور دوسرا نہایت گناہ گار۔ دونوں ایک ہی گھر میں مقیم تھے۔ عبادت گزار اوپر والی منزل میں مقیم تھا اور وہیں اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا۔ نیچے کم ہی اترتا۔ دوسرا بھائی نیچے والی منزل میں مقیم تھا۔ اس کے پاس سامانِ عیش وعشرت تھا۔ وہ خوب رنگ رلیاں مناتا اور موج اڑاتا۔ اس طرح دونوں کی اپنی اپنی زندگی تھی۔

ایک مرتبہ اس عابد کے نفس نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ زندگی کا بیشتر حصہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں گزرا ہے۔ کیوں نہ خواہشات وشہوات سے بھی کچھ لطف اندوز ہولیا جائے اور پھر توبہ کی درخواست لے کر دربارِ خداوندی میں حاضر ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ تو غفور رحیم ہے ہی معافی کا پروانہ جاری کردے گا۔

چنانچہ عابد نے دل میں پلان بنایا کہ گھر کی نچلی منزل میں اپنے گناہ گار بھائی کے پاس جاتا ہوں، وہاں اس کے ساتھ لذات وخواہشات سے کچھ وقت من کو بہلاؤں گا، لطف اُٹھاؤں گا اور پھر بعد میں عمر کے بقیہ حصے میں اللہ کے دربار میں توبہ کرلوں گا اور معمول کے مطابق اطاعت و بندگی کرتا رہوں گا۔ اس ارادے سے وہ سیڑھی کے ذریعے اُترنے لگا۔

ادھر اس کے گناہ گار بھائی کے دل میں آیا کہ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں بسر کیا ہے جبکہ میرا بھائی بڑا عبادت گزار ہے۔ وہ تو جنت کا مستحق ہے اور میں جہنم میں ڈالا جاؤں گا۔ اللہ کی قسم! میں ضرور اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنے گناہوں سے توبہ کروں گا۔ دوسری منزل پر اپنے عبادت گزار

بھائی کی خدمت میں چلتا ہوں، اس کے ساتھ بقیہ عمر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی میں گزاروں گا، ممکن ہے اللہ تعالیٰ میری مغفرت وبخشش کا سامان کردے۔

چنانچہ یہ گناہ گار اپنی خالص نیک نیتی سے اوپر والی منزل کی طرف چڑھا تاکہ کچھ نیکیاں کما لے۔ اور اُدھر اُوپر سے عابد صاحب دل میں بدنیتی لیے نیچے اُترے تاکہ اپنے دل کو لذات وخواہشات سے بہلا لیں۔ اتفاق کی بات کہ اس عابد کا پاؤں سیڑھیوں سے پھسل گیا اور نچلے بھائی کے اوپر دھڑام سے گرا جو اس سے ملنے کے لیے آرہا تھا، دونوں وہیں ڈھیر ہوگئے۔

پھر عابد کو معصیت کی نیت کے مطابق اُٹھایا گیا اور گنہگار کو توبہ کی نیت کے مطابق اُٹھایا گیا۔

صحیح مسلم میں ہے، رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلَى مَا مَاتَ عَلَيْهِ».

”ہر آدمی اسی نیت کے مطابق اُٹھایا جائے گا جس پر اس کی موت ہوئی۔“(1)

---

(1) مسلم(2878)۔

جہنم رسید ہو گیا

علامہ ابنِ جوزی ایک ثقہ آدمی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اس کے ایک دوست کا بھائی دین سے منحرف تھا۔ باطل اور کفریہ نظریات وعقائد کا پرچار کرتا تھا۔ اس کے دوست نے اپنے گمراہ بھائی کو راہِ راست پر لانے کی بہت جدوجہد کی مگر کوئی بھی نتیجہ نہ نکلا، بلکہ وہ مزید کفر والحاد کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ منحرف کینسر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اور بسترِ مرگ پر پڑ گیا۔

اس کا بھائی اس کی عیادت کو آتا، اس سے باتیں کرتا اور اس کی رشد وہدایت کا خواہاں رہتا، اس کو تبلیغ کرتا کہ شاید اللہ تعالیٰ میرے بھائی کا خاتمہ بالخیر فرمادے!

ایک دن مریض نے اپنے بھائی سے کہا مجھے کلامِ پاک دو۔

بھائی یہ سن کر مارے خوشی کے کھل اُٹھا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے اس کے مریض بھائی کو ہدایت عطا فرما دی ہے، اور وہ اس کی تلاوت کا خواہاں ہے۔

جب وہ قرآنِ کریم لے کر اپنے مریض بھائی کی خدمت میں پہنچا تو اس نے دیکھتے ہی کہا:

یہ قرآن ہے؟

بھائی نے کہا: ہاں۔

اس بد بخت نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ بندہ اس قرآن کا منکر ہے۔

پھر اسی وقت مر گیا۔ والعیاذ باللہ۔

ایک بدبخت

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک نصرانی دائرۂ اسلام میں داخل ہوا اور اس نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھی۔ وہ نبی کریم ﷺ کے لیے وحی وغیرہ لکھا کرتا تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ اسلام سے مرتد ہو کر پھر نصرانی بن گیا۔

وہ کہتا تھا: محمد کو وہی کچھ معلوم ہے جو کچھ میں نے اس کے لیے لکھ چھوڑا ہے۔

اس کی موت ہوئی تو نصرانیوں نے اسے سپردِ خاک کر دیا۔ صبح دیکھا تو وہ زمین سے باہر پڑا تھا۔ نصرانی کہنے لگے: یہ محمد اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے کہ ہمارا آدمی ان لوگوں میں سے بھاگ آیا تو (ان کے جذبات مجروح ہوئے اور) ان لوگوں نے (راتوں رات) آ کر ہمارے آدمی کی قبر کھود کر اسے باہر رکھ دیا۔ پھر ان لوگوں نے گہری قبر کھودی اور اس میں اپنے ساتھی کو دفن کر دیا۔ لیکن صبح کیا دیکھتے ہیں کہ وہ پھر زمین سے باہر ہے۔ انھوں نے پھر وہی بات کہی کہ یہ محمد اور اس کے ساتھیوں کی حرکت ہے۔ کیونکہ جب ہمارا یہ ساتھی ان سے بھاگ آیا تو انہوں نے اس کی قبر کھود کر اس کی لاش پھینک دی۔ چنانچہ اس مرتبہ حسب استطاعت انہوں نے زمین کھود کر اور زیادہ گہری قبر تیار کی اور مردے کو دفن کر دیا، لیکن صبح ہوئی تو دیکھا کہ وہ زمین سے پھر باہر ہے۔ اس مرتبہ انھیں یقین ہو گیا کہ ان کا یہ ساتھی انسان نہیں ہے (یعنی اچھا انسان نہیں بلکہ برا آدمی ہے، اسی لیے اس کی یہ درگت ہو رہی ہے کہ زمین اسے باہر پھینک رہی ہے) چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھی کو یونہی پڑا چھوڑ دیا۔ (1)

---

(1) بخاری: کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الإسلام، (3617)۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

ہمارے درمیان ایک آدمی تھا جس کا تعلق بنونجار سے تھا۔ اس نے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران پڑھی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کا کاتب بھی تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ بھاگ کر اہلِ کتاب سے جا ملا۔ انھوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور بطورِ فخر کہنے لگے: ہمارا یہ ساتھی محمد کے لیے لکھا کرتا تھا، اور وہ اس سے بڑے خوش تھے۔ کچھ دنوں بعد اللہ تعالیٰ نے اس مرتد کو موت دے دی۔ اہلِ کتاب نے قبر کھود کر اپنے ساتھی کو دفن کر دیا۔ صبح کیا دیکھتے ہیں کہ زمین نے مردے کو منہ کے بل باہر پھینک دیا ہے۔ دوبارہ انھوں نے قبر کھود کر اس کی لاش چھپائی لیکن اگلے دن بھی صبح اس کی لاش زمین سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے لاش یونہی پڑی ہوئی چھوڑ دی۔ (1)

---

(1) مسلم (2781)، مسند أحمد (222/3) ۔

ایمان فروش

مسلمان رومیوں کے ساتھ مختلف محاذوں پر برسرپیکار تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلام پوری تیزی سے پھیل رہا تھا۔ مجاہدین کی صفوں میں ایک بدبخت عبدۃ بن عبدالرحیم نام کا شخص بھی شامل تھا۔ اس نے قرآن پاک یاد کر رکھا تھا۔ خوبصورت آواز میں تلاوت بھی کرتا تھا۔

مسلمانوں نے روم کے کسی شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا، شہر فتح نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک عبدہ کی نظر ایک خوبصورت لڑکی پر جا پڑی۔ یہ لڑکی بھی دیگر عورتوں کے ساتھ قلعے میں محصور تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی بھول کر اس لڑکی کے حصول کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔ اس کو پیغام بھیجا تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا کہ ملاقات کی کیا صورت ہے؟ جواب ملا کہ اپنا مذہب چھوڑ دو اور دیوار پر چڑھ آؤ! میں تمہیں اتار لوں گی۔ چنانچہ اس بدبخت نے اپنا ایمان اور دین اس لڑکی کے لیے قربان کر دیا اور دوسرے کیمپ میں چلا گیا۔

مسلمانوں کو اُس وقت اِس سانحے کا پتا چلا جب وہ فرار ہو چکا تھا، اور اس لڑکی کے ساتھ عیش کر رہا تھا۔ ادھر مجاہدین کا کسی طرح اس بدبخت سے دوبارہ رابطہ ہوا، انھوں نے اس کو آواز دی: اوفلاں! تیرے قرآن، تیری تلاوت، تیری نماز، روزے اور جہاد کا کیا بنا؟

اس نے جواب دیا: سنو! میں پورا قرآن بھول گیا ہوں۔ مجھے اس عرصے میں عیش وعشرت اور دولت نصیب ہوئی ہے۔ اب مجھے صرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد ہے:

﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝٢ ذَرْهُمْ

يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ③ ﴾

”وہ بھی وقت ہوگا کہ کافر اپنے مسلمان ہونے کی آرزو کریں گے۔ آپ انھیں کھاتا، نفع اٹھاتا اور جھوٹی امیدوں میں مشغول ہوتا چھوڑ دیجیے، یہ خود جلد ہی جان لیں گے۔“(1)

اس کی وفات ۲۷۸ھ میں ہوئی۔(2)

---

(1) الحجر: 3،2

(2) البداية والنهاية (640/14)۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تقویٰ

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جو ان کی زمین کا محصول (خراج) وصول کرتا تھا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کا وصول کیا ہوا مال کھایا کرتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے کہ اس نے کوئی چیز لا کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں رکھی اور انھوں نے اس میں سے تناول فرما لیا۔

غلام نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: ”أَتَدْرِيْ مَا هٰذَا؟“

”آپ کو خبر ہے کہ یہ کیا ہے جو آپ نے کھایا ہے؟“

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں، کیا ہے؟

غلام نے بتایا:

«كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِإِنْسَانٍ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَمَا أُحْسِنُ الْكِهَانَةَ إِلَّا أَنِّي خَدَعْتُهُ، فَلَقِيَنِي فَأَعْطَانِي بِذٰلِكَ، فَهٰذَا الَّذِي أَكَلْتَ مِنْهُ».

”میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک آدمی کے لیے کہانت کی تھی، حالانکہ کہانت کرنے کا مجھے ڈھنگ نہیں تھا۔ میں نے اسے دھوکا ہی دیا تھا۔ اب جبکہ اس سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے یہ چیز دی جو آپ نے تناول فرمائی ہے۔“

یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ منہ میں داخل کیا اور پیٹ میں جو کچھ تھا، اسے قے کر کے باہر نکال دیا۔(1)

---

(1) بخاری (3842)۔

بہترین سفارش

ایک دن ایک خاتون کسی بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: میرے بیٹے کو محافظ دستے نے پکڑ لیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ پولیس اسٹیشن یہ سفارش بھیج دیں کہ وہاں میرے بیٹے کی پٹائی نہ ہو۔ یہ سن کر وہ صاحب کھڑے ہوئے اور نماز میں لگ گئے اور لمبی نماز پڑھی، اُدھر خاتون یہ دیکھ کر کڑھتی رہی کہ میں نے سفارش کا کہا اور یہ نماز پڑھنے لگے!

جب بزرگ نماز سے فارغ ہوئے تو خاتون گویا ہوئی: میں سفارش کے لیے حاضر ہوئی تھی اور آپ نے سفارش کی بجائے نوافل ادا کرنے شروع کر دیے۔

انھوں نے جواب دیا: بی بی! میں تیری سفارش ہی تو کر رہا تھا۔ میں نے رب العزت کے حضور تیرے بیٹے کی جاں بخشی کی دعا کی ہے اور یہی سب سے بڑی سفارش ہے۔

ابھی یہ بزرگ اپنی جائے نماز سے اُٹھے بھی نہیں تھے کہ ایک دوسری عورت اس خاتون کو آواز دیتے ہوئے آئی اور کہا: بہن! تمہیں مبارک ہو! تیرے لڑکے کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ گھر آ چکا ہے۔ یہ سنتے ہی وہ خاتون فوراً گھر واپس چلی گئی۔

جی ہاں! مشکلات کے اندر، پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نماز سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں! کیا نماز میں اللہ سے تعلق و قربت اور بندے کی سرگوشی نہیں ہوتی ہے؟ سجدہ ہی تو وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنے پروردگار سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

دینی بھائیو! پھر سوچنا کیا ہے، دیر کس بات کی ہے؟ کائنات کا مالک اللہ ہے۔ وہ دعا قبول کرنے والا آقا ہے اور تم اس کی عبادت کرنے والے بندے و غلام۔ پس یہ تمہارا سجدہ ہے اور اوپر سے قبولیتِ دعا کا پروانہ جاری ہونے والا ہے، تو پھر آؤ اور سجدے میں کثرت سے دعائیں مانگو، شاید کہ تمہاری دعائیں رنگ لائیں اور تم اپنے پروردگار کی بخشش و مغفرت کے حق دار بن جاؤ۔ جس بندے کو ضروریات و حاجات نے گھیر لیا ہو، اس کے لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پروردگار سے قضائے حاجات کے لیے گڑگڑا کر سرگوشی کرے تاکہ اللہ اس کی حاجات پوری کرے، کیونکہ تمام امور اسی کے ہاتھ میں ہیں اور مخلوق کے دل بھی اسی کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، جیسے چاہتا ہے الٹتا پلٹتا رہتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

«إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ، كَقَلْبٍ وَاحِدٍ، يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ».

”بنی آدم کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی طرح ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے اسے الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔“

اور اس لیے بھی بندۂ مسلم کو نماز کے ذریعے اپنی تمام تر مشکلات کو حل کروانا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے عملی طور پر اس کی تعلیم دی ہے۔ احادیث اور سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جب بھی کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپ ﷺ نماز ہی کا رخ کرتے حدیث پاک میں آتا ہے:

« كان ﷺ إذا حَزَبَهُ أَمْرٌ صلّى » .

”نبی ﷺ کو جب بھی کوئی مشکل درپیش آتی آپ نماز شروع کر دیتے۔“ (1)

---

(1) (حسن) أبوداود: (1319) مسند أبي عوانة: (6842)، مسند أحمد: (388/5)۔

واثق باللہ کی ذہانت

عباسی خلیفہ واثق باللہ کے دربار میں ایک شخص کھڑا ہوا اور گویا ہوا: امیر المومنین! صلہ رحمی کریں، اپنے رشتہ داروں کے ساتھ احسان کریں، اپنے خاندان کے فرد کے ساتھ حسن سلوک کر مظاہرہ کریں اور اس کی مدد کریں۔

واثق باللہ نے پوچھا: تم کون ہو، میں تمہیں نہیں پہچانتا، نہ ہی میں نے کبھی تمہیں دیکھا ہے؟

وہ بولا: جناب! میں آپ کے دادا آدم علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔

واثق نے اپنے غلام کو بلایا اور حکم دیا کہ اسے ایک درہم عطا کر دو۔

وہ بولا: امیر المومنین! میں اس کا کیا کروں گا؟

واثق باللہ: دیکھو! میں نے تمہیں ایک درہم عطا کیا ہے، اگر میں بیت المال سے اپنے دادا کی تمام اولاد پر خرچ کروں تو پھر تیرے حصے میں گندم کا ایک دانہ بھی نہیں آئے گا۔

وہ شخص بولا: امیر المومنین! اللہ آپ کو خیر و بھلائی میں رکھے، آپ کس قدر ذہین و فطین ہیں۔

واثق باللہ نے اس کو عطیہ دینے کا حکم جاری کیا اور پھر وہ دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔

دور اندیش دشمن

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے امام طبرانی بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا ایک لشکر ان کی سپہ سالاری میں روانہ ہوا اور سب مجاہدین اِسلام اسکندریہ میں خیمہ زن ہوئے۔ اسکندریہ کے بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ اپنے لشکر سے کوئی سمجھدار آدمی بھیجیں جو مجھ سے گفتگو کر سکے۔ میں نے تبادلہ خیال کے لیے خود ہی جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ گفتگو کے بعد بادشاہ نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

”تمہارے پیغمبر کا کہنا بالکل سچ ہے، تمہارے پیغمبر ہی کی طرح ہم لوگوں میں بھی پیغمبروں کی بعثت ہوتی رہی تھی۔ ہم ان کی تعلیمات پر برابر گامزن رہے لیکن آگے چل کر ہمارے درمیان ایسے ایسے بادشاہوں کا ظہور ہوا جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو فرسودہ قرار دے کر نفسانی خواہشات کو بروئے کار لانا اپنا شیوہ اور مقصدِ زندگی بنا لیا۔ نتیجتاً ہم ثریا کی بلندی سے ذلت و رسوائی کے عمیق گڑھے میں جا گرے اور دوسری قومیں ہم پر چڑھ دوڑیں، لہٰذا اگر تم لوگ اپنے پیغمبر (محمد ﷺ) کی روشن تعلیمات کو گلے سے لگائے رکھو گے تو تم سے جنگ مول لینے والا ہر کوئی شکست و ریخت سے دوچار ہوگا اور تم اس پر ہمہ وقت فتح و کامرانی کا پرچم لہراتے رہو گے اور جو کوئی بھی تم سے ٹکرانے کی کوشش کرے گا، اس کا تاج تمہارے جوتوں کی ٹھوکروں کی زینت بنے گا۔ لیکن جب تم بھی اپنے پیغمبر کی تعلیمات کو فراموش کر کے ہماری فہرست میں شامل ہو جاؤ گے اور ہماری ہی طرح اپنی خواہشات کے پجاری بن جاؤ گے تو پھر ہمارے اور تمہارے درمیان راستہ خالی ہو

جائے گا، اور اس وقت تم مسلمان لوگ ہم سے نہ تو تعداد میں زیادہ ہو گے اور نہ ہی قوت وسطوت میں۔“

مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے یہ گفتگو سن کر کہا:

«فَمَا كَلَّمْتُ رَجُلًا أَذْكَرَ مِنْهُ - أَيْ أَدْهَى مِنْهُ -».

”میں نے اس سے بڑھ کر معاملہ فہم وہوشیار آدمی سے کبھی بات نہیں کی۔“ (1)

---

(1) حياة الصحابة (376/5)۔

غصہ میں حلم و بردباری

ایک روز رسولِ اکرم ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ زید بن سَعنہ نامی(1) ایک یہودی عالم آپ ﷺ کی مجلس میں داخل ہوا اور صحابہ کرام کی صفوں کو چیرتا ہوا آپ ﷺ تک پہنچ گیا۔ اس نے رسولِ اکرم ﷺ کا گریبان پکڑ کر بڑی سختی کے ساتھ کھینچا اور درشت لہجے میں کہنے لگا: ”اے محمد! جو قرض تم نے (مجھ سے) لے رکھا ہے ادا کرو، تم بنو ہاشم کے لوگ قرض کی ادائیگی میں بڑی ٹال مٹول سے کام لیتے ہو۔“

رسولِ اکرم ﷺ نے اس یہودی سے چند درہم بطورِ قرض لے رکھے تھے، لیکن ابھی ادائیگی قرض کا وقت باقی تھا۔ یہودی کی یہ گستاخانہ حرکت دیکھ کر حضرت عمر بن خطاب ؓ کھڑے ہو گئے اور اپنی تلوار لہراتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

”اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں اس گستاخ کی گردن اُڑا دوں؟“

رسولِ رحمت ﷺ نے عمر بن خطاب ؓ سے فرمایا:

«مُرْهُ بِحُسْنِ الطَّلَبِ، وَمُرْنِي بِحُسْنِ الأَدَاءِ» .

---

(1) زید بن سَعنہ ایک یہودی عالم تھے، انہوں نے جب رسولِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھا تو تمام علاماتِ نبوت پہچان لیں، البتہ دو اوصاف باقی تھے۔ ایک یہ کہ آپ کی بردباری آپ کے غصہ پر غالب آئے گی۔ دوسرا یہ کہ آپ کے ساتھ جس قدر نادانی کی جائے گی، آپ اتنی ہی زیادہ نرمی و بردباری اختیار کریں گے۔ جب زید بن سَعنہ نے دونوں اوصاف کا مشاہدہ کر لیا تو کلمہ شہادت پڑھ لیا اور سچے مسلمان بن گئے۔ انہوں نے تبوک کے سفر سے واپسی پر مدینہ منورہ کے راستہ میں وفات پائی۔

''عمر! اس (یہودی قرض خواہ) سے کہو کہ وہ بہتر طریقے سے اپنا قرض طلب کرے اور مجھے حسنِ ادائیگی کا حکم دو۔''

یہ سن کر یہودی کہنے لگا:

''اے محمد! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق سے نواز کر مبعوث فرمایا ہے، میں آپ سے اپنا قرض وصول کرنے نہیں بلکہ اس لیے آیا تھا کہ آپ کے اخلاق کا امتحان لوں۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ ابھی ادائیگی قرض کا وقت نہیں آیا ہے لیکن میں نے آپ کے جملہ اوصاف کے متعلق جو کچھ تورات میں پڑھا تھا، ان کو بالکل برحق پایا۔ البتہ دو صفات کا اب تک تجربہ نہیں کیا تھا: ایک یہ کہ آپ غصے کے وقت حلیم و بردبار ہیں اور دوسرا یہ کہ جو کوئی جتنا زیادہ آپ کے ساتھ نادانی کرے گا آپ اتنا ہی زیادہ اس کے ساتھ بردباری و نرمی سے پیش آئیں گے۔ آج میں نے ان صفاتِ حمیدہ کا بھی بچشم خود مشاہدہ کر لیا «فَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّكَ - مُحَمَّدٌ - رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ» .

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور آپ اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں۔''

جہاں تک آپ کے قرض کی بات ہے تو اب میں نے اسے غریب و محتاج مسلمانوں پر صدقہ و خیرات کر دیا۔(1)

---

(1) اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے: أسد الغابة (1841) ، سنن بیہقی (52/6) ، مستدرک حاکم (2/ 32) وغیرہ۔

زندہ شہید

(1)

طلحہ بن عبیداللہ بن عثمان بن عمرو تیمی رضی اللہ عنہ ان 10 خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جن کو نبی کریم ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی خوشخبری عطا فرمادی تھی، اسلام میں آپ سابقین اولین میں سے ہیں اور ان 5 اشخاص میں سے ایک، جنہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت کے نتیجہ میں اسلام قبول کیا۔ آپ 6 اصحاب شوریٰ میں سے ایک ہیں۔

ابوبکر صدیق اور طلحہ رضی اللہ عنہما دونوں کو نوفل بن خویلد نے جو ''شیر قریش'' کے لقب سے ملقب تھا، پکڑا اور لے جا کر ایک ہی رسی سے باندھ دیا۔ نوفل کے دبدبہ کے پیش نظر بنو تیم نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کو قید کے ساتھی کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔ جب نبی ﷺ ہجرت کے سفر میں مدینہ کی طرف رواں تھے تو راستے میں طلحہ بن عبیداللہ شام سے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ آتے ہوئے ملے۔ طلحہ رضی اللہ عنہ نے شام سے درآمد شدہ چادریں نبی ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہنائیں اور بتلایا کہ مدینہ کے لوگ آپ کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ نبی ﷺ نے مدینہ کی جانب اپنی رفتار تیز کر دی اور طلحہ مکہ آ گئے، ضروری کاموں سے فارغ ہو کر کچھ عرصہ بعد یہ بھی ہجرت کر کے نبی کریم ﷺ سے آ ملے۔

طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی تجارت میں اللہ نے بہت برکت دی تھی۔ یہ شام اور عراق سے غلہ اور دیگر اشیاء کی لاکھوں کی خرید و فروخت کرتے۔ اللہ نے ان کو مال کی فراوانی کے ساتھ سخاوت اور جود و کرم کی صفات سے بھی بدرجہ اتم نوازا تھا۔ نبی ﷺ نے آپ کو جواد اور فیاض کے لقب عطا کیے۔ یہ اپنی آمدنی سے حاجت مندوں پر بے پناہ خرچ

---

(1) تفصیل کے لیے دیکھئے طبقات ابن سعد(160/3)، أسد الغابة (84/3) وغیرہ۔

کرتے۔ قبیصہ بن جابر کہتے ہیں میں نے طلحہ بن عبید اللہ ﷜ سے بڑھ کر لوگوں کو بن مانگے عطا کرنے والا کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا۔

ایک بار حضرت طلحہ ﷜ نے قطعہ زمین سات لاکھ (7,00000) درہم میں فروخت کیا۔ رقم لے کر گھر آئے تو کہا: میں یہ رقم لے کر کیسے آرام سے سو جاؤں جبکہ مجھے معلوم نہیں کہ میں صبح تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ اپنے کارندوں سے کہا یہ رقم لے جاؤ اور مدینہ میں جو ضرورت مند نظر آئے اس کی ضرورت پوری کرو، صبح ہونے سے پہلے یہ ساری رقم تقسیم ہو چکی تھی۔

غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ سے ان کی جانثاری، محبت اور اخلاص کے لازوال مناظر چشم فلک نے دیکھے۔ جب نبی ﷺ کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ چکے تھے، چہرہ زخمی تھا اور آپ پر غشی کی کیفیت تھی، طلحہ ﷜ اپنی کمر پر پیغمبر کو اٹھائے ہوئے دشمن کی تلواروں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو ایک محفوظ گھاٹی میں پہنچا دیا۔ اس جنگ میں آپ کو 75 زخم آئے۔ ہاتھ شل ہو گیا، پیشانی زخمی ہو گئی اور ٹانگ کی ایک نس کٹ گئی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«أَوْجَبَ طَلْحَةُ» . ”طلحہ نے اپنے اوپر جنت واجب کر لی۔“(1)

آپ نے اپنی زبان مبارک سے یہ بھی ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَرَادَ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى شَهِيدٍ يَمْشِي على وَجْهِ الأَرْضِ، فَلْيَنْظُرْ إِلَى طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِاللهِ» .

”جو کسی چلتے پھرتے زندہ شہید کو دیکھنا چاہے وہ طلحہ بن عبید اللہ کو دیکھ لے۔“(2)

---

(1) ترمذی (1692)

(2) ترمذی (3739)

شہر کی کنجیاں

ہجرت کے پندرہویں سال حضرت عمر بن خطاب ؓ نے اسلامی لشکر کے قائدین حضرت عمرو بن عاص، شرحبیل بن حسنہ (1) اور ابو عبیدہ ؓ کو مقدس سرزمین فلسطین کے حکمران کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ شہر کی کنجیاں ان قائدین کے سپرد کردے۔ لیکن حکمران پادری جعفرو ینوس نے شہر کی کنجیاں ان کے حوالے کرنے سے انکار کردیا اور کہنے لگا: ہم نے اپنی مذہبی کتاب میں وہ اوصاف پڑھے ہیں جن کا حامل شخص اس شہر کی کنجیوں کا مالک بنے گا، لیکن ہم وہ اوصاف تمہارے اندر نہیں پارہے ہیں اس لیے شہر کی کنجیاں تمہارے حوالے نہیں کی جاسکتیں۔

یہ جواب سن کر عمائدین اسلام نے عمر بن خطاب الفاروق ؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ اے امیر المومنین! آپ خود تشریف لائیں، کیوں کہ سرزمینِ مقدس کے حکمران نے شہر کی کنجیاں ہمارے حوالے کرنے سے انکار کردیا ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا اجازت نامہ ملے بغیر اس سے کسی قسم کی نوک جھونک کریں۔

حالات سے واقفیت کے بعد حضرت عمر بن خطاب ؓ اپنے غلام کے ہمراہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں باری باری کبھی خود سوار ہوتے اور کبھی

---

(1) شرحبیل بن حسنہ ؓ مسلمانوں کے بہادر سپہ سالاروں میں سے ایک تھے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے شام کی فتح میں آپ کو بھیجا اور حضرت عمر ؓ نے شام کے چوتھائی مالِ غنیمت پر آپ کو نگران بنایا۔ آپ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح ؓ دونوں ایک ہی دن طاعون کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ آپ کی وفات طاعونِ عمواس کے سبب ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر سڑسٹھ (٦٧) سال تھی۔

غلام کو سواری کے جانور پر بٹھاتے، اور کبھی دونوں پیدل چلنے لگتے تاکہ سواری کا جانور تھکاوٹ سے آرام پالے۔

دورانِ سفر شام کی سرحد کے قریب پہنچے تو راستے میں دور دور تک کیچڑ تھا۔ ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ اس کیچڑ کو پیدل عبور کرتے۔

امام حاکم، طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ملکِ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تھے جو کیچڑ نما سمندری راہ پر امیر المومنین کے استقبال کے لیے تشریف لائے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنی اونٹنی پر سوار تھے۔ جب یہ کیچڑ نما سمندری راہ حائل ہوئی تو اونٹنی سے اُترے، اپنے جوتے نکال کر کندھے پر رکھے اور اونٹنی کی لگام اپنے ہاتھ میں تھامی، پھر اونٹنی کو پکڑے ہوئے کیچڑ نما سمندری راستے پر خود کو ڈال دیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر عرض کیا: امیر المومنین! کیا آپ یہ کام کر رہے ہیں؟ جوتے کندھے پر، زمامِ سواری ہاتھ میں اور اونٹنی کے ساتھ اس کیچڑ نما زمین میں؟! مجھے اچھا نہیں لگ رہا، کیونکہ ملکِ شام کے باشندگان سے آپ کا سامنا ہونے والا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا:

«أَوَّه! لَمْ يَقُلْ ذَا غَيْرُكَ أَبَا عُبَيْدَةَ إِلَّا جَعَلْتُهُ نَكَالًا لِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ، إِنَّا كُنَّا أَذَلَّ قَوْمٍ فَأَعَزَّنَا اللهُ بِالْإِسْلَامِ، فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّ بِغَيْرِ مَا أَعَزَّنَا اللهُ بِهِ أَذَلَّنَا اللهُ».

”آہ! اے ابوعبیدہ! اگر آپ کے علاوہ کسی اور نے ایسا کہا ہوتا تو میں اسے امتِ محمد ﷺ کے لیے نشانِ عبرت بنا دیتا! ہم ذلیل و خوار لوگ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے

اسلام کے ذریعے ہمیں عزت وشان سے نوازا، اب اگر ہم اسلام کو چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے عزت وشان کے متلاشی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں پھر ذلیل و خوار کر دے گا۔‘‘(1)

پھر حضرت عمر بن خطاب ؓ سواری پر بیٹھے اور تھوڑی دور جا کر اپنی باری ختم ہوتے ہی اُتر گئے اور غلام سوار ہو گیا۔ لشکر اسلامی کے قائدین کی خواہش تھی کہ جب وہ فلسطین کے حکمران کے پاس پہنچیں تو اس وقت سواری کی باری حضرت عمر ؓ کی ہو لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلا اور سفر کے آخری حصے میں سواری کی باری غلام کی آ پڑی، چنانچہ غلام نے سوار ہو کر اور امیر المومنین نے پیدل چل کر آخری منزل طے کی۔

جب یہ مبارک قافلہ مقدس سرزمین فلسطین کے حاکم کے دربار میں جلوہ افروز ہوا تو اس نے حضرت عمر ؓ کے کپڑے بڑے غور سے دیکھے اور نہایت اطمینان سے شہر کی کنجیاں ان کے حوالے کر دیں، پھر حضرت عمر فاروق ؓ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ’’ہاں، تم ہی وہ شخص ہو جس کے اوصاف ہم نے اپنی کتابِ مقدس میں پڑھ رکھے ہیں، ہماری کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ وہ شخص جو مقدس سرزمین فلسطین کی کنجیوں کا مالک ہوگا، اس ملک میں پیدل داخل ہوگا جبکہ اس کا غلام سوار ہوگا اور اس کے کپڑے میں سترہ پیوند لگے ہوئے ہوں گے۔‘‘

حضرت عمر بن خطاب ؓ نے جب کنجیوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تو سجدے میں گر گئے اور کافی دیر تک روتے رہے۔ آپ سے رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا:

---

(1) مستدرک حاکم (62,61/1) اس کی سند صحیح ہے۔

«أَبْكِي لِأَنَّنِي أَخْشَى أَنْ تُفْتَحَ عَلَيكُمُ الدُّنْيَا فَيُنْكِرَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، وَيُنْكِرَكُمْ أَهْلُ السَّمَاءِ عِنْدَ ذَلِكَ».

”میں اس لیے رو رہا ہوں، کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ دنیا تمھارے لیے سرنگوں ہو جائے گی تو تم ایک دوسرے کو اجنبی سمجھنے لگو گے (تمھارے اندر سے اسلامی اخوت ومودت ختم ہو جائے گی) اس وقت آسمان والے بھی تمھیں نظر انداز کر دیں گے۔“

خیر و بھلائی کی خصلتیں

نبی کریم ﷺ نے ایک روز نمازِ ظہر کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا: آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواباً عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! میں روزے سے ہوں۔

نبی کریم ﷺ نے پوچھا: آج تم میں سے کس نے کسی مسکین پر صدقہ وخیرات کیا ہے؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے۔

نبی کریم ﷺ نے پوچھا: آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی بیمار پرسی کی ہے؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے مریض کی بیمار پرسی کی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے پوچھا: آج تم میں سے کسی نے جنازے میں شرکت کی ہے؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! میں نے ایک جنازہ میں شرکت کی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے پوچھا: تم میں کوئی ہے جس نے دو آدمیوں کے مابین صلح کرائی ہو؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! میں نے صلح کرائی ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: جس شخص میں بھی مذکورہ نیک اعمال جمع ہو جائیں گے اس کا انعام سوائے جنت کے کچھ نہیں۔ (1)

نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ متعدد نیک اعمال کا ذکر فرما کر بتلایا کہ ہر شخص کو اس کے عمل کی مناسبت سے جنت کے ایک خاص دروازے سے داخل ہونے کے لیے بلایا جائے گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھ لیا: اے اللہ کے رسول کیا کوئی ایسا خوش نصیب بھی ہوگا جس کو جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہونے کے لئے بلایا جائے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

« نعَمْ وأرجُو أنْ تكُونَ منْهُمْ » . (2)

”ہاں اور مجھے امید ہے اے ابوبکر! کہ تم ایسے ہی خوش نصیبوں میں سے ہو گے۔“

---

(1) صحيح مسلم :(1028)۔

(2) ترمذی (3674)، مسند أحمد(268/2)، صحيح ابن حبان (3419)۔

رسولِ اکرم ﷺ کی حکمتِ عملی

ایک دن رسولِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ اتنے میں ایک نوجوان نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ ! مجھے زنا کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

دربارِ نبوی میں موجود صحابہ کرام نے جب نوجوان کی گفتگو سنی تو سخت ناراض ہوئے، غصے سے ان کی رگوں میں خون تیز ہوگیا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو خاموش رہنے کا حکم دیا اور خود نوجوان کو اپنے قریب کیا اور اس سے فرمایا: ”بتاؤ! تم کیا چاہتے ہو؟“

نوجوان کہتا ہے: یارسول اللہ ﷺ ! مجھے زنا کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

رسول اللہ ﷺ : نوجوان! جس کام کی اجازت تو مانگ رہا ہے کیا تو چاہے گا کہ تیری ماں کے ساتھ یہی کام کیا جائے؟

نوجوان: قربان جاؤں، اے اللہ کے رسول ﷺ ہرگز نہیں!

رسول اللہ ﷺ : لوگ بھی اپنی ماؤں کے ساتھ یہ کام نہیں چاہتے۔ کیا تو پسند کرے گا کہ تیری بیٹی کے ساتھ یہ کام ہو؟

نوجوان: نہیں اللہ کے رسول، اللہ کی قسم میں ایسا نہیں چاہتا میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔

رسول اللہ ﷺ : لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لیے یہ کام نہیں چاہتے۔ کیا تو اپنی بہن کے ساتھ اس کام سے راضی ہے؟ اسی طرح آپ نے پھوپھی اور خالہ کا بھی نام لیا۔ نوجوان ہر ایک کے جواب میں کہتا رہا: ”قربان جاؤں، ہرگز نہیں!“

پھر نبی کریم ﷺ نے نوجوان کو سمجھایا کہ بالکل اسی طرح کوئی بھی آدمی اسے گوارا نہیں کرے گا کیوں کہ جب کسی بھی عورت سے زنا کا ارتکاب کیا جائے گا تو وہ کسی کی ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی یا خالہ ہی ہوگی۔

اس کے بعد رسولِ اکرم ﷺ نے نوجوان کے سینے پر ہاتھ رکھا اور اس کے لیے تین دعائیں فرمائیں:

«اللَّهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهُ، وَطَهِّرْ قَلْبَهُ، وَحَصِّنْ فَرْجَهُ».

’’الٰہی! اس کی مغفرت فرمادے، اس کا دل پاک کردے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما!‘‘

راوی کا بیان ہے:

«فَلَمْ يَكُنْ - بَعْدَ ذَلِكَ- الْفَتَى يَلْتَفِتُ إِلَى شَيْءٍ».

’’اس کے بعد نوجوان کسی برائی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہ تھا۔‘‘ (1)

---

(1) مسند أحمد (256/5)، مجمع الزوائد، للهيثمي (129/1)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت

امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ ایک روز مسجد کے اندر تشریف فرما تھے۔ اتنے میں خوارج کا ایک گروہ تلواریں لہراتا ہوا داخل ہوا اور امام صاحب کو گھیر لیا۔ پھر ان کے درمیان مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی:

خوارج: ابوحنیفہ! ہم آپ سے دو سوال کریں گے اگر آپ نے جواب دے دیے تو ٹھیک، ورنہ ہم آپ کو قتل کر دیں گے!

امام ابوحنیفہ: اپنی تلواریں میان کے اندر رکھ لو، کیونکہ ان کی طرف دیکھنے سے میرا دل اُدھر ہی مشغول ہو جائے گا۔

خوارج: ہم اپنی تلواروں کو ہرگز میان میں نہیں رکھیں گے، یہ تو آپ کے خون کی پیاسی ہیں۔

امام ابوحنیفہ: چلو، پوچھو۔

خوارج: دروازے پر دو جنازے رکھے ہیں۔ ایک جنازہ اس شخص کا ہے جس نے شراب پی کر آنکھیں بند کیں اور نشے ہی میں مر گیا۔ دوسرا جنازہ اس عورت کا ہے جو زنا کے ذریعے حاملہ ہوئی اور زچگی کے وقت توبہ کیے بغیر مر گئی۔ کیا یہ دونوں مومن ہیں یا کافر؟

خوارج کا یہ گروہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سوال پوچھنے آیا تھا، ان کے عقیدے کے مطابق گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر امام ابوحنیفہ ان دونوں کے مومن اور مسلمان ہونے کا فتویٰ دیتے تو ان کے نزدیک قابلِ گردن زدنی ہوتے۔ چنانچہ امام صاحب نے ان سے پوچھا کہ یہ بتاؤ: یہ

دونوں کس مذہب کے ماننے والے تھے، کیا یہ یہودی تھے؟

خوارج: نہیں۔

امام ابوحنیفہ: نصاریٰ تھے؟

خوارج: نہیں۔

امام ابوحنیفہ: مجوسی تھے؟

خوارج: نہیں۔

امام ابوحنیفہ: بت پرست تھے؟

خوارج: نہیں۔

امام ابوحنیفہ: آخر کس مذہب کے پجاری تھے؟

خوارج: مسلمان تھے۔

امام ابوحنیفہ: تم لوگوں نے خود ہی جواب دے دیا، تمہارا اعتراف ہے کہ دونوں (شرابی اور زانیہ) مسلمان تھے اور جو مسلمان ہوا اسے تم کافر کیسے کہہ سکتے ہو؟

خوارج کا گروہ: یہ دونوں جنتی ہیں یا جہنمی؟

ابوحنیفہ: میں بھی ان دونوں کے بارے میں وہی کچھ کہوں گا جو خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے اس آدمی کے بارے میں کہا تھا جس کی برائی ان دونوں سے بڑھ کر تھی:

﴿فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝٣٦﴾

"میری تابعداری کرنے والا میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بہت ہی معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔"(1)

---

(1) إبراہيم: 36

نیز میں وہ کچھ کہوں گا جو روح اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں سے بڑے گنہگاروں کے بارے میں کہا تھا:

﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾﴾

‘‘اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تُو ان کو معاف فرما دے تو تُو زبردست ہے حکمت والا ہے۔’’(1)

یہ سننے کے بعد خوارج کی تلواریں میانوں میں واپس چلی گئیں اور وہ امام صاحب کو کوئی ایذا پہنچائے بغیر رخصت ہو گئے۔

---

(1) المائدہ: 118

خوددار عالم

ہارون رشید (1) نے جب مسجدِ نبوی کی زیارت کی نیت سے مدینہ منورہ کا سفر کیا تو اس کی نگاہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (2) پر پڑی جو مسندِ تدریس پر جلوہ افروز تھے۔

وہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: امام مالک! میری خواہش ہے کہ میں بھی علم حاصل کروں، کیا آپ کے لیے ممکن ہے کہ میرے گھر تشریف لائیں اور ہمیں علم سکھائیں۔

امام مالک «يَا هَارُونُ، إِنَّ الْعِلْمَ لَا يَأْتِي وَلَكِنَّهُ يُؤْتَى إِلَيهِ»: ''اے ہارون! علم کسی کے پاس خود چل کر نہیں جاتا بلکہ علم کے خوگر خود ہی اپنی تشنگی بجھانے

---

(1) یہ ہارون بن رشید بن مہدی محمد منصور ابو جعفر ہیں۔ ان کا شجرۂ نسب عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما سے ملتا ہے۔ آپ کی والدہ خیزران تھیں۔ آپ کی ولادت ماہ شوال ۱۴۸ھ میں ہوئی، آپ کی شادی آپ کے چچا ابو جعفر کی صاحبزادی ام جعفر زبیدہ سے ہوئی جس کے بطن سے امین کی ولادت ہوئی۔ ہارون رشید کی وفات جمادی الثانی ۱۹۳ھ میں ہوئی۔

(2) امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں۔ آپ کی ولادت مدینہ منورہ میں ۹۳ھ میں ہوئی جہاں آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے آثار دیکھے اور تابعین سے علم حدیث حاصل کیا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی پرورش و پرداخت ایک علمی خانوادے میں ہوئی جہاں اثر وحدیث اور اخبارِ صحابہ سے متعلق علم موجود تھا۔ آپ کے دادا مالک بن ابی عامر کبار تابعین اور بلند پایہ علماء میں سے تھے۔ جب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ و آثار میں اپنی تعلیم مکمل کی تو مسجدِ نبوی میں درس و افتاء کا سلسلہ شروع کیا۔ مسجد نبوی میں آپ کی مسند کی جگہ بھی وہی تھی جہاں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مشورہ اور حکم و قضا کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ امام مالک کی وفات نوے (۹۰) سال کی عمر میں ۱۷۹ھ میں مدینہ منورہ ہی میں ہوئی۔

کے لیے چشمہ ہائے علم کی طرف لپکتے ہیں۔''

ہارون رشید: سچ فرمایا آپ نے اے امام دار الھجرۃ! میں عنقریب مسجد نبوی کے اندر آپ کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کروں گا۔

امام مالک: ہارون رشید! اگر آپ کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی تو پھر مسجد کے اندر موجود طالبانِ علومِ نبوت کی گردنیں پھلانگ کر آگے بیٹھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ہارون رشید: امام صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔

امام مالک اگلے دن نمازِ عصر کے بعد درس دے رہے تھے کہ آپ کی نگاہ ہارون رشید پر پڑی جو مسجد کے اندر موجود کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ کے کلام کا انداز بدل گیا اور فرمایا: رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ، وَمَنْ تَكَبَّرَ قَصَمَهُ اللّٰهُ»(1)

''جو اللہ کے لیے تواضع و انکساری اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندی و رفعت عطا کرتے ہیں اور جو تکبر اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے تباہ کر دیتے ہیں۔''

ہارون رشید اشارہ سمجھ گیا اور کرسی ہٹانے کا حکم دیا، پھر زمین پر دوسرے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اس کے بعد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی پیشانی کو بوسہ دے کر چار سو دینار کا تحفہ پیش کیا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: امیر المومنین! میری معذرت قبول کریں، میں صدقے کا مستحق نہیں ہوں اور نہ ہی ہدیہ قبول کرتا ہوں۔

---

(1) مجمع الزوائد (82/8).

ہارون رشید: آخر ہدیہ قبول کرنے میں حرج کیا ہے؟ جبکہ نبی کریم ﷺ نے ہدیہ قبول فرمایا ہے۔

امام مالک: میں کوئی نبی نہیں ہوں۔

چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے وہ دینار نہایت احترام کے ساتھ خلیفہ کو واپس کر دیے۔ (واضح رہے کہ شریعت میں ہدیہ قبول کرنا درست ہے۔ مگر اہل علم وتقویٰ حکام کے تحائف سے ہمیشہ اس لیے دامن کشاں رہے ہیں کہ ان کا مال عام طور پر ظلم کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ نیز یہ کلمہ حق کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتا ہے)۔

اب ہارون رشید اس بات پر بضد ہوا کہ امام صاحب بغداد کا دورہ کریں، جو ان دنوں خلافت عباسیہ کا دارالخلافہ تھا اور علمی مرکز بھی تھا۔ مگر امام صاحب نے اس کی دعوت کو بھی یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ

«وَاللهِ! لَا أَرْضَى بِجِوَارِ رَسُولِ اللهِ ﷺ بَدِيلًا».

’’اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ﷺ کی ہمسائیگی کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ کی زیارت نہیں کرسکتا۔‘‘

بدعت ایک گڑھا

ابو البختری کا بیان ہے: ایک آدمی نے عبداللہ بن مسعود ؓ کو بتایا کہ چند لوگ بعد نمازِ مغرب مسجد میں بیٹھتے ہیں اور ان میں سے ایک آدمی باآواز بلند کہتا ہے: اتنی اتنی بار اللہ اکبر کہو!

عبداللہ بن مسعود ؓ نے پوچھا: کیا یہ لوگ ایسا کہتے ہیں؟

اس آدمی نے جواب دیا: ہاں۔

عبداللہ بن مسعود ؓ نے فرمایا: اگر اس کے بعد ان لوگوں کو ایسا کرتے ہوئے دیکھو تو مجھے آ کر ان کے بارے میں مطلع کرو۔

اس آدمی نے آ کر خبر دی تو حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ اس مجلس میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ کے سر پر لمبی ٹوپی (برنس) تھی۔ آپ بھی مجلس کی زینت بن گئے۔ جب آپ نے مجلس میں موجود لوگوں کی باتیں سماعت کیں تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا:

میں عبداللہ بن مسعود ہوں، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں! یقیناً تم لوگوں نے ایک قبیح بدعت ایجاد کی ہے۔ کیا تم لوگ محمد ﷺ کے صحابہ سے بھی زیادہ علم والے ہو گئے؟

مجلس میں سے معتضد نامی ایک شخص نے جواب دیا: اللہ کی قسم! ہم نے کوئی قبیح بدعت ایجاد نہیں کی اور نہ ہی محمد ﷺ کے صحابہ کے علم سے بڑھ کر ہمارے پاس علم ہے۔

عمرو بن عتبہ نے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! ہم تو صرف اللہ تعالیٰ سے

استغفار کرتے ہیں۔

عبداللہ بن مسعود ؓ نے فرمایا: تم لوگ سیدھی راہ کو لازم پکڑو! رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے طریقہ سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ مت اختیار کرو! اللہ کی قسم! اگر تم ایسا کرو گے جیسا کہ کر رہے ہو تو شریعتِ محمدی سے کوسوں دور نکل جاؤ گے، اور اگر تم نے سیدھی راہ سے منحرف ہو کر دائیں بائیں کا رخ کیا تو پھر ضلالت و گمراہی کے عمیق گڑھے میں جا گرو گے۔

سردار ایسا ہوتا ہے

ایک مرتبہ مہلب بن ابی صفرہ کا گزر قبیلۂ ہمدان کے ایک محلے سے ہوا۔ یہ بڑے مخیّر اور رئیس تھے۔ محلے کے ایک نوجوان نے انھیں دیکھ کر پوچھا: یہی مہلب ہے؟

لوگوں نے بتایا: ہاں

نوجوان بولا: اللہ کی قسم! ان کی قیمت تو پانچ سو درہم کے برابر بھی نہیں۔

مہلب نابینا تھے انھوں نے اس نوجوان کی بات سن لی۔ جب رات ہوئی تو مہلب نے اپنی آستین میں پانچ سو درہم رکھے اور اس محلے میں آ کر نوجوان کو تلاش کرنے لگے۔ معلوم ہونے پر وہ نوجوان کے گھر آئے اور کمرہ کھولنے کو کہا۔ نوجوان نے دروازہ کھولا تو مہلب ان کے آگے پانچ سو درہم ڈالتے ہوئے گویا ہوئے: مہلب کی قیمت پکڑو، اللہ کی قسم! اے میرے بھتیجے! اگر تو مجھے پانچ ہزار دینار کے مساوی قرار دیتا تو میں پانچ ہزار دینار بھی تیری خدمت میں لا کر رکھ دیتا۔

یہ گفتگو محلے کے ایک بزرگ نے سن لی اور بول اُٹھا:

«وَاللهِ مَا أَخْطَأَ مَنْ جَعَلَكَ سَيِّدًا» .

”اللہ کی قسم! تجھے سردار بنانے والے نے خطا نہیں کی ہے۔“

ذہین بچہ

ایک مرتبہ والیٔ حجاز کو راستے میں ایک بچہ ملا۔ اس کا نام اشعب تھا، والی نے بچے سے پوچھا: بچے! کیا تجھے قرأت آتی ہے؟

بچے نے جواب دیا: ہاں۔

والیٔ حجاز نے کہا: کچھ پڑھو!

بچے نے پڑھنا شروع کیا:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ①﴾

"اے نبی! ہم نے آپ کو کھلی فتح عطا کر دی۔"(1)

امیر کو بچے کی اس موقع پر یہ تلاوت بہت اچھی لگی۔ چنانچہ اس نے بچے کو ایک دینار دیا۔

بچے نے دینار قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

امیر نے دینار قبول نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو بچے نے جواب دیا: مجھے خوف ہے کہ میرے والد مجھے ماریں گے۔

امیر نے کہا: اپنے والد سے کہہ دینا کہ یہ دینار گورنر نے دیا ہے۔

بچے نے جواب دیا: میرے والد میری بات کو تسلیم نہیں کریں گے۔

امیر نے پوچھا: وہ کیوں؟

بچہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا: کیوں کہ ایک دینار بادشاہوں کا عطیہ نہیں ہوسکتا۔ امیر یہ سن کر ہنس پڑا اور اسے ایک سو دینار عطیہ میں دینے کا حکم دیا۔

---

(1) الفتح:1

حکمران اور رعایا

حجاج کے زمانے میں جب لوگ صبح کو بیدار ہوتے اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی تو باہم پوچھتے: گزشتہ رات کون قتل کیا گیا، کس کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا گیا اور کس کی پیٹھ کوڑوں کی بوچھاڑ سے چھلنی ہوئی؟

ولید بن عبدالملک کثیر مال و جائیداد والا اور عمارتیں بنانے کا شوقین تھا۔ چنانچہ اس کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے مکانات کی تعمیرات، نہروں کی کھدائی اور درختوں کی افزائش کے متعلق پوچھا کرتے تھے۔

جب سلیمان بن عبدالملک نے حکومت کی کرسی سنبھالی تو وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا شوقین تھا۔ چنانچہ لوگ اچھے کھانوں، گانے والیوں اور لونڈیوں کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھتے اور یہی ان کا موضوعِ سخن بھی ہوتا۔

اور جب عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ منصبِ خلافت کی زینت بنے تو لوگوں کی آپس میں اس قسم کی گفتگو ہوتی: قرآن کتنا یاد کیا، ہر رات کتنا ورد کرتے ہو، رات کو کتنے نوافل پڑھتے ہو، فلاں آدمی نے کتنا قرآن یاد کیا، اور فلاں شخص مہینے میں کتنے دن روزے سے رہتا ہے؟

کسی نے سچ کہا ہے:

«النَّاسُ عَلَى دِينِ مُلُوكِهِمْ» .

”لوگ بالعموم اپنے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔“

کون کیا ہے؟

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَرْحَمُ أُمَّتِي بِأُمَّتِي أَبُوبَكرٍ، وَأَشَدُّهُمْ فِي أَمْرِ اللهِ عُمَرُ، وَ أَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثْمَانُ، وَأَقْضَاهُمْ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ وَأَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللهِ أُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ، وَأَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، وَأَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ، وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَمِينٌ، وَأَمِينُ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ».

”میرے امتیوں کے ساتھ امت میں سب سے زیادہ مہربان ابوبکر ہیں، اللہ کے دین میں سب سے زیادہ سخت عمر ہیں، عثمان حیا کے سب سے سچے پیکر ہیں اور سب سے اچھا فیصلہ دینے والے علی بن ابی طالب ہیں، قرآن کو سب سے زیادہ اور اچھا پڑھنے والے ابی بن کعب ہیں، علم وراثت کے سب سے زیادہ عالم زید بن ثابت ہیں، حلال وحرام کا سب سے زیادہ علم معاذ بن جبل کو ہے، اور ہر امت میں کوئی نہ کوئی امین ہوا کرتا تھا۔ میری امت کے امین ابوعبیدہ بن جراح ہیں۔“ (1)

---

(1) [صحيح] ابن ماجه (154)، صحيح الجامع الصغير (895) الصحيحة (1224)

یہ روایت مسند احمد، ترمذی، نسائی اور بیہقی وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

قبولیت دعا

عبدالرحمٰن بن زیاد بن انعم محدث تھے۔ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سمندر میں سفر کر رہے تھے کہ رومی بحری قزاقوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور قسطنطنیہ لے گئے۔ بے گناہ لوگوں کو اعلیٰ حکام کے آرڈر پر جیل میں ڈال دیا گیا۔ کچھ عرصہ قید میں پڑے رہے کہ اسی دوران عیسائیوں کی عید آ گئی۔ انہوں نے قیدیوں کو عید کے دن بہتر سے بہتر کھانا کھلایا اور ٹھنڈے اور گرم سے تواضع کی۔ کھانا عام دنوں کے مقابلہ میں کافی زیادہ تھا۔ مسلمان قیدی اس سے خوش ہو گئے۔ اس اچھے سلوک کی خبر ایک عیسائی عورت کو ہوئی تو وہ تلملا اٹھی۔ فوراً بادشاہ کے پاس اس حال میں پہنچی کہ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ رکھے تھے۔ اپنے بالوں کو منڈوایا' چہرے کو سیاہ کیا ہوا اور بادشاہ سے کہنے لگی:

ان عربوں نے میرے بھائی' خاوند اور بیٹے کو قتل کیا ہے اور ان کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کہ جیل میں ان کی ضیافتیں ہو رہی ہیں؟!۔

بادشاہ نے جب اس کی باتیں سنیں تو غصہ میں آ گیا۔ مسلمانوں کے خلاف تو پہلے ہی تھا اس عورت کی باتوں نے اسے اور بھڑکا دیا۔ حکم دیا کہ تمام قیدیوں کو میرے حضور پیش کیا جائے۔

تھوڑی دیر کے بعد تمام قیدی بادشاہ کے سامنے لائے گئے۔ اس نے جلاد کو حکم دیا کہ ایک ایک کر کے تمام کی گردنیں مار دی جائیں۔ چنانچہ جلاد نے مسلمان قیدیوں کی گردنیں اڑانا شروع کی۔ جب عبدالرحمٰن بن زیاد کی باری آئی تو ان کے ہونٹ ہلنا شروع ہوئے۔ انہوں نے اپنے رب کو پکارنا شروع کیا۔ دعا شروع

ہوئی اور زبان سے نکلا:

«اللهُ . . . اللهُ رَبِّي لَا أُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا»

”اللہ ہی میرا رب ہے، میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔“

بادشاہ نے جب ان کا ہونٹ ہلتے دیکھا تو پوچھا تمہارے ہونٹوں سے کیا کلمات نکل رہے تھے۔ جب اسے بتایا گیا تو وہ ان کلمات سے نہایت متاثر ہوا اور حکم دیا: اس عالم دین کو اور اس کے جتنے ساتھی باقی ہیں سب کو رہا کر دو۔

ذہانت

یہ اس وقت کی بات ہے جب جہالت کے ساتھ ساتھ دشمنیاں عام تھیں۔ شعر وشاعری تو عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ ایک شاعر سفر کے دوران اپنے دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے جان چھڑانے کی پوری کوشش کی۔ مگر وہ مکمل طور پر دشمن کے قابو میں تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ دشمن اسے معاف کرنے والا نہیں۔ اس نے اپنے دشمن سے کہا: مجھے معلوم ہے تم مجھے قتل کر دو گے، لیکن دشمنی کے باوجود میرا ایک حق تم پر ہے۔ میں تم سے وعدہ لینا چاہتا ہوں۔ دشمن نے کہا: بتاؤ! ہم اپنے وعدہ کو پورا کریں گے۔ اس نے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ میرے پاس صرف دو بیٹیاں ہی ہیں۔ میرے قتل کے بعد ان کے پاس جانا اوران کو میرا یہ پیغام دے دینا۔

«أَلَا أَيَّتُهَا الْبِنْتَانِ إِنَّ أَبَاكُمَا . . . »

جانی دشمن نے کہا: ٹھیک ہے تمہاری یہ مراد پوری کر دوں گا۔ پھر اس نے شاعر کو قتل کر دیا۔ قتل کے بعد وہ مقتول کے گھر آیا اور دروازے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اس کی بیٹیوں کو آواز دی اور کہا کہ تمہارا باپ مجھے ملا تھا۔ اس نے مجھے پیغام دیا تھا۔ بیٹیاں کہنے لگیں: کیا؟ اس نے ان کے باپ کا جملہ دہرا دیا۔

«أَلَا أَيَّتُهَا الْبِنْتَانِ إِنَّ أَبَاكُمَا . . . ».

”آگاہ ہو جاؤ، اے دونوں لڑکیو! بے شک تمہارا باپ..........“

مقتول کی لڑکیاں شعر وشاعری سے مکمل دلچسپی رکھتی تھیں۔ جب انھوں نے اپنے والد کا پیغام سنا تو ایک دوسرے کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ گویا کوئی فیصلہ کر رہی ہوں، اور پھر اس قاتل کو کہا: ذرا ٹھہریں۔ اتنے میں اپنے قبیلے کے نوجوان کو بلوا

لائیں اور کہا کہ یہ ہمارے والد کا قاتل ہے اس کو قابو کر لیں۔ قاتل نے بڑا واویلا کیا کہ تمہارے پاس ثبوت کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہمارے والد نے شعر کا ایک مصرع کہا ہے اور وہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک یہ نہ کہا جائے۔

«قَتِيلٌ خُذَا الثَّأرَ مِمَّنْ أَتَاكُمَا».

”یہ قاتل ہے، جو تمہارے پاس آیا ہے اس سے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لے لو!“

اور پھر مقتول کا بدلہ لے لیا گیا۔

مومن کی شان

علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک لڑکا فوت ہو گیا۔ علی بن حسین بیٹے کی موت پر غمزدہ ہوئے اور نہ ہی جزع فزع کیا۔

ایک آدمی نے علی بن حسین سے کہا:

”اے علی! آپ کا صاحبزادہ، جگر کا ٹکڑا، دنیا میں آپ کا وارث اور آپ کا مضبوط ہاتھ آپ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا گیا اور آپ ہیں کہ اس حادثہ پر نہ تو جزع فزع کیا اور نہ ہی آپ پر اس کا کوئی خاص اثر ہوا؟“

علی بن حسین نے جواب دیا:

”ہاں، یہ ایسا حادثہ ہے جس کو ہم یقینی سمجھتے تھے، اب اگر وہ واقع ہو گیا تو ہمیں اظہارِ افسوس کرنے کی کیا ضرورت! اللہ کی قضا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا ہی مومن کی شان ہے۔“

جان سے بڑھ کر محبوب

حضرت عبداللہ بن ہشام کہتے ہیں: ہم نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ ﷺ حضرت عمر بن خطاب ؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے عرض کیا: «يَا رَسُولَ اللهِ! لَأَنْتَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ إِلَّا نَفْسِي» ''اے اللہ کے رسول! آپ میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ مجھے محبوب ہیں۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ» ''نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہاں تک کہ میں تیرے نزدیک تیری جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں۔''

حضرت عمر ؓ نے عرض کیا: اب اے اللہ کے رسول! آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «الْآنَ يَا عُمَرُ» ''اب (تمہارا ایمان مکمل ہوا) اے عمر''۔(1)

گویا رسول اکرم ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر چیز سے بڑھ کر آپ ﷺ سے محبت کرے، ورنہ وہ کامل مومن نہیں ہو سکتا۔ حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ» ''تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس کو محبوب نہ ہو جاؤں''۔(2)

---

(1) بخاری: كتاب الأيمان والنذور، باب كيف كانت يمين النبي ﷺ (6632)۔

(2) بخاری: كتاب الإيمان، باب حبّ الرسول ﷺ من الإيمان (15)، مسلم (44)۔

اور لوگوں کی جان چھوٹ گئی

ایک حکمران کو معلوم ہوا کہ کچھ ڈاکوؤں نے راستے میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ان کی رہائش پہاڑوں کی بلندی پر ہے، دن رات راہ گیروں اور قافلوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور جا کر اونچے اونچے پہاڑوں پر پناہ گزین ہو جاتے ہیں، کوئی ان پر قابو پانے کی قدرت نہیں رکھتا۔

حکمران نے ایک تاجر کو بلایا اور زہر ملا ہوا بہترین حلوا خوبصورت سے برتنوں میں رکھ کر دو صندوقوں میں رکھوا دیا اور انہیں ایک خچر پر لاد کر تاجر کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ وہ قافلے کے ساتھ جائے اور راستے میں اگر ڈاکو ملیں تو ان پر یہ ظاہر کرے کہ یہ اُمراء کی خواتین کے لیے ہدیہ جا رہا ہے۔

تاجر قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ڈاکوؤں کی جماعت نے راستے میں گھیر کر قافلے کا سارا سامان لوٹ لیا۔ ان میں وہ حلوا بھی شامل تھا۔ ایک چور خچر کو لے کر پہاڑوں پر چڑھ گیا۔ جب صندوق کھولا تو اس میں میٹھا میٹھا حلوا دیکھا۔ اس نے اکیلے کھانا پسند نہ کیا، چنانچہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی بلایا اور سب نے مزے لے لے کر حلوا تناول کیا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ سبھی ہمیشہ کی نیند سو چکے تھے۔

پھر اس قافلے کے تمام تاجروں نے اپنا اپنا سامان لیا اور خوشی خوشی روانہ ہو گئے۔

……تو میں تمہاری پوجا کرتا

اس واقعہ کے راوی عبداللہ بن ابان ثقفی ہیں: مجھے حجاج بن یوسف نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو تلاش کرنے پر مامور کیا۔ حکم یہ تھا کہ ان کو حجاج کے سامنے کسی بھی حالت میں حاضر کیا جائے۔ میرا اپنا گمان یہ تھا کہ وہ حجاج کے سامنے پیش ہونا یا اُس ملنا گوارا نہیں کریں گے۔ خیر میں نے اپنا گھوڑا لیا اور ان کے گھر جا پہنچا۔ وہ مجھے اپنے گھر کے دروازے پر ہی مل گئے۔ میں نے کہا: آپ کو امیر یاد کرتا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

کہنے لگے: کونسا امیر؟

میں نے کہا: ابو محمد حجاج۔

فرمانے لگے: اللہ اس کو ذلیل و رسوا کرے۔ میں نے اس سے زیادہ کسی کو ذلیل نہیں دیکھا۔ اس لیے کہ عزت والا وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے اور ذلیل و رسوا وہ ہوتا ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے اور گناہوں میں زندگی گزارے۔ اور تیرا جو ساتھی ہے اس کی حالت یہ ہے کہ:

«قَدْ بَغَى وَطَغَى وَاعْتَدَى وَخَالَفَ كِتَابَ اللهِ وَالسُّنَّةَ وَاللهِ! لَيَنْتَقِمُ اللهُ مِنْهُ»

”اس نے اللہ کے ساتھ بغاوت‘ سرکشی اور تجاوز کیا ہے اور کتاب وسنت کی خلاف ورزی کی ہے۔ اللہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔“

میں نے کہا: زیادہ باتیں نہ کریں بلکہ میرے ساتھ سیدھے امیر کے پاس چلیں

وہ آپ کو بلا رہا ہے۔

چنانچہ ہم دونوں حجاج بن یوسف کے دربار میں آئے۔ حجاج نے ان کو دیکھ کر پوچھا:

«أَنْتَ أَنسُ بْنُ مَالِكٍ»

”تم انس بن مالک ہو۔“

انس بن مالک نے جواب دیا: ہاں۔

حجاج نے کہا: «أَنْتَ الَّذِي تَدْعُو عَلَيْنَا وَتَسُبُّنَا» ”آپ وہی ہیں جو مجھے گالیاں دیتے ہیں اور میرے لیے بد دعا کرتے ہیں۔“

انس بن مالک: ہاں۔

حجاج: آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

انس بن مالک: «لِأَنَّكَ عَاصٍ لِرَبِّكَ مُخَالِفٌ لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ ﷺ وَتُعِزُّ أَعْدَاءَ اللهِ وَتُذِلُّ أَوْلِيَاءَ اللهِ»۔ ”کیوں کہ تم اللہ کی نافرمانی کرتے ہو۔ اللہ کے رسول کی مخالفت کرتے ہو۔ تم دشمنان اسلام کو تو عزت و احترام دیتے ہو مگر اولیاء اللہ کو رسوا کرتے ہو۔“

حجاج غصے میں آ گیا اور کہنے لگا: آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟

انہوں نے فرمایا: مجھے تو معلوم نہیں۔

حجاج نے کہا: میں آپ کو نہایت برے طریقے سے قتل کر دوں گا۔

حضرت انس نے اس وقت یہ تاریخی کلمات ارشاد کیے:

«لَوْ عَلِمْتُ أَنَّ ذَلِكَ بِيَدِكَ لَعَبَدْتُّكَ مِنْ دُونِ اللهِ»

’’اگر مجھے معلوم ہوتا کہ موت و زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے تو میں اللہ کو چھوڑ کر تمہاری پوجا کرتا۔‘‘

حجاج نے کہا: ایسا میرے بس میں کیوں نہیں ہے؟

حضرت انس نے فرمایا: اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے ایک ایسی دعا سکھائی ہے کہ جو شخص اس دعا کو ہر روز صبح کے وقت پڑھے گا۔ «لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ عَلَيْهِ سَبِيلٌ» ’’کوئی اس پر غلبہ نہ پا سکے گا‘‘۔ اور آج صبح میں نے یہ دعا پڑھی ہے۔

حجاج نے کہا: پھر وہ دعا مجھے بھی سکھا دیں۔

حضرت انس نے فرمایا: «مَعَاذَ اللهِ أَنْ أُعَلِّمَهُ لِأَحَدٍ مَادُمْتَ أَنْتَ فِي الْحَيَاةِ»۔ ’’اللہ کی پناہ! میں تمہاری زندگی میں کسی کو یہ دعا نہیں سکھاؤں گا۔‘‘

حجاج نے حکم دیا کہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔

اس کا ایک درباری بولا: اے امیر! ایک زمانے سے ان کی تلاش تھی، بڑی مشکل سے ان کو تلاش کیا۔ اب ان کو کیسے چھوڑ دیں؟

حجاج نے کہا:

«لَقَدْ رَأَيْتُ عَلَى عَاتِقِهِ أَسَدَيْنِ عَظِيمَيْنِ فَاتِحَيْنِ أَفْوَاهَهُمَا»

’’میں نے ان کے کندھوں پر دو بڑے بڑے شیروں کو منہ کھولے ہوئے دیکھا۔‘‘

حضرت انس بن مالک ؓ کی وفات کا جب وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بھائیوں کو یہ دعا بتا دی تھی۔

خوب صورت جواب

خلیفہ عبدالملک بن مروان کی خدمت میں جب ایاس بن معاویہ بحیثیت امیرِ کارواں آئے تو اس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی اور ان کے پیچھے ان کی قوم کے چار بڑے شیوخ بھی تھے۔ خلیفہ نے اس قافلے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور گویا ہوا: افسوس ان لوگوں پر! کیا ان میں کوئی بزرگ نہیں تھے جن کو اس قافلے کا امیر بنایا جاتا اور اس چھوکرے پر اسے ترجیح دی جاتی؟

پھر خلیفہ ایاس بن معاویہ کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: تمہاری عمر کیا ہے؟

ایاس بن معاویہ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ امیر کی عمر دراز کرے، میری عمر اتنی ہی ہے جتنی اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی اس وقت تھی جب رسولِ اکرم ﷺ نے انھیں ایک لشکر کا سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا اور جس میں جلیل القدر صحابی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان کو ایاس بن معاویہ کے جواب سے بڑی خوشی ہوئی اور اس کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ چنانچہ گویا ہوا:

«تَقَدَّمْ، بَارَكَ اللهُ فِيكَ» .

”آؤ، میرے قریب آؤ! اللہ تمھیں برکت سے نوازے!“

بھول

اشعب سے کہا گیا: تم نے بہت سے لوگوں کی صحبت اختیار کی اور ان سے علم حاصل کیا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم ہمارے ساتھ بھی بیٹھتے اور جو کچھ سیکھا ہے، بیان کرتے؟

چنانچہ ایک روز وہ لوگوں کے درمیان بیٹھا، لوگوں نے حدیث پوچھی تو اشعب نے حدیث بیان کرنا شروع کی: میں نے عکرمہ سے، عکرمہ نے ابن عباس سے اور ابنِ عباس نے رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی:

«خُلَّتَانِ لَا يَجْتَمِعَانِ فِي مُؤْمِنٍ».

”دو عادتیں ایک مومن میں یکجا نہیں ہو سکتیں۔“

اتنی حدیث سنا کر اشعب خاموش ہو گیا۔

لوگوں نے پوچھا: ”خُلَّتَانِ“ (دو عادتیں) کون سی ہیں؟“

اشعب نے کہا: «نَسِيَ عِكْرِمَةُ وَاحِدَةً وَنَسِيتُ أَنَا الْأُخْرَى»

”ایک عکرمہ بھول گئے اور ایک میں بھول گیا۔“

یہ ہدیہ نہیں!

عمرو بن مہاجر کہتے ہیں: ایک آدمی نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کچھ سیب بطورِ ہدیہ پیش کیے، لیکن عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے ان سے عرض کیا: رسولِ اکرم ﷺ تو ہدیہ قبول کرتے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

«هُوَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ هَدِيَّةٌ وَهُوَ لَنَا رِشْوَةٌ، وَلَا حَاجَةَ لِي بِهَا».

”یہ رسولِ اکرم ﷺ کے لیے ہدیہ تھا لیکن ہمارے لیے رشوت ہے، مجھے اس ہدیے کی ضرورت نہیں۔“

آپ کا یہ طرزِ عمل اصحابِ اقتدار اور اصحابِ مناصب کے لیے اپنے اندر زبردست غور و فکر کی دعوت رکھتا ہے۔ آج کل دنیا کے اکثر ممالک میں سرکاری اہلِ کار دھڑلے سے تحائف وصول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ واضح طور پر رشوت ہوتی ہے۔

معذرت کا انداز

ایک بادشاہ نے دستر خوان چننے کا حکم دیا اور اپنے خاص لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ جب دستر خوان لگ گیا تو خادم اپنے کندھے پر کھانے کی رکابی لے کر آیا لیکن جب بادشاہ سے قریب ہوا تو اس پر ہیبت طاری ہوگئی، چنانچہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور رکابی سے تھوڑا سا شوربا گر کر بادشاہ کے کپڑے کے کنارے پر لگ گیا۔ بادشاہ غصے سے آگ بگولا ہوگیا اور خادم کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔

خادم نے جب بادشاہ کا طیش دیکھا اور بادشاہ کا عزم اس پر اچھی طرح واضح ہو گیا تو رکابی میں موجود سارا شوربا بادشاہ کے سر پر انڈیل دیا۔

بادشاہ نے غرّا کر آواز دی: ارے تیری بربادی ہو! یہ کیا کر رہا ہے؟

خادم نے عاجزانہ انداز میں عرض کیا: بادشاہ سلامت! میں نے یہ حرکت آپ کی عزت وشان اور غیرت کے تحفظ کے لیے کی ہے۔

بادشاہ نے پوچھا: وہ کیسے؟

خادم کہنے لگا: مجھے ڈر تھا کہ لوگ میرے قتل پر یہ نہ کہیں کہ ہمارا بادشاہ بھی عجیب جلالی ہے، کہ معمولی سی غلطی پر خادم کو قتل کروا دیا حالانکہ خادم نے جان بوجھ کر یہ غلطی نہیں کی تھی۔ پھر لوگ بادشاہ کو ظالم و جابر گردانے لگیں گے۔ لہٰذا میں نے یہ دوبارہ، جان بوجھ کر بھاری غلطی کرنے کی جرأت کی تاکہ لوگوں کو جب پتا چلے تو اسے معمولی غلطی نہ سمجھیں، آپ کو بھی معذرت کی ضرورت نہ ہوگی اور آپ کی عزت اور ہیبت بھی لوگوں کے دلوں میں باقی رہے گی۔

خادم کی گفتگو سن کر بادشاہ تھوڑی دیر سر جھکائے رہا، پھر سر اُٹھایا اور گویا ہوا:

اے فعلِ قبیح کا ارتکاب کر کے بہترین اسلوب میں معذرت کرنے والے! ہم نے تیرے فعلِ قبیح اور گناہِ عظیم کو تیری اچھی معذرت کے سبب معاف کر دیا، جا تو اللہ کے لیے آزاد ہے۔

صرف ایک گھونٹ پانی

ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور محدث تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید کو دیکھا کہ وہ سخت پیاس کی حالت میں پینے کے لیے پانی ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے ہے اور پانی کا گلاس منہ سے لگانے ہی والا ہے۔ ابن سماک نے آواز دی: اے امیر المومنین! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تھوڑی دیر پانی پینے سے رک جائیں!

جب ہارون رشید نے پانی کا پیالہ زمین پر رکھ دیا تو ابن سماک نے عرض کیا:

«أَسْتَحْلِفُكَ بِاللهِ تَعَالَى، لَوْ أَنَّكَ مُنِعْتَ هَذِهِ الشُّرْبَةَ مِنَ الْمَاءِ فَبِكَمْ كُنْتَ تَشْتَرِيهَا؟».

”میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کو پانی کے اس گھونٹ سے روک دیا جائے تو آپ کتنی قیمت دے کر اسے خرید لیں گے؟“

ہارون رشید نے جواب دیا: اپنی سلطنت کی آدھی دولت سے خرید لوں گا۔

ابن سماک نے کہا: اللہ تعالیٰ آپ کو خیر و مسرت کے ساتھ رکھے! پانی پی لیجیے۔

جب ہارون رشید نے پانی نوش کر لیا تو ابن سماک نے عرض کیا:

«أَسْتَحْلِفُكَ بِاللهِ تَعَالَى لَوْ أَنَّكَ مُنِعْتَ خُرُوجَهَا مِنْ جَوْفِكَ بَعْدَ هَذَا، فَبِكَمْ كُنْتَ تَشْتَرِيهَا؟».

”میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اگر آپ کے پیٹ سے یہ پانی

نہ نکلے (پیشاب نہ ہو) تو کتنی قیمت کے عوض اس کو نکالنے کا علاج کرائیں گے؟''

ہارون رشید نے کہا: اپنی پوری سلطنت کی دولت اس کے علاج میں لگا دوں گا۔

ابن سماک نے فرمایا:

«يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، إِنَّ مُلْكًا تَرْبُو عَلَيهِ شُرْبَةُ مَاءٍ لَخَلِيقٌ أَنْ لَّا يُنَافَسَ فِيهِ».

''اے امیر المومنین! ایسی بادشاہی جو ایک گھونٹ پانی سے کم تر قیمت رکھتی ہے، بہتر یہی ہے کہ ایسی سلطنت کی طلب میں جان توڑ کوشش نہ کی جائے۔

تاریخِ دمشق (16/67, 17) میں ابن عساکر نے ابن سماک کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

«يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، فَمَا تَصْنَعُ بِشَيءٍ؟ شُرْبَةُ مَاءٍ خَيْرٌ مِنْهُ».

''اے امیر المومنین! پھر اس سلطنت کو آپ کیا کریں گے کہ پانی کا ایک گھونٹ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔''

خلیفہ ہارون رشید ابن سماک کی بات سننے کے بعد اس قدر زار و قطار رونے لگا کہ اس کی داڑھی کے بال آنسوؤں سے تر ہو گئے۔

ابن سماک ہی کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے ہارون رشید سے کہا: '' «يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، إِنَّ اللهَ لَمْ يَجْعَلْ أَحَدًا فَوْقَكَ، فَلَا يَنْبَغِي أَنْ يَّكُونَ أَحَدٌ أَطْوَعَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْكَ».

''اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے (آپ کے عہد میں) آپ سے زیادہ مرتبہ کسی اور کو عطا نہیں کیا، اس لیے کوئی بھی شخص آپ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار نہیں ہونا چاہیے۔''(1)

---

(1) تاريخ دمشق الكبير(17/67)۔

مطلب یہ ہے کہ بندے پر جس قدر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا نزول زیادہ ہو، اسی قدر اسے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار اور اس کا مطیع وفرماں بردار ہونا چاہیے، اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسلمانوں کا خلیفہ بنایا ہے اور پوری سلطنت کے آپ اکیلے مالک ہیں، آپ سے بڑا کوئی نہیں، کوئی آپ پر حکمران نہیں اور آپ سب پر حکمران ہیں، اس لیے آپ پر واجب ہے کہ سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرماں بردار بنیں اور اس کے آگے جھکیں، کیوں کہ زیادہ پھلدار درخت زیادہ جھکا ہوتا ہے۔

اللہ کا دشمن ذلت وپستی کا شکار ہو کر رہا

ایک روز اللہ کے دشمن ابو جہل کا گزر ایک ہجوم کے پاس سے ہوا، جہاں لوگوں نے ایک پتلی پنڈلی والے ضعیف و لاغر آدمی کے اردگرد مجمع لگا رکھا تھا۔ ابو جہل کی نظر اس آدمی پر پڑی تو دیکھا کہ وہ عبداللہ بن مسعود ؓ ہیں جو اپنے پاس اکٹھے ہونے والے لوگوں کے مجمع میں انتہائی میٹھی آواز میں، پر مغز اور معنی خیز دل نشیں کلام تلاوت فرما رہے ہیں:

﴿وَعِبَادُ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلَّذِينَ يَمۡشُونَ عَلَى ٱلۡأَرۡضِ هَوۡنٗا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ ٱلۡجَٰهِلُونَ قَالُواْ سَلَٰمٗا ٦٣﴾

"رحمان کے سچے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب بے علم لوگ ان سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں، سلام ہے۔"(1)

یہ دیکھتے ہی دشمنِ اسلام ابو جہل کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے نہایت غصے سے اپنا سر ہلایا اور آگ بگولا ہو کر انتہائی غیظ وغضب میں کمان کھینچ کر عبداللہ بن مسعود ؓ کے سر پر دے ماری جس سے ان کا سر زخمی ہو گیا۔ پھر انتہائی حقارت سے گویا ہوا:

او لونڈی کے بچے! تو کیوں ہمارے اخلاق کو پستی کی طرف لے جانے پر تلا ہوا ہے؟ کیوں ہماری جمعیت کا شیرازہ تار تار کر رہا ہے؟ لگتا ہے تیرا علاج مجھے کرنا پڑے گا۔ ورنہ تو اپنی حرکتوں سے باز آنے والا نہیں۔

ابو جہل نے اپنی بکواس ختم کی تو اتنے میں انتہائی جوش وخروش اور شجاعت و

---

(1) الفرقان: 63

مردانگی کے عالم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک زبردست مکا ابوجہل کی چھاتی پر اور ایک زنّاٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید ہوتا ہے، اللہ کا دشمن بلبلا اُٹھتا ہے اور متکبرانہ انداز میں گویا ہوتا ہے:

«لَنْ تَفْلِتَ مِنِّي بِهَا يَا رَاعِيَ الْغَنَم».

" بکریوں کے چرواہے، تو میرے پنجے سے ہرگز نہیں بچ سکتا!"

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جواب میں فرماتے ہیں:

«وَلَنْ تَفْلِتَ بِمَا فعلْتَ يَا عَدُوَّ اللهِ».

"اور تو بھی اپنی نازیبا حرکات کا جواب پائے بغیر نہیں بچ سکتا او اللہ کے دشمن!"

دن گزرتے ہیں، راتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے چلے گئے۔ اس مدت میں ابوجہل کو اپنا مقابل نظر نہیں آتا' کیوں کہ وہ زنّاٹے دار تھپڑ سے اپنے چہرے پر پڑی ہوئی سرخی کو مٹانے کے لیے بدلے کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہے، لیکن اس کی ملاقات اپنے مقابل سے اس وقت ہوتی ہے جب میدانِ جنگ میں لشکرِ اسلامی کے جرار سپاہیوں کی تلواروں کی جھنکار سے دشمنانِ اسلام کے پاؤں اُکھڑتے نظر آرہے ہیں۔ اس دن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بدر کے مقتولین کے پاس سے گزرتے ہیں، سامنے ابوجہل کا دھڑ نظر آرہا ہے جو زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس دشمن خدا کی طرف لپکتے ہیں۔ انہوں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھا اور سر کاٹنے کے لیے داڑھی پکڑی اور فرمایا:

او اللہ کے دشمن! آخر اللہ نے تجھے رسوا کیا نا!

اس نے کہا: کاہے کو رسوا کیا۔ جس شخص کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے اس سے بلند پایہ کوئی آدمی عرب کی سرزمین پر پایا ہی نہیں جاتا۔

پھر بولا: کاش! مجھے کسانوں کی بجائے کسی اور نے قتل کیا ہوتا۔ اس کے بعد پوچھنے لگا: مجھے بتاؤ آج فتح کس کی ہوگی؟

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول کی۔

اس کے بعد وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ سے جو اس کی گردن پر پاؤں رکھ چکے تھے، کہنے لگا: او بکری کے چرواہے! تو بڑی اونچی اور مشکل جگہ پر چڑھ گیا ہے۔ (واضح رہے کہ عبداللہ بن مسعود ؓ مکے میں بکریاں چرایا کرتے تھے۔)

اس گفتگو کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے اس کا سر کاٹ لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کرتے ہوئے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ رہا اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر۔

آپ ﷺ نے تین دفعہ فرمایا: واقعی، اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

«اللهُ أَكْبَرُ! الْحَمْدُ للهِ الَّذِي صَدَقَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ».

”اللہ اکبر! تمام حمد اللہ کے لیے ہے جس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی اور تنہا سارے گروہوں کو شکست دی۔“

پھر فرمایا: چلو، مجھے اس کی لاش دکھاؤ! عبد اللہ بن مسعود ؓ نے جا کر ابوجہل کی لاش دکھائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اس امت کا فرعون ہے۔

عربی سخاوت

قیس بن سعد سے پوچھا گیا: کیا آپ نے اپنے سے زیادہ کسی کو سخی دیکھا ہے؟

قیس بن سعد نے کہا: ہاں! ایک مرتبہ ہم چند آدمی کسی گاؤں میں ایک عورت کے گھر گئے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا شوہر بھی آن پہنچا۔ عورت نے اپنے شوہر سے کہا: ہمارے یہاں چند مہمان آئے ہیں۔

شوہر فوراً ایک اونٹنی لایا، اُسے ذبح کیا، پکایا اور ہم لوگوں سے کہا: چلو کھاؤ۔

دوسرے دن وہ دوسری اونٹنی ذبح کر لایا اور کہا: کھاؤ!

ہم لوگوں نے اس سے کہا: کل رات جو اونٹنی تم نے ذبح کی تھی، اس میں سے تھوڑا سا گوشت ہم لوگوں نے کھایا تھا اور باقی گوشت موجود ہی ہے، دوسری اونٹنی ذبح کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اعرابی بولا: مہمانانِ کرام کو باسی کھانا کھلانا میری شان کے خلاف ہے۔

ہم لوگ اس اعرابی کے یہاں کئی دنوں تک ٹھہرے رہے، کیوں کہ موسم بڑا خراب تھا۔ بارش ہو رہی تھی، وہ ہر روز اسی طرح ہماری مہمان نوازی کرتا رہا۔ جب ہم لوگ وہاں سے چلنے لگے تو اتفاق کی بات اعرابی گھر پر نہیں تھا۔ ہم نے اعرابی کے گھر میں سو دینار رکھ دیے اور اس کی بیوی سے کہا: ہماری طرف سے معذرت پیش کر دینا۔

پھر ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ جب دن کچھ چڑھ گیا تو پیچھے سے وہ اعرابی

’’رکو! رکو!‘‘ کی آوازیں دیتا ہوا آیا۔ وہ ہم سے قریب ہوتے ہی بولا: یہ لو اپنے دینار پکڑو! مہمان نوازی کی قیمت وصول کرنا میری عادت نہیں۔ اگر تم لوگوں نے یہ دینار واپس نہ لیے تو پھر......! اس نے اپنے نیزہ کی طرف اشارہ کیا اور کہا: بصورت دیگر اپنے اس نیزے سے تمہاری دھلائی کردوں گا۔

چنانچہ ہم لوگوں نے دینار واپس لینے میں ہی عافیت دیکھی۔

کلمہ گو کے لیے جنت کی ضمانت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ایک دفعہ ہم لوگ رسول اکرم ﷺ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مجلس میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تشریف فرما تھے۔ اتنے میں رسول اکرم ﷺ مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے اور واپسی میں بڑی تاخیر کر دی۔ ہمیں خدشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں رسول اکرم ﷺ کو اکیلے پا کر کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ چنانچہ ہم گھبرا سے گئے اور آپ ﷺ کی تلاش میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب سے پہلے گھبراہٹ میرے اوپر طاری ہوئی تھی، میں جلدی سے رسول اکرم ﷺ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑا۔ انصار کے قبیلہ بنو نجار کے ایک باغ کے قریب پہنچ کر میں نے اس کا دروازہ ڈھونڈنا شروع کیا (تاکہ اس میں داخل ہو کر آپ ﷺ کو تلاش کرسکوں)، مگر مجھے کوئی دروازہ نہیں مل سکا۔

اچانک میری نگاہ ایک نالی پر پڑی جو باہر کنویں سے باغ میں گئی ہوئی تھی، چنانچہ میں لومڑی کی طرح سمٹ کر نالی کے راستے سے باغ کے اندر گھس گیا۔ باغ میں رسول اکرم ﷺ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا:

''ابوہریرہ ہو؟''

میں نے عرض کیا: ہاں اللہ کے رسول ﷺ ۔

آپ نے پوچھا:

«مَا شَأْنُكَ ؟»

''کیا بات ہے؟''

میں نے عرض کیا: دراصل جب آپ نے ہمارے درمیان سے اٹھنے کے

بعد واپسی میں تاخیر کی تو ہمیں خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں آپ کو اکیلا پا کر کوئی دشمن حملہ نہ کر دے، اس لیے ہم لوگ گھبرا اٹھے۔ آپ کی تلاش میں جب میں نے اس باغ میں آنا چاہا تو کوئی دروازہ مجھے نظر نہیں آسکا، بڑی مشکل سے لومڑی کی طرح سمٹ کر میں نالی کی راہ سے آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکا ہوں۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔

یہ سننے کے بعد رسول اکرم ﷺ نے مجھے اپنے دونوں جوتے دے کر فرمایا:

«يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَّرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ»

”اے ابوہریرہ! میرے یہ دونوں جوتے لے کر جاؤ، جو کوئی اس باغ کے باہر ملے اور وہ سچے دل سے گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تو اسے جنت کی خوشخبری سنا دو۔“

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے: جب میں یہ خوشخبری لے کر رسول اکرم ﷺ کے جوتوں سمیت باہر نکلا تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا:

«مَا هَاتَانِ النَّعْلَانِ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟»

”ابوہریرہ! یہ جوتے کیسے ہیں؟“

میں نے رسول اکرم ﷺ کی بشارت سے حضرت عمر کو آگاہ کیا تو انہوں نے زور سے ایک مکا میرے سینے پر رسید کیا، جس کی وجہ سے میں سرین کے بل زمین پر گر پڑا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: چلو واپس جاؤ۔

میں روتے ہوئے جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں واپس ہوا تو آپ نے پوچھا: «مَالَكَ يَا أَبَاهُرَيْرَةَ؟»

''ابوہریرہ تجھے کیا ہو گیا؟''

میں نے آپ کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ اتنے میں حضرت عمر ؓ بھی میری پیٹھ پر آ پہنچے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا:

«يَا عُمَرُ! مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا صَنَعْتَ؟»

''عمر! آخر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

حضرت عمر نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا آپ نے ابوہریرہ کو سچے دل کے ساتھ کلمہ طیبہ کی گواہی دینے والوں کے لیے جنت کی بشارت دے کر بھیجی تھی؟

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں۔''

حضرت عمر نے عرض کیا:

«فَلَا تَفْعَلْ، فَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يَتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُونَ»

''آپ ایسا نہ کریں، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ لوگ اسی بشارت پر تکیہ کر بیٹھیں گے (اور عمل کو بالائے طاق رکھ دیں گے)، اس لیے آپ لوگوں کو عمل کرنے کے لیے چھوڑ دیں۔''

چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«فَخَلِّهِمْ» ''چلو انہیں عمل کرنے کے لیے چھوڑ دو۔'' (1)

---

(1) مسلم: كتاب الإيمان (31).

یہی تو سرداری ہے

دور اموی کا نامور خلیفہ عبدالملک بن مروان(1) حج کی غرض سے مکہ مکرمہ میں ہے۔ اپنے گھر میں پلنگ پر بڑے وقار سے بیٹھا ہے۔ اس کے اردگرد اشراف مکہ ہیں۔ اچانک سامنے کے دروازے سے مشہور تابعی بزرگ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ(2) داخل ہوتے ہیں۔ جیسے ہی خلیفہ کی نظر ان پر پڑی کھڑا ہو گیا۔ سلام عرض کیا اور نہایت احترام سے پلنگ پر اپنے سامنے بٹھایا اور کہنے لگا:

«يَا أَبَا مُحَمَّدٍ، مَا حَاجَتُكَ؟».

”اے ابو محمد! اگر کوئی حاجت ہو تو پیش کریں“۔

عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے: حرمین شریفین میں لوگوں کے ساتھ ظلم و زیادتی سے بچیں، ان کے بارے میں اللہ کا خوف رکھیں، مہاجرین و انصار کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کریں، کہ آپ انہی کی بدولت اس مرتبہ و مقام پر پہنچے ہیں۔ جو لوگ سرحدوں پر جہاد میں مصروف ہیں ان کے حقوق کا خیال کریں۔ اصل میں یہی لوگ اسلام کا قلعہ ہیں۔ مسلمانوں کے معاملات اور مسائل میں پوری دلچسپی اور توجہ

---

(1) عبدالملک بن مروان بن حکم بن ابی العاص 26 ہجری میں پیدا ہوئے۔ 16 سال کی عمر میں ان کی صلاحیت دیکھ کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ ان کی خلافت 21 سال تک رہی اور 57 سال کی عمر میں وفات پائی۔

(2) عطاء بن ابی رباح فہری رحمۃ اللہ علیہ کبار تابعین میں سے تھے۔ دو سو سے زائد صحابہ کرام کو پایا۔ یہ نہایت ثقہ، فقیہ، محدث، امام اور عالم دین تھے۔ حدیث کے استاد تھے اور حج و عمرہ کے مسائل کو اپنے وقت میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے 70 حج کیے اور 100 سال کی عمر میں وفات پائی۔

دیں کہ ان تمام کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔

آپ کے دروازے پر آنے والے حاجت مند آپ کی توجہ کے محتاج ہیں۔ ان سے غفلت نہ برتیں اور ہاں ان کے لیے اپنے دروازے کبھی بند نہ کریں۔ عبدالملک بن مروان کہنے لگا: جو آپ نے فرمایا ہے ایسا ہی ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد عطاء اٹھ کھڑے ہوئے اور چل دیے۔

اب عبدالملک نے ان کا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا:

« إِنَّمَا سَأَلْتَنَا حَوَائِجَ غَيْرِكَ وَقَدْ قَضَيْنَاهَا، فَحَاجَتُكَ؟ ».

”آپ نے دوسروں کی ضروریات پیش کی ہیں، جنہیں ہم پورا کریں گے۔ مگر آپ نے اپنی ضرورت تو بتائی ہی نہیں؟

عطاء نے اس سے اپنا بازو چھڑایا اور کہنے لگے:

« مَالِي إِلَى مَخْلُوقٍ حَاجَةٌ »

”مخلوق میں سے مجھے کسی شخص سے کوئی حاجت اور ضرورت نہیں“۔

یہ کہہ کر چل دیے۔

عبدالملک نے یہ سن کر کہا:

« هَذَا وَأَبِيكَ السُّؤْدُدُ ». (1)

”قسم سے یہی تو سرداری ہے“۔

---

(1) (دیکھیے سیر اعلام النبلاء امام الذہبی 84/5)۔

مُسَبِّبُ الأَسْبَاب

علی بن حرب (1) کہتے ہیں: میں ضروریاتِ زندگی خریدنے کے لیے اپنے وطن مَوْصِل سے سامرّاء جانے کے لیے نکلا۔ دِجلہ میں چند کشتیاں موصل سے سامرّاء تک چلتی تھیں اور اجرت پر سواریوں اور ان کے ساز وسامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی تھیں۔ میں بھی ایک کشتی میں سوار ہو گیا۔ کشتی ہمیں لے کر سامرّاء کی طرف سطحِ آب پر چل پڑی اور دریائے دجلہ کی مسافت طے کرنے لگی۔

کشتی میں لدے سامان کے علاوہ ہم صرف پانچ آدمیوں پر مشتمل جماعت تھے۔ دن بڑا پُر لطف تھا اور بادل کا دور دور تک کوئی نشان تک نہیں تھا، فضا بالکل صاف ستھری اور انتہائی خوشگوار تھی، دریائے دجلہ بالکل پرسکون تھا۔ کشتی بان بڑی مستی میں خوبصورت گانے جھوم جھوم کر گائے جا رہا تھا اور کشتی بڑے سکون سے سطحِ آب پر تیزی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں تھی۔ کشتی میں سوار اکثر لوگوں کو ہلکی ہلکی نیند آنے لگی، لیکن میں دجلہ کے دونوں جانب کے حسین وجمیل ساحل کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ پانی میں ایک بڑی سی مچھلی پر پڑی جو اچھل کر کشتی کے اندر آ پڑی۔ میں نے جلدی سے مچھلی کو پکڑ لیا کہ مبادا وہ دوبارہ دریا میں چھلانگ نہ لگا دے!

مچھلی کو پکڑنے کے لیے جو میں دوڑا تو کشتی ہچکولے کھانے لگی جس کی وجہ سے

---

(1) یہ قصہ ابن الملقن کی کتاب “طبقات الأولیاء” (ص 180) میں مذکور ہے جسے دارالمعرفہ نے شائع کیا ہے۔ ابن الملقن کہتے ہیں کہ اس قصے کو ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں علی بن حرب سے نقل کیا ہے۔

لوگوں کی نیند اُڑ گئی اور وہ نیند کی غنودگی سے باہر آ گئے۔ جب انھوں نے مچھلی دیکھی تو ایک آدمی نے کہا: یہ مچھلی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بھیجی ہے اس لیے ہم کیوں نہ آگے ساحل پر اُتریں اور اسے بھون کر کھائیں؟ یہ اتنی بڑی ہے کہ ہم سبھوں کو کفایت کر جائے گی۔

ہمیں اس کی رائے بھلی لگی۔ کشتی بان نے بھی اس سے موافقت کی اور کشتی کا رخ ساحل کی طرف موڑ دیا۔ ہم لوگ ساحل پر اُترے اور گھنے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے تا کہ لکڑیاں اکٹھی کر کے مچھلی بھونیں۔

جونہی ہم گھنے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئے، ایک خوفناک منظر نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ایک مقتول زمین پر ڈھیر تھا، اس کے قریب ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا تھا۔ پاس ایک دوسرا جوان آدمی بھی تھا جس کی مشکیں کس دی گئی تھیں اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا جس کی وجہ سے کچھ بولنے اور چیخنے چلانے سے عاجز تھا۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر ہمارے اوپر دہشت طاری ہو گئی ہم جلدی سے آگے بڑھے اور اس آدمی کی رسی کھول کر اس کے منہ سے کپڑا نکالا، وہ حد درجہ خوف زدہ اور نا اُمیدی کی کیفیت میں تھا۔

اس پھندے سے آزادی کے بعد وہ گویا ہوا: مہربانی کر کے پہلے مجھے کچھ پانی پلاؤ!

ہم نے اسے پانی پلایا۔

جب وہ پانی پی چکا تو خود ہی بیان کرنے لگا: میں اور یہ مقتول دونوں ایک قافلے میں تھے جو کہ موصل سے بغداد کی طرف بغرضِ تجارت جا رہا تھا۔ یہ مقتول

بھانپ گیا کہ میرے پاس کافی مال ہے، چنانچہ اس نے مجھ سے دوستی کر لی، اور پیار ومحبت کا اظہار کرنے اور میرے قریب قریب رہنے لگا، بہت ہی کم میرا ساتھ چھوڑتا۔ میرا بھی اس پر کافی اعتماد قائم ہو گیا۔ قافلہ منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں تھا لیکن تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے اس ساحل پر قافلے نے پڑاؤ ڈالا، رات کے آخری حصے میں قافلہ روانہ ہو گیا لیکن میں سویا ہوا رہ گیا، اس لیے مجھے قافلے کی روانگی کی خبر نہ ہو سکی۔ قافلے کی روانگی کے بعد اس مقتول نے میری نیند کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے رسی سے باندھ دیا۔ جیسا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو اور اس نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ میں چیخ پکار نہ کر سکوں۔ اس نے میرے پاس جو کچھ مال تھا وہ چھین لیا اور مجھے زمین پر پٹخ دیا۔ پھر مجھے قتل کرنے کے لیے میرے سینے پر بیٹھ کر کہنے لگا:

«إِنْ تَرَكْتُكَ حَيًّا فَإِنَّكَ سَتُلَاحِقُنِي وَتَفْضَحُنِي، لِذَلِكَ لَا بُدَّ مِنْ ذَبْحِكَ».

”اگر میں تجھے زندہ چھوڑ دوں تو بعد میں تو مجھ سے مل کر مجھے ذلیل کر سکتا ہے، اس لیے میں ضرور تجھے قتل کروں گا!“

اس مقتول کے کمر بند سے بندھی ہوئی یہ تیز چھری تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تم لوگ دیکھ رہے ہو۔ اس نے مجھے قتل کرنے کے لیے کمر بند سے چھری کھینچی لیکن چھری اس میں پھنس گئی جس کی وجہ سے نکل نہیں رہی تھی، اس نے چھری نکالنے کی بڑی کوشش کی، جب ناکام ہو گیا تو اس نے پوری طاقت لگا کر چھری کمر بند سے کھینچی، اس کی دھار اوپر کی جانب تھی، چھری زور سے نکلی اور جا کر اس کی گردن میں گھس گئی اور چمڑے کے ساتھ گوشت کو چیرتے ہوئے شہ رگ کا بھی کام تمام کر دیا۔ شہ رگ کے کٹتے ہی خون کا فوارہ جاری ہو گیا اور جب طاقت نے

جواب دے دیا تو یہ مردہ حالت میں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

یہ مجرم میری آنکھوں کے سامنے کیفر کردار تک پہنچ گیا لیکن اس کے باوجود مجھے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا، کیونکہ ہم جس جگہ ہیں بہت ہی کم لوگ یہاں سے گزرتے ہیں۔ اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ کون میرے ہاتھ پاؤں کھولے گا؟ کون مجھے اس آفت سے نجات دلائے گا؟ پھر میں نے اللہ تعالیٰ کو پکارنا شروع کیا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! میرے پاس کسی کو بھیج دے جو تیرے اس آفت رسیدہ بندے کو اس پھندے سے نجات دلائے۔ میں برابر یہی دعا کرتا رہا۔ میں مظلوم تھا اور مظلوم کی دعا اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو میری طرف بھیجا اور تم نے میری جان بچائی۔ ذرا تم لوگ مجھے بتلانا کہ آخر وہ کون سے محرکات تھے جن کی وجہ سے تم لوگ اس بے آباد جگہ آنے پر مجبور ہوئے؟

قافلے والوں نے اسے بتلایا: تمہارے پاس آنے کی جو چیز محرک بنی، وہ ایک مچھلی ہے جو ہماری کشتی میں سمندر سے اچھل کر آ پڑی تھی۔ ہم لوگ اس مچھلی کو بھوننے کے لیے اس جگہ آ پہنچے ہیں!

مظلوم نے قافلے والوں کی گفتگو سن کر بڑا تعجب کیا اور کہنے لگا: یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس مچھلی کو تمہاری کشتی میں بھیجا ہے تاکہ تم اس سنسان جگہ آؤ اور مجھے اس آفت سے بچاؤ۔ میں زیادہ تھکا ہوا ہوں، اس لیے میری آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ براہ کرم مجھے کسی قریبی شہر میں لے چلو۔

مچھلی کو بھون کر کھانے کی بات قافلے والوں کے ذہن سے یکسر نکل ہی گئی تھی۔ اور پھر جب وہ لوگ مظلوم کو اس کے مال سمیت لے کر کشتی کے پاس واپس آئے تو

دیکھا کہ مچھلی کشتی سے کود کر سمندر میں جا چکی ہے۔ قافلے والوں کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس مچھلی کو کشتی کے اندر اس لیے بھیجا تھا تا کہ وہ اس مظلوم کی جان بچانے کا سبب بنے۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کچھ چاہتا ہے تو اس کے لیے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ (1) بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ».

''مظلوم کی بددعا سے بچو، کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے۔'' (2)

---

(1) دیکھیے: ''کان ما کان'' از ڈاکٹر عبدالرزاق کیلانی۔

(2) بخاری (2448) ومسلم (19)۔

مذاق اُڑانے والا

عمر غیمو رنا ئیجیر یا کے شمال میں اسٹیٹ کانگو کے گاؤں موب کا رہنے والا تھا۔ وہ دینِ مسیحی کا واعظ و مبلغ اور بڑا مغرور پادری تھا۔ اکثر قرآنِ کریم اور دینِ اسلام کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چند عیسائیوں کی ایک جماعت کے سامنے وعظ و نصیحت کر رہا تھا، اس نے اپنی تقریر کے دوران کہا: اگر قرآن اور دینِ اسلام برحق ہیں تو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے زندہ میرے گھر واپس نہ کرے۔

یہ بات اس نے نزبابتیس کے گرجا گھر میں لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہی تھی۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ گرجا گھر سے تن تنہا نکلا، راستے میں اس کے گھر سے پہلے ایک چھوٹا سا پانی کا نالا تھا، جونہی اس نے نالا پار کرنا چاہا، اس کا پاؤں پھسل گیا اور گر کر اسی کے اندر مر گیا۔ اگلے دن ایک اور آدمی کی موت ہوگئی جو نالے سے اس پادری کی لاش کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ پادری کی موت واقع ہو چکی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس پر سکتہ طاری ہوا ہے۔ ایک ہسپتال میں لاش لے کر گئے۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ مر چکا ہے۔ وہ دوسرے ہسپتال لے گئے، وہاں بھی پہلے ہسپتال کی رپورٹ کی تصدیق کی گئی۔ مگر عیسائیوں کو یقین نہ آیا۔ اب انھوں نے اسے عیسائی مشنری سے منسلک ہسپتال سے رجوع کیا، وہاں بھی پادری کی موت کی تصدیق ہوئی۔ تب جا کر لوگوں نے اس کی موت کو تسلیم کیا اور اسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

عمر غیمور نامی یہ پادری پہلے عیسائی تھا، پھر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا اور مسلمانوں کے درمیان زندگی گزارنے لگا، اس کا مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور لین دین ہوا کرتا تھا۔ اس نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں، قرآن مجید پڑھا اور اسلامی تاریخ میں واقفیت پیدا کی۔ دائرہ اسلام میں جب اس کی مدت کچھ طویل ہو گئی تو شیطان نے اسے بہکایا، چنانچہ وہ اسلام سے مرتد ہو کر دوبارہ عیسائی بن گیا اور گرجا گھروں میں جا جا کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو اُبھارنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں فرمایا ہے:

﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (١١)﴾

"آپ فرما دیجیے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھ لو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔ (1)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (٩)﴾

"وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں"۔ (2)

مزید ارشاد ہے:

﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (٣٠)﴾

"وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے زیادہ مستحکم تدبیر کرنے والا ہے"۔ (3)

اس حادثے کے بعد چار بستیوں کے باشندگان نے اسلام قبول کیا، وہ چار

---

(1) الأنعام:11 (2) البقرة: 9 (3) الأنفال: 30

بستیاں یہ ہیں:

1-فال 2-ویلوا 3-غواتی 4-موب

اور یہ چاروں بستیاں ایک ہی صوبے کانگو میں واقع ہیں۔

«وَللهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ».

خواب کی بنیاد پر

قاضی ابوعمر محمد بن یوسف کہتے ہیں: ہمارے پڑوس میں ایک شخص رہتا تھا جس کے بارے میں ایک قصہ زبان زدِ عام تھا کہ فقر و محتاجی کے طویل مراحل سے گزرنے کے بعد دولت و ثروت نے اس کی قدم بوسی کی ہے، تب کہیں جا کر وہ اب زندگی کے ناز و نعم میں پل رہا ہے۔ میں نے ایک روز اس سے لوگوں کے زبان زدِ عام قصے کے متعلق دریافت کیا تو اس جوان نے اپنی روداد کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی:

مجھے میرے والد کی طرف سے بہت سا مال وراثت میں ملا تھا۔ میں نے بے دریغ اُسے خرچ کرنا شروع کر دیا اور انتہائی تھوڑی مدت میں پوری دولت کو ٹھکانے لگا دیا۔ معاملہ یہاں تک آ پہنچا کہ میرے گھر کے دروازے کے ساتھ ساتھ گھر کی چھت بھی بک گئی۔ اب میرے پاس کوئی دنیوی ساز و سامان باقی نہ بچا تھا جس کو بیچ کر کھاؤں اور نہ ہی کسی حیلہ سازی کی کوئی گنجائش تھی جو مجھے مال فراہم کرنے کا ذریعہ بنے۔ مدت تک میری والدہ سوت کات کر مجھے روٹی کھلاتی رہی۔

میں جوان آدمی تھا اور بے روزگاری سے سخت تنگ آ چکا تھا۔ ایک دن میں نے ایک عجیب خواب دیکھا کہ ایک شخص مجھے مشورہ دے رہا ہے کہ تم مصر کیوں نہیں چلے جاتے، وہاں اپنی قسمت آزماؤ! ہوسکتا ہے وہاں تمہارے لیے رزق کے دروازے کھل جائیں۔

صبح اٹھا تو میں نے خواب پر غور کیا اور اس کو غیبی مشورہ سمجھا اور مصر جانے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ میرے پاس کوئی تعارفی خط ہو جس سے

میں اس اجنبی جگہ میں اپنی پہچان کروا سکوں۔ چنانچہ اے قاضی ابو عمر، میں آپ کے پاس گیا اور آپ کو اپنے والد کی دوستی اور پڑوسی ہونے کا واسطہ دیا کہ مجھے مصر کے قاضی کے نام خط لکھ دیں۔ آپ نے مجھے ایک تعارفی خط دے دیا جسے میں لے کر مصر پہنچ گیا۔

مصر پہنچ کر میں نے تعارفی خط حکام کو دکھایا اور کوشش بھی کی۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، کسی نے میری پروانہ کی۔ میں خاصا پریشان ہوا کہ اتنا سفر بھی کیا، مشقت بھی اٹھائی اور پھر بھی کچھ حاصل نہ ہوا، اس سے تو اپنا وطن اچھا تھا۔ یہاں تو فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا جا رہا تھا، جو کچھ میرے پاس تھا، ختم ہوتا جا رہا تھا۔ بھیک مانگنے کی نوبت آ گئی۔ میں نے سوچا کہ چلو بھیک مانگ لیتے ہیں۔ مگر اس کے لیے ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا۔ ادھر پیٹ تھا کہ کھانے کے لیے مانگ رہا تھا۔ میں مجبور ہو گیا۔ سوچا چلو رات کا انتظار کرتے ہیں۔ رات کو مانگنے کے لیے نکلا۔ اب مانگنے کا طریقہ بھی نہیں آتا تھا۔ شکل صورت اور لباس سے میں بہت ہی غریب اور فقیر لگ رہا تھا۔ مگر کسی کو بھی میری حالت پر رحم نہ آیا۔ ادھر رات گہری ہو چلی تھی۔ سڑک پر اکا دکا آدمی رہ گئے تھے کہ اچانک پولیس کے سپاہیوں کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ اب میں اس علاقے میں اجنبی تھا، ان کو مزید شک ہوا اور پولیس نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میں نے بڑا شور مچایا، رویا چلایا مگر پولیس کو کون روکتا۔

اچانک میں نے زور سے چیخ ماری اور کہا کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں تمھیں ہر چیز سچ سچ بتاتا ہوں۔ پولیس والوں نے کہا کہ بتاؤ۔ چنانچہ میں نے بغداد سے مصر آنے کا سبب بیان کیا اور تفصیل سے بتایا کہ کس طرح میں نے خواب دیکھا اور اس پر عمل کرتا

ہوا یہاں پہنچا مگر یہاں بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔

پولیس آفیسر نے کہا: میں نے تجھ سے زیادہ احمق آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ اللہ کی قسم! میں نے فلاں سال خواب میں دیکھا تھا کہ ایک آدمی مجھ سے کہہ رہا ہے: بغداد کی فلاں سڑک کے فلاں محلے میں فلاں آدمی کا گھر ہے...... پولیس آفیسر نے میرا گھر اور میرا نام بتایا...... اس گھر کے اندر ایک باغیچہ ہے جس میں بیری کا ایک درخت ہے۔ میرے گھر میں واقعی ایک باغیچہ تھا اور بیری کا ایک پیڑ تھا۔ اس بیری کے درخت کے نیچے تیس ہزار دینار مدفون ہیں، جاؤ اور لے لو۔ میں نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا اور نہ ہی اس سلسلے میں کچھ سوچنا گوارا کیا، لیکن اے احمق! تو کس قدر گدھا اور بے وقوف ہے کہ صرف ایک خواب کی بنیاد پر اپنا وطنِ عزیز چھوڑ کر مصر چلا آیا؟

میں نے اسے بالکل ہی نہیں بتایا کہ جس گھر اور بیری کی تو بات کر رہا ہے وہ میرا ہی گھر ہے۔ میں نے اس کی منت سماجت کی، اس کو میری حالت پر ترس آ گیا اور مجھے چھوڑ دیا۔ پولیس کے چنگل سے چھوٹا تو سیدھا ایک مسجد میں گیا، وہاں رات گزاری۔ صبح سویرے اٹھا اور اپنے وطن جانے کے لیے تیاری شروع کی۔ اتفاقاً ایک قافلہ بغداد کی طرف روانہ ہو رہا تھا، میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ راستے میں اہلِ قافلہ کی خدمت کرتا رہا اور بغداد پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے مصری پولیس آفیسر کا خواب سچا پایا۔

زندگی نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ میں نے اس مال کو غنیمت جانا اور نہایت عقل مندی سے اس کو خرچ کرنا شروع کیا۔ کاروبار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں مجھے بہت برکت عطا فرمائی۔ اور یہ جو کچھ مال و دولت آپ کو نظر آ رہا ہے سب اسی تجارت کا نتیجہ ہے۔ (1)

---

(1) الفرج بعد الشدة والضيق للحازمي۔

انصاف اور رواداری

قاضی ابو یوسف نے اپنی کتاب ''الخراج'' میں بیان کیا ہے:

ایک مرتبہ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب ﵁ ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک نابینا بوڑھا ہاتھ میں کشکول لیے بھیک مانگ رہا ہے۔ شکل وصورت سے وہ مسلمان کی بجائے ذمی معلوم ہو رہا تھا۔

حضرت عمر بن خطاب ﵁ نے اس کے بازو پر ہلکی سی ضرب لگائی اور پوچھا: اہلِ کتاب کی کس قوم سے تیرا تعلق ہے؟

نابینا بھکاری: یہودی ہوں۔

امیر المومنین: یہ جو میں تجھے کشکول اُٹھائے دیکھ رہا ہوں، آخر ماجرا کیا ہے؟

نابینا بھکاری: ایک تو جزیہ ادا کرنا ہوتا ہے، دوسرے میری زندگی کی ضروریات بھی ہیں اور تیسرے میں بوڑھا ہوں، اس لیے کما نہیں سکتا، پھر میری ضروریاتِ زندگی کا مسئلہ کیسے حل ہو اور جزیہ کہاں سے ادا کروں؟ لہٰذا بھیک مانگ رہا ہوں۔

امیر المومنین نے جب اس کی بات سنی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ممکن حد تک اسے عطا فرمایا۔ پھر بیت المال کے خازن کو بلا کر حکم دیا:

«أَنْظِرْ هٰذَا وَضُرَبَاءَهُ، فَوَاللهِ! مَا أَنْصَفْنَا الرَّجُلَ أَنْ أَكَلْنَا شَبِيبَتَهُ ثُمَّ نَخْذُلَهُ عِنْدَ الْهَرَمِ: ﴿إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ﴾

''اس نابینا بوڑھے یہودی کا اور اس کی طرح دوسرے اہلِ کتاب کا خوب خوب خیال رکھو! اللہ کی قسم! ہم نے اس بوڑھے یہودی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

اس کی جوانی میں تو ہم اس سے ٹیکس لیتے رہے اور بڑھاپے میں ذلیل کر رہے ہیں۔ ﴿یقیناً صدقات وخیرات فقراء ومساکین کے لیے ہیں﴾۔" (1)

لہٰذا یہ بوڑھا نابینا اہلِ کتاب کے مسکینوں میں سے ہے۔ پھر امیر المومنین نے اس بوڑھے سے اور اس کے مانند دوسرے اہلِ کتاب سے جزیہ ساقط کر دیا۔ (2)

---

(1) التوبة: 60

(2) الخراج، قاضی أبو یوسف (ص 176) دار المعرفه، بیروت.

عبرت ناک انجام

- ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھا بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«كُلْ بِيَمِينِكَ» ”داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤ!“

اس آدمی نے کہا:

«لَا أَسْتَطِيعُ» ”میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا (اس نے تکبر سے کہا)۔“

رسولِ اکرم ﷺ کی زبان سے نکلا:

«لَا اسْتَطَعْتَ» ”تو اس ہاتھ سے نہ ہی کھا سکے۔“

راوی کا بیان ہے کہ پھر وہ کبھی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں اُٹھا سکا۔ (رسول اکرم ﷺ کی نافرمانی کی سزا اسے مل گئی)۔(1)

- بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مالدار شخص صفا اور مروہ کے درمیان گھوڑے پر سوار ہو کر سعی کر رہا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مسعیٰ مسجد حرام کے احاطے سے باہر تھا۔ اس کے اردگرد چھوٹے بڑے غلاموں اور نوکروں کا ہجوم تھا جس سے راستہ تنگ پڑ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر سعی کرنے والے دیگر لوگوں کو سخت غصہ آیا اور وہ گھور گھور کر اس آدمی کو دیکھنے لگے۔ وہ خاصا لمبا تڑنگا انسان تھا، اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔

اس مالدار نے جس سال حج کیا، اسی سال حج کرنے والوں میں سے کسی کی ملاقات چند سالوں بعد اس مالدار سے ہوئی جو اب بغداد کے پل پر بیٹھ کر لوگوں

---

(1) مسلم: الأشربة باب آداب الطعام و الشراب و أحكامهما (2021)۔

سے بھیک مانگ رہا تھا۔ حاجی نے مالدار سے (جو اَب بھکاری کے روپ میں تھا) پوچھا: کیا تو وہی آدمی تو نہیں ہے جس نے فلاں سال حج کیا تھا اور تیرے اردگرد غلاموں اور نوکروں کا اس قدر ہجوم تھا کہ دیگر لوگوں کے لیے مسعی میں راستہ تنگ پڑ گیا تھا؟

بھکاری نے جواب دیا: ہاں، میں وہی شخص ہوں۔

حاجی نے دریافت کیا: پھر کس چیز نے تجھے اس ناگفتہ بہ حالت میں لا پہنچایا ہے؟

بھکاری نے جواب دیا:

«تَكَبَّرتُ فِي مَكَانٍ يَتَوَاضَعُ فِيهِ الْعُظَمَاءُ، فَأَذَلَّنِي اللهُ فِي مَكَانٍ يَتَعَالَى فِيهِ الْأَذِلَّاءُ».

”میں نے اس جگہ میں کبر ونخوت کو اختیار کیا جہاں متقی و پرہیز گار لوگ تواضع و انکساری اختیار کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس جگہ ذلیل خوار کیا جہاں ذلیل ورسوا لوگ بڑے بنتے ہیں۔“

● عصرِ حاضر کا واقعہ ہے جس کے راوی مصر کے معروف سلفی عالم شیخ احمد شاکر ہیں، کہتے ہیں کہ مصر کے گورنر نے نابینا ادیب طٰہٰ حسین کو ایوارڈ سے نوازا اور اس کی عزت وتکریم کی تو جمعہ کی نماز میں ایک خطیب نے اس گورنر کی مدح سرائی شروع کی۔ اس نے اپنے خطبہ کے اندر یہ الفاظ کہے: «جَاءَهُ الْأَعْمَى طَهَ حُسَين فَمَا عَبَسَ بِوَجْهِهِ وَمَا تَوَلَّى!!» یعنی امیر کی خدمت میں نابینا طٰہٰ حسین آیا لیکن امیر نہ تو ترش رو ہوا اور نہ ہی منہ موڑا۔“ نماز جمعہ کے بعد فوراً شیخ احمد شاکر کے والدِ محترم شیخ محمد شاکر کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ اٹھیں اور اپنی نماز دہرائیں، ان کی نماز نہیں ہوئی

اور اب یہ نماز دوبارہ پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ خطیب نے رسولِ اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ (1)

شیخ احمد شاکر بیان کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس مجرم خطیب کو یونہی نہیں چھوڑا؛ بلکہ اس دنیا میں بھی اس کا برا حشر کیا اور آخرت میں جو کچھ سزا تیار کر رکھی ہے وہ تو ہے ہی۔ اللہ کی قسم! میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہی خطیب جو چند سال پہلے عزت و شان کا مالک، اپنے تبحر، بڑے پن کا اظہار کرنے والا اور بڑے بڑے لوگوں کو بھی خاطر میں نہ لانے والا تھا، اب وہ انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ ایک حقیر نوکر بن کر قاہرہ کی ایک مسجد کے دروازے پر نمازیوں کے جوتوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ ذلت و رسوائی اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ مجھے خود شرم آ رہی تھی کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے، کیونکہ میں اس کو جانتا تھا اور وہ بھی مجھ سے واقف تھا۔ یہ منظر عجیب درسِ عبرت و موعظت تھا۔

---

(1) چونکہ خطیب کا اشارہ اس واقعے کی طرف تھا جو مکہ میں پیش آیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ اکرم ﷺ قریش کے بڑے بڑے سرداروں کو دعوتِ دین پیش کر رہے تھے۔ اتنے میں نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کسی مسئلہ کی دریافت کے لیے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آن پہنچے۔ انھیں دیکھ کر آپ ﷺ کے چہرہ پر کچھ ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے کیوں کہ آپ ﷺ قریش مکہ کے سرداروں کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى﴾ ”وہ ترش رو ہوا اور منہ موڑ لیا، صرف اس لیے کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا۔“

بہن بھائی

ایک صاحب کا بیان ہے: ایک مرتبہ سفر کے دوران راستہ بھٹک گیا۔ چلتے چلتے بیابان میں مجھے ایک گھر نظر آیا، میں اس گھر کے پاس پہنچا تو ایک اعرابیہ (دیہاتی خاتون) گھر کے اندر تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا: تم کون ہو؟

میں نے جواب دیا: مہمان۔ اعرابیہ نے میرے لیے کھانا حاضر کیا اور میں نے کھانا تناول کیا۔ ابھی میں پانی پی رہا تھا کہ اتنے میں اس کا شوہر آیا اور پوچھا: یہ کون ہے؟

عورت نے جواب دیا: مہمان۔

شوہر نے کہا: «لَا أَهْلًا وَلَا مَرْحَبًا» (مہمان کا آنا، نامبارک ہو)

ہمیں مہمان کی مہمان نوازی سے کیا واسطہ؟ میں نے جب اعرابیہ کے شوہر کی یہ بات سنی تو اسی وقت اپنا راستہ لیا اور چل پڑا۔ دوسرے دن بیابان ہی میں ایک جگہ دوسرا گھر نظر آیا۔ میں نے اس گھر کا رخ کیا۔ گھر کے دروازے پہ پہنچا تو وہاں ایک اعرابیہ تھی، اس نے پوچھا: تم کون ہو؟

میں نے جواب دیا: مہمان۔

اس نے کہا: «لَا أَهْلًا وَلَا مَرْحَبًا بِالضَّيْفِ» (مہمان کے لیے کوئی گنجائش نہیں اس کی آمد، نامبارک ہو)۔

اتنے میں اس کا شوہر آن پہنچا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو پوچھا: یہ کون ہے؟

عورت نے جواب دیا: مہمان ہے۔

اس نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور گویا ہوا: «مَرْحَبًا وَّأَهْلًا بِالضَّيْفِ» (مہمان کا آنا مبارک ہو، یہ اپنا ہی گھر سمجھو)۔

پھر اس نے میرے لیے عمدہ اور لذیذ کھانا حاضر کیا اور میں نے مزے سے تناول کیا۔ مجھے گزشتہ کل کا واقعہ یاد آ گیا تو یکا یک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔

میزبان نے دریافت کیا: کیوں مسکرا رہے ہو؟

میں نے جواباً گزشتہ کل کا قصہ اس کے گوش گزار کیا اور جو کچھ اعرابیہ اور اس کے شوہر کی گفتگو سنی تھی وہ بتائی۔

میزبان نے مجھ سے کہا: بھئی، تعجب مت کرو! جس عورت کو کل تم نے دیکھا تھا، وہ میری بہن تھی اور اس کا شوہر میری اس بیوی کا بھائی ہے، اس لیے فطری اعتبار سے یہ دونوں ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔

کم سن بچے کا خوف وتقویٰ

خلافتِ عباسیہ میں قبیلہ شیبان کا ایک آدمی بادشاہ کے پاس ایک نہایت ہی رازدارانہ کارِ منصبی انجام دیا کرتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ روزانہ صبح سے دوپہر تک بازار میں جا کر گھومتا پھرتا اور وہاں لوگوں کی چہ میگوئیاں اور ان کی جو کچھ سرگرمیاں ہوتیں ان کی رپورٹ تیار کر کے اس پر اپنی مہر لگاتا اور اسے اپنے افسر کے پاس بھیجتا، پھر وہ افسران رپورٹوں کو ترتیب دے کر بادشاہ کے روبرو پیش کرتا۔ ایسا اس لیے کیا جاتا کہ ملک کے اندر امن وامان برقرار رکھا جا سکے اور عامۃ الناس کو درپیش خطروں سے نمٹا جا سکے۔

ایک مرتبہ رپورٹ لکھنے والا یہ آدمی اپنی کسی سخت ضرورت کے پیش نظر مشغول ہو گیا اور بازار پہنچ کر رپورٹ نہ لکھ سکا۔ بعد میں بازار میں ہونے والی چہ میگوئیوں اور لوگوں کی سرگرمیوں کے متعلق جو کچھ سنا، آ کر ضبطِ تحریر میں لایا اور سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر رپورٹ تیار کر کے اس پر اپنی مہر لگا دی۔ پھر اپنے کم سن بھتیجے کو آواز دی جس کا نام احمد تھا اور اس سے پوچھا: اے احمد! کیا تجھے اس افسر کا دفتر معلوم ہے جو روزانہ مجھ سے رپورٹ وصول کرتا ہے؟

بچے نے جواب دیا: ہاں، مجھے معلوم ہے۔

چچا نے کہا: آج میری یہ رپورٹ لے جا کر افسر کے پاس جمع کرا دو، میں نے اس پر مہر ثبت کر دی ہے اور افسر سے کہہ دینا کہ میرے چچا اچانک کسی

مصروفیت میں پڑ گئے ہیں، اس لیے آج وہ حاضر نہیں ہو سکے، لہٰذا انھوں نے یہ رپورٹ میرے ہاتھ بھیجی ہے۔

بچے نے اپنے چچا سے رپورٹ لی اور شہر کے بیچ والی سڑک سے امن وامان کے افسر کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے چچا کی رپورٹ کے اوراق افسر کی خدمت میں پیش کرتا، اسے یاد آیا کہ چچا نے رپورٹ کے اوراق بغیر تاریخ لکھے ہی حوالے کر دیے ہیں؛ چنانچہ بچے نے خود تصرف کر کے اس میں تاریخ درج کر دی...... ابھی وہ بچہ آگے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، کہ اس کا گزر راستے میں ایک نہر کے پل پر سے ہوا۔ بچے کے ذہن و دماغ میں خود بخود یہ باتیں آنے لگیں:

"اے احمد! تو اگرچہ ایک چھوٹا بچہ ہے...... لیکن تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے چچا کا یہ فعل شرعاً کیسا ہے؟ تیرا چچا بازار میں ہونے والی لوگوں کی چہ میگوئیاں اور ان کے کاموں کی تفصیل لکھ کر افسر کو پہنچاتا ہے جو کہ شریعت کی نگاہ میں ایک حرام کام ہے، کیونکہ یہ بھی جاسوسی کی ایک قسم ہے اور جاسوسی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ "اور جاسوسی مت کیا کرو!"۔(1) لہٰذا اے احمد! تو بھی ایک ممنوع فعل کا ارتکاب کر رہا ہے اور اس کام میں دوسرے کا تعاون کر رہا ہے جس کام سے قرآن نے روکا ہے۔"

بچے کے دل میں آنے والی باتوں نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس نے فوراً اپنے چچا کی دی ہوئی رپورٹ نہر میں پھینک دی اور واپس اپنے گھر آ گیا۔

---

(1) الحجرات : 12

جب امن و امان کے افسر کے پاس رپورٹ پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو اس نے اپنے آدمیوں کو اپنے رپورٹر کی خدمت میں بھیجا کہ آخر بات کیا ہے کہ رپورٹ نہیں پہنچ سکی۔ جب افسر کے کارندے رپورٹر کے پاس پہنچے تو اس نے انھیں بتایا کہ میں نے اپنے احمد نامی بھتیجے کے ذریعے رپورٹ افسر کے پاس بھیج دی تھی۔ یہ سن کر افسر کے کارندے بچے کے پاس پہنچے اور اس سے پوچھا: تمہارے چچا نے جو رپورٹ افسر تک پہنچانے کے لیے دی تھی، وہ کہاں ہے؟

بچے نے جواب دیا: وہ تو میں نے نہر میں پھینک دی۔

یہ سنتے ہی افسر کے کارندے تعجب اور خوف سے چیختے ہوئے بول اُٹھے: کیوں؟ کس وجہ سے تم نے رپورٹ نہر میں پھینک دی...... کیا بات ہے؟

بچے نے جواب دیا: کیونکہ یہ فعل شرعاً حرام ہے...... یہ رپورٹ جاسوسی کی ایک قسم ہے جسے شریعتِ اسلامیہ نے ممنوع قرار دیا ہے...... اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس ناجائز فعل پر میری طرف سے کوئی تعاون ہو۔

کارندوں نے بچے کا جواب سن کر فوراً افسر کے پاس یہ رپورٹ پہنچائی۔ افسر نے جب بچے کے بارے میں یہ کچھ سنا تو بچے کی بات اس کے دل کو لگی اور بول اُٹھا: یہ بچہ اتنا پرہیزگار ہے...... پھر ہمیں کس قدر پرہیزگار ہونے کی ضرورت ہے، ہم کہاں ہیں؟

پھر اس دن سے ان کی نگاہیں اس بچے پر جم گئیں...... اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ بچے کو نہیں بلکہ کسی جوان کو دیکھ رہے ہوں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ بچہ کون تھا؟ .... یہ بچہ وہی نامی گرامی شخصیت ہے جس کو پوری دنیا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ جو محدثِ کبیر اور

فقیہ عظیم ہیں جن کو ''امام الورع'' (تقویٰ کا امام) کہا جاتا ہے، جنہوں نے خلیفہ مامون کے دورِ حکومت میں ابتلاء و آزمائش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور عقیدۂ اسلام کی طرف سے کھل کر دفاع کیا، حق بات کی آواز بلند کرنے میں ہر مصیبت برداشت کی اور انتہائی سخت مصیبت کی حالت میں بھی قرآن و حدیث سے ہٹ کر اللہ کے دین میں ایک کلمہ کہنا گوارا نہیں کیا..... جی ہاں! یہ بچہ وہی ہے جو ''امام احمد کے نام سے مشہور ہوا جس کی زندگی کے درپے ہونے والے تمام کے تمام مٹ گئے، کوئی ان کا اچھے طریقے سے نام تک لینے والا نہیں لیکن ''احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ'' کا نام آتے ہی ایک اسلامی ہیرو کا تصور آج بھی لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے.......... یہ بچہ آگے چل کر ایک عظیم محدث اور امام بنا، لیکن بچپن ہی سے حسب لیاقت ہر بات کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر رکھنا اس پر عمل کرنا اس کی شان تھی..... (1)

---

(1) مجلہ ''النور'' عدد (145) شوال 1417ھ۔

اصل بادشاہت

اشعث بن شعبہ مصیصی کہتے ہیں کہ خلیفہ ہارون رشید ایک دفعہ رَقّہ (فرات کے کنارے ایک مشہور شہر) آیا، اس کے بعد عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی وہاں تشریف آوری ہوئی۔ رَقّہ کے لوگ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، لوگوں کے جوتوں کی آواز فضا میں گونجنے لگی اور ان کے تسمے ٹوٹ گئے، اور فضا گرد آلود ہوگئی، اس شور وشغب کو سن کر ایک خاتون نے محل کے دریچے سے جھانکا۔ یہ خاتون بنواُمیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد بن الحکم کی والدہ تھی، اس نے لوگوں کا یہ اُمڈتا ہجوم دیکھ کر پوچھا: یہ ماجرا کیا ہے؟

اسے بتایا گیا کہ خراسان کے ایک عالم دین تشریف لائے ہیں جن کا اسم گرامی ”عبداللہ بن مبارک“ ہے۔ وہ خاتون بے ساختہ بولی:

«هَذَا وَاللهِ الْمَلِكُ لَا مَلِكُ هَارُونُ الَّذِي لَا يَجْمَعُ النَّاسَ إِلَّا بِسَوْطٍ وَأَعْوَانٍ»

”اللہ کی قسم! یہی شخص حقیقی بادشاہت کا مالک ہے نہ کہ ہارون رشید، جو کہ لوگوں کو کوڑوں اور سپاہیوں کی مدد سے اکٹھا کرتا ہے۔“ (1)

---

(1) المنتظم فی تاریخ الأمم والملوك، ابن الجوزی 60/9، تاریخ بغداد 156/10۔

شوقِ شہادت

جنگ بدر میں جب مشرکین مکہ اسلام اور مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھے تو رسول اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: «قُومُوا إِلَى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ»۔ ”جنت کی طرف اٹھ کھڑے ہو جس کی چوڑائی سارے آسمان اور زمین ہیں“۔

یہ سن کر حضرت عمیر بن حمام انصاری ؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا (شہادت کے عوض) آسمانوں اور زمین کی چوڑائی کے برابر جنت ہے؟

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ”ہاں“۔ حضرت عمیر بن حُمام کہنے لگے: بخ بخ۔

رسول اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: «وَمَا يَحْمِلُكَ عَلَى قَوْلِكَ بَخٍ بَخٍ؟» ”بخ بخ کہنے پر تجھے کس بات نے ابھارا“؟

حضرت عمیر بن حُمام نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! قسم اللہ کی میں نے یہ جنت کی امید میں کہا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا»۔ ”تم جنت والوں میں سے ہو“۔

اس کے بعد حضرت عمیر بن حُمام اپنے ترکش سے کھجوریں نکال کر کھانے لگے۔ پھر شوق شہادت میں کہنے لگے: «لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتَّى آكُلَ تَمَرَاتِي هَذِهِ إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيلَةٌ» ”اگر میں ان کھجوروں کے کھانے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی ہی طویل زندگی ہو جائے گی“۔ چنانچہ انہوں نے بقیہ ساری کھجوریں پھینک دیں اور آگے بڑھ کر مردانہ وار جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (1)

---

(1) مسلم: كتاب الإمارة / باب ثبوت الجنة للشهيد (1901)۔

تین کے بدلے تین

حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک دن کہا:

اے کلیم اللہ! آپ پر تعجب ہے، آپ نے مجھے اس روز ملامت کی جب میں نے کشتی کو پھاڑا تھا، آپ کو ڈر تھا کہ کہیں کشتی والے غرق نہ ہو جائیں۔ کیا آپ اس ذات کو بھول گئے جس نے آپ کو اس دن بچایا تھا جب آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو پانی میں ڈالا تھا!

آپ نے مجھے اس وقت بھی ملامت کی جب میں نے بغیر کسی قصور کے ایک بچے کو قتل کیا تھا......

لیکن آپ اپنے آپ کو بھول گئے جب آپ نے آلِ فرعون میں سے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔ پھر آپ نے کہا کہ اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، تو مجھے بخش دے اور آپ کو بخش دیا گیا۔

اے کلیم اللہ! آپ نے مجھے بغیر اجرت کے دیوار بنانے پر ملامت کی......

مگر اس دن کو بھول گئے جب آپ نے شعیب کی بیٹیوں کی بکریوں کو بغیر اجرت کے پانی پلایا تھا......

تو جناب! یہ تین کے بدلے تین ہیں۔

آگ آگ کو کیسے جلا سکتی ہے؟

ایک شخص جو اپنے آپ کو بڑا فلسفی اور دانشور سمجھتا تھا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بحث و مباحثہ کرنے لگا۔ کہنے لگا: امام صاحب! اگر شیطان کو اللہ تعالیٰ نے آگ سے پیدا کیا ہے تو پھر جب اسے آگ میں ڈالیں گے تو اسے کیسے تکلیف ہوگی، جب کہ اس کا خمیر ہی آگ سے ہے!

امام شافعی مسکرائے، زمین کی طرف دیکھا، وہاں ایک خشک مٹی کا ڈھیلا نظر آیا، وہ ڈھیلا اٹھا کر اس شخص کو دے مارا۔ اس شخص کے چہرے پر غیظ و غضب کی علامات ظاہر ہوئیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت اطمینان اور پیار سے کہا: لگتا ہے تمہیں میرے ڈھیلا مارنے سے تکلیف ہوئی ہے۔

اس نے غصے سے کہا: ہاں، کیوں نہیں۔ آپ نے مجھے تکلیف دی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ کیسے ممکن ہے کہ تم مٹی سے بنے ہوئے ہو اور تمہیں مٹی سے تکلیف ہو۔

اس نام نہاد فلسفی کو جواب مل چکا تھا۔ بحث اور جھگڑا ختم ہوگیا، اس کو معلوم ہوگیا کہ شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ آگ ہی سے عذاب دیں گے۔

محدود علم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلۡعِلۡمِ إِلَّا قَلِيلٗا ٨٥﴾

”تمہیں جو علم دیا گیا، نہایت تھوڑا ہے“(1)

مقاتل بن سلیمان اپنے وقت کے معروف علماء میں سے تھے۔ ایک دن نہ جانے کیا سوجھی، اپنے حلقے کے لوگوں میں اعلان کر بیٹھے کہ مجھ سے اوجِ ثریا سے تحت الثریٰ تک جو بھی چیز ہے، اس کے بارے میں سوال کرو، میں جواب دوں گا۔

لوگوں کو ان کا انداز اچھا نہ لگا، احترام کے مارے خاموش رہے۔

اچانک مجلس میں سے ایک شخص کھڑا ہوا، کہنے لگا: حضرت، میں زیادہ لمبے چوڑے اور دقیق مسائل کی بجائے آپ سے ایک عام سوال کرتا ہوں:

قرآن مجید میں اصحابِ کہف اور ان کے کتے کا ذکر ہے، آپ صرف یہ بتا دیں کہ اصحابِ کہف کے کتے کا رنگ کیا تھا؟

اب کیا تھا، جناب مقاتل خاموش اور پریشان ہوگئے۔ ان کو واقعی اس کا جواب نہیں آتا تھا۔ اور ایک عام سے شخص نے ان کو لا جواب کر دیا تھا۔ بلا شبہ اللہ رب العزت نے سچ فرمایا ہے:

﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ ٱلۡعِلۡمِ إِلَّا قَلِيلٗا ٨٥﴾

---

(1) الإسراء: 85

فتویٰ نہیں مدد

عمر بن ہبیرہ نہایت دولت مند اور سخی تھے، راہ گزرتے ہوئے ان کو ایک شخص نے روک لیا اور کہنے لگا: اے عرب کے امیر ترین شخص! میں حج کا خواہش مند ہوں۔

عمر بن ہبیرہ نے کہا: پھر مکے کا راستہ پکڑو اور حج کے لیے مکہ پہنچ جاؤ۔

وہ کہنے لگا: مگر میں چلنے سے عاجز ہوں، تھک جاتا ہوں۔

عمر بن ہبیرہ نے کہا: کوئی بات نہیں، ایک دن سفر کرو اور دوسرے دن آرام کر لیا کرو، تاکہ تھکاوٹ نہ ہو۔

وہ بولا: میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں اس سے سواری خرید سکوں یا کرایہ پر لے سکوں۔

فرمایا: چونکہ تم محتاج اور فقیر آدمی ہو، اس لیے تم سے حج ساقط ہے، حج تو صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔

وہ کہنے لگا: اے عرب کے امیر! میں آپ سے مدد طلب کرنے کے لیے آیا ہوں، فتویٰ لینے کے لیے نہیں۔

عمر بن ہبیرہ بے اختیار مسکرا پڑے اور اسے پانچ ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔

حجاج کے دستر خوان پر

حجاج بن یوسف ثقفی نے بنو امیہ کی حکومت کو استحکام بخشنے کے لیے مختلف انداز اپنائے۔ اس نے انتہائی سختی سے کام لیا، ظلم کا بازار گرم کیا، لوگوں کو ناحق قتل کرنا اس کا پسندیدہ شیوہ تھا۔ اس کا رعب و دبدبہ عوام الناس کے دل و دماغ پر اس طرح بھوت بن کر سوار تھا کہ ان کے اندر سے بغاوت کا قلع قمع ہو گیا اور فتنہ پرور عناصر اندر ہی اندر دب کر رہ گئے۔

ایک مرتبہ حجاج کا دستر خوان لگا ہوا تھا، کافی لوگ کھانے میں شریک تھے، ان میں ایک اعرابی (بدو) بھی شامل تھا۔ جب سویٹ ڈش کی باری آئی تو حلوہ پیش کیا گیا۔ حجاج نے اعرابی کو موقع دیا کہ وہ اس حلوے کا ایک لقمہ لے لے۔ پھر اس نے اعلان کیا کہ خبردار! جس نے اس حلوے کو کھایا میں اس کی گردن اتار دوں گا۔

تمام حاضرین نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ اعرابی کبھی تو حجاج کی طرف اور کبھی حلوے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حلوہ نہایت لذیذ تھا۔ اس نے آخری مرتبہ حجاج کی طرف دیکھا اور پکارا:

اے امیر! میں آپ کو اپنی اولاد کے بارے میں خیر کی وصیت کرتا ہوں۔

اور پھر حلوے پر جھپٹ پڑا۔

پادری کی نصیحت

حضرت طلحہ بن عبیداللہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ مکہ مکرمہ کے باسی اور تجارت پیشہ تھے۔ قریش مکہ کے ہمراہ شام کے مشہور قصبے بصریٰ کے بازار میں مقیم تھے۔ کہ اچانک ایک عیسائی پادری کو لوگوں میں اعلان کرتے سنا کہ تمہارے درمیان اہل حرم میں سے کوئی شخص ہے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس کے قریب ہی تھا۔ میں لپک کر اس کی طرف بڑھا اور کہا: ہاں میں مکہ مکرمہ کا رہنے والا ہوں۔

پادری کہنے لگا: کیا تمہارے ہاں احمد نامی کوئی شخصیت ہے۔

میں نے کہا: کون احمد؟

وہ کہنے لگا: احمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب' وہ اس شہرت کا حامل ہوگا۔ اور وہ آخری نبی ہے۔ وہ مکے کا رہنے والا ہوگا اور وہاں سے ہجرت کر کے کالے پتھروں کی سرزمین جس میں کھجور کے باغات ہیں جائے گا۔

«فَإِيَّاكَ أَنْ تُسْبَقَ إِلَيْهِ يَا فَتَى»

”اے نوجوان! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس کی دعوت کو قبول کرنے میں دوسرے تم پر سبقت نہ لے جائیں۔“

طلحہ کہتے ہیں کہ اس پادری کی بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ میں اپنے اونٹوں کی طرف گیا' ان کے اوپر پالان رکھا' ساز و سامان لادا اور واپس وطن کی طرف روانہ ہوا۔ میرے ہمراہ میری قوم کے کافی لوگ تھے۔ ہمارا قافلہ جلد مکے پہنچ گیا۔

میں نے گھر پہنچتے ہی اپنے گھر والوں سے پوچھا:

«أَكَانَ مِنْ حَدِيثٍ بَعْدَنَا فِي مَكَّةَ»

”کیا ہمارے سفر کے دوران کوئی خاص واقع پیش آیا۔“

انہوں نے کہا کہ ہاں:

«قَامَ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللهِ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ وَقَدْ تَبِعَهُ ابْنُ أَبِي قُحَافَةَ»

”محمد بن عبداللہ نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اللہ کے نبی ہیں۔ اور ابوقحافہ کے بیٹے (ابوبکر صدیق) نے ان کی تصدیق بھی کر دی ہے۔“

طلحہ ؓ فرماتے ہیں: میں ابوبکر صدیق ؓ کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بڑے نرم خو بڑے محبوب اور کریم شخص تھے۔ اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک تاجر تھے۔ حق و انصاف کے خوگر تھے ہم ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے کہا:

«أَحَقًّا مَا يُقَالُ مِنْ أَنَّ مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِاللهِ أَظْهَرَ النُّبُوَّةَ وَأَنَّكَ اتَّبَعْتَهُ»

”کیا جو باتیں ہم سن رہے ہیں وہ درست ہیں کہ محمد بن عبداللہ (ﷺ) نے نبوت کا اظہار کیا ہے اور آپ نے ان کی پیروی کی ہے اور ان کو مان لیا ہے۔“

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے فرمایا: ہاں تم نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے۔ اور پھر انہوں نے اللہ کے رسول کی باتیں سنانا شروع کر دیں، اور مجھے ترغیب دلائی کہ میں بھی ان کا ساتھی بن جاؤں میں نے ان کو پادری کی باتیں سنائیں تو ابوبکر ؓ کو بڑا تعجب ہوا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ چلو محمد (ﷺ) کے پاس چلتے ہیں اور ان کو یہ واقعہ سناتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ اور تم بھی اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ۔

طلحہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکر صدیق ؓ کی معیت میں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے قرآن کریم کا کچھ حصہ سنایا اور مجھے دنیا و آخرت کی خوشخبری دی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اسلام کی دعوت کے لیے کھول دیا۔ میں نے آپ ﷺ کو بصریٰ کے پادری کا واقعہ سنایا۔

«فَسُرَّ بِهَا سُرُورًا بَدَا عَلَى وَجْهِهِ»

”آپ اس سے بہت خوش ہوئے جس کے آثار آپ کے چہرہ اقدس پر نمایاں تھے۔“

«فَأَعْلَنْتُ بَيْنَ يَدَيْهِ شَهَادَةَ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللهِ»

”پھر میں نے آپ کے دستِ حق پرست پر کلمہ شہادت پڑھا۔“

اس طرح میں ابوبکر صدیق ؓ کے ذریعے اسلام لانے والا چوتھا آدمی تھا۔

موت کے بعد بھی ثواب

امام مسلم حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»

”جب آدمی فوت ہوجاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے مگر تین چیزوں کا اجروثواب موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے: صدقہ جاریہ، یا ایسا علم جس سے لوگ استفادہ کریں یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔“(1)

گالیوں کا جواب

عیسیٰ ؑ یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو یہودیوں نے ان کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے، انھیں گالیاں دیں اور برا بھلا کہا لیکن حضرت عیسیٰ ؑ نے ان کے بارے میں کلمۂ خیر کہا اور انھیں دعائیں دیں۔

عیسیٰ ؑ سے کسی نے کہا: حضرت! عجیب بات ہے، آپ ان کو دعائیں دے رہے ہیں اور ان کے بارے میں کلمۂ خیر کہہ رہے ہیں، حالانکہ وہ آپ پر گالیوں کی بوچھاڑ کررہے ہیں؟ فرمایا:

«كُلُّ وَاحِدٍ يُنْفِقُ مِمَّا عِنْدَهُ»

”ہر شخص وہی خرچ کرتا ہے اور منہ سے وہی نکالتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔“

---

(1) مسلم (1631)۔

ہزار درہم کا نگینہ

عمر بن عبدالعزیز ؒ کے کسی صاحبزادے نے ایک انگوٹھی بنوائی اور اس میں جڑنے کے لیے ایک ہزار درہم کا نگینہ خریدا۔ جب عمر بن عبدالعزیز ؒ کو اس بارے میں معلوم ہوا تو اپنے بیٹے کو یہ لکھا:

اما بعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک ہزار درہم میں نگینہ خریدا ہے۔ تم اس نگینے کو فروخت کر دو اور اس کی قیمت سے ایک ہزار بھوکے لوگوں کو کھانا کھلا دو اور چینی لوہے کی کوئی انگوٹھی بنوا لو، اور اس پر کندہ کرواؤ:

«رَحِمَ اللّٰهُ امْرَءًا عَرَفَ قَدْرَ نَفْسِهِ»

”اللہ تعالیٰ اس بندہ پر رحم کرے جس نے اپنی حقیقت پہچان لی۔“(1)

دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی

دنیا کی سب سے پہلی اسلامی یونیورسٹی مراکش کے شہر فاس میں 859ء میں قائم ہوئی۔ محمد بن عبداللہ فہری قیروانی نے اس یونیورسٹی کے بنانے کا حکم دیا۔ موت نے ان کو مہلت نہ دی، مگر ان کے بعد ان کی بیٹیوں فاطمہ اور مریم نے اپنے والد کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے یونیورسٹی مکمل کروائی۔

یونیورسٹی میں ایک جامع مسجد کے علاوہ فقہ اور دوسرے علوم پڑھانے کے لیے بہت سی عمارتیں بنائی گئیں اور اس یونیورسٹی کو مدینۃ العلم کا نام دیا گیا۔

---

(1) سمیر المومنین ص 147۔

تین حقوق

میمون بن مہران کہتے ہیں: اسلام نے تین حقوق ایسے دیے ہیں جو تمام کائنات کے لیے یکساں ہیں، یعنی وہ حقوق مسلمان اور کافر دونوں کو حاصل ہیں:

(1) ہر حال میں امانت ادا کی جائے، خواہ امانت رکھوانے والا مسلمان ہو یا کافر۔

(2) والدین کی عزت وتکریم کی جائے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔

(3) وعدہ ہر حال میں پورا کیا جائے، خواہ وہ کافر سے کیا ہو یا مسلمان سے۔

آپ کو مرنا پسند ہے؟

ولید بن عبدالملک مسجد میں داخل ہوا تو اس کے سپاہیوں نے تمام لوگوں کو باہر نکال دیا۔ ایک بوڑھے نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے بزور نکلنے پر مجبور کر رہے تھے کہ ولید کی نظر پڑ گئی۔ ولید نے کہا: رک جاؤ! پھر وہ خود بوڑھے کے پاس چل کر گیا اور کہنے لگا: بابا جی! آپ کو مرنا پسند ہے؟

بوڑھے نے کہا: امیر المومنین! ہرگز نہیں، میری جوانی اپنے تمام تر شر کے ساتھ ختم ہوگئی، اب بڑھاپا اپنے تمام تر خیر اور برکت کے ساتھ آیا ہے۔ میں جب بھی اٹھتا ہوں الحمد للہ کہتا ہوں، جب بیٹھتا ہوں تو بھی اللہ کا ذکر اذکار کرتا ہوں۔ مجھے یہ پسند ہے کہ یہ دونوں صفات تادیر باقی رہیں۔

بیت الخلاء میں موت

پچیس سالہ نوجوان چند سالوں سے سگریٹ کا عادی ہو چکا تھا...... ایک دن اچانک اسے دل کا دورہ پڑا اور علاج کے لیے ہسپتال داخل کرادیا گیا۔ چند دنوں تک جدید طبی الیکٹرانک مشینوں کے ذریعے اس کے مرض کی تشخیص ہوتی رہی...... نوجوان کے علاج پر مامور ڈاکٹر نے نوجوان مریض کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا کہ وہ بیڑی سگریٹ کا استعمال ترک کر دے کیونکہ اس کی بیماری کا اصل سبب سگریٹ نوشی ہی ہے۔ نیز ڈاکٹر نے نوجوان کے ذمہ داران کو تنبیہ کی کہ اس مریض کی عیادت کے لیے آنے والے لوگوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے تاکہ وہ چپکے سے اسے بیڑی سگریٹ مہیا نہ کر دیں...... نوجوان کی صحت رفتہ رفتہ اچھی ہونے لگی اور اس کی جسمانی چستی و نشاط بحال ہو گئی...... لیکن وہ ڈاکٹر کی تعلیمات کی مسلسل پابندی کرنے کی بجائے صحت بحال ہوتے ہی پھر سگریٹ نوشی کرنے لگا اور اس کا دوبارہ عادی بن گیا۔

ایک دن یہ نوجوان گھر سے اچانک غائب ہو گیا .... گھر والوں نے اسے ڈھونڈا تو وہ بیت الخلاء کے اندر دم توڑ چکا تھا اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ موجود تھی۔

یہ افسوسناک قصہ ہم نے اس لیے بیان کیا ہے تاکہ ہر سگریٹ نوش کے لیے درسِ عبرت ہو اور وہ اس سمِ قاتل سے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرے اور سگریٹ نوشی کی گندی عادت سے باز آ جائے!

صابر وشاکر کے لیے جنت کا وعدہ

مشہور تابعی عمران بن حطان بڑے ہی بدصورت اور چھوٹے قد کے تھے، جبکہ ان کی بیوی نہایت خوبصورت تھی۔ ایک دن جب وہ گھر تشریف لائے تو دیکھا کہ بیوی نے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے۔ انھوں نے بیوی کی طرف نہایت اشتیاق سے دیکھا تو بیوی نے برجستہ کہا: اگر اللہ نے چاہا تو ہم دونوں جنتی ہیں۔

عمران نے پوچھا: وہ کیسے؟

بیوی کہنے لگی: تم ایک خوبصورت بیوی ملنے پر بڑے شاکر ہو، اور مجھے تم جیسا بدصورت شوہر ملا تو میں نے صبر کیا، اور اللہ تعالیٰ نے صابر اور شاکر دونوں کے لیے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ (1)

شراب نوشی

ایک آدمی نے کسی پاگل سے پوچھا: او پاگل! تجھے شراب نوشی کی خواہش ہے؟

پاگل نے جواب دیا: عقلمندوں کا حال یہ ہے کہ وہ شراب نوشی کے بعد میری طرح ہوجاتے ہیں، پھر اگر میں نے شراب نوشی کر لی تو میں کس کی طرح ہوں گا؟

---

(1) الأذكياء، لابن الجوزی۔

چڑیا کی فریاد

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر (غزوہ) میں رسول اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے۔ آپ ﷺ قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اسی دوران ہم نے ایک چڑیا دیکھی جس کے ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ہم نے اس کے دونوں بچوں کو پکڑ لیا۔ چڑیا اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے آئی۔ اتنے میں نبی کریم ﷺ بھی آ پہنچے اور یہ دیکھ کر فرمایا:

«مَنْ فَجَعَ هَذِهِ بِوَلَدِهَا؟ رُدُّوا وَلَدَهَا إِلَيْهَا»

”اس چڑیا کے بچوں کو اٹھا کر کس نے اسے مصیبت میں ڈال رکھا ہے؟ اس کے بچے اسے واپس کر دو۔“

پھر آپ ﷺ کی نگاہ چیونٹیوں کے ایک مسکن پر پڑی جسے ہم لوگوں نے جلا ڈالا تھا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”اس کو کس نے آگ لگائی ہے؟“ ہم نے عرض کیا: ہم لوگوں نے آگ لگائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي أَنْ يُعَذِّبَ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ»

”آگ سے عذاب دینا آگ کے پروردگار کے سوا کسی کو زیب نہیں دیتا۔“(1)

---

(1) [صحیح] أبوداود: کتاب الجهاد، باب فی کراهیة حرق العدو بالنار (2675)۔

الصفحات الذهبية

روشن ماضی کے زندہ اور چمکتے دمکتے واقعات پر مشتمل یہ ہماری سنہری تاریخ کے گمشدہ اوراق ہیں جو ہر چھوٹے بڑے کے لیے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں۔

ذہن کو جلا دینے والے اور سوچنے سمجھنے پر مجبور کرنے والے یہ حیران کن مشاہدات اور سبق آموز قصے ہماری کردار سازی اور شخصیت کی تعمیر میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

تحفے میں دینے کے لیے بہترین کتاب

دارُالسّلام
کتاب وسُنّت کی اِشاعت کا عالمی اِدارہ
ریاض۔ جدہ۔ الخبر۔ شارجہ
لندن۔ ھیوستن۔ نیویارک۔ لاھور

ISBN: 9960-732-02-9
9789960732022